صنادیدِ عجم

مشتمل بر تاریخ و تنقید انشاے عجم از قرن اوّل تا زمانۂ حال

مولفہ

مولوی مہدی حسین صاحب ناصری ایم۔ اے
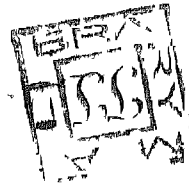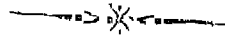
حسب فرمائش

لالہ رامدیال اگروالہ ایکسیلر و پبلشر کٹرہ الہ آباد

باہتمام منشی اکبر علی صاحب منیجر در برکات اکبر پریس الہ آباد طبع شد

سنہ ۱۹۳۴ء

باراول ۵۰۰ جلد — قیمت فی جلد سے/

فہرست مضامین

تذکرۂ نادرہ - لطف علی خاں آذر اور آتشکدہ - خاتمہ (والہ داغستانی اور ریاض الشعرا - محمد تقی خیال اور بوستانِ خیال) -

فارسی کی وسعت - ہندوستانی فارسی - منہاج السراج اور طبقات ناصری - امیر خسرو دہلوی - حسن دہلوی - جمال الدین دہلوی - بدر چاچ - مظہر گجراتی - فیروز شاہ بہمنی - یوسف عادل شاہ - اسمعیل عادل شاہ - نظام شاہ - بابر بادشاہ - ہمایوں بادشاہ - اکبر اعظم - بیرم خان - میرزا عبد الرحیم خانخاناں - حکیم ابو الفتح گیلانی - خان زمان - خان اعظم عزیز میرزا کوکلتاش - فیضی فیاضی - عرفی - غزالی مشہدی - حزنی اصفہانی - ثنائی مشہدی - ابو الفضل علامی - عبد القادر بدایونی - جہانگیر بادشاہ - شاہجہاں - اورنگ زیب - دارا شکوہ - ظفر خان والی کشمیر - ابراہیم عادل شاہ والی بیجاپور - نظیری - شیدائے مشہدی - صائب - کلیم - دانش مشہدی - قدسی - جلالائے طباطبائی اور توقیعات کسرے - ظہوری - نعمت خان عالی - ناصر علی سرہندی - بیدل عظیم آبادی - حزین اصفہانی - غالب دہلوی - خاتمہ در حال نثر و نظم (چندر بھان برہمن لاہوری) -

کریم خان زند - آقا محمد خاں بانی سلطنت قاچاریہ - فتحعلی شاہ -

---

بسم اللہ الرحمن الرحیم
حامدا و مصلیا

عرض حال

برسوں کی آرزو ہے کہ فارسی کی تاریخ ادب مذاقِ
حال میں مرتب کی جائے اور فلسفہ لغت وفن تنقید کی مدد سے
سخنورانِ ایران کی داد دی جائے۔ اسی شوق میں السنۂ مختلفہ کی
تاریخ ادب اور تنقید کلام کی ورق گردانی کی اور مدتوں نظم ونثر کے
میدان میں طبیعت کو جولاں رکھا تاکہ بے سوادی دور ہو اور کچھ سلیقہ
آجائے تو بقدرِ مہلت چند ورق تحریر کروں۔ غرض ہمت کمال کی
طالب رہی اور کم فرصتی ہر طلب پر غالب رہی۔ اسی کشمکش میں
پروفیسر براؤن کی تاریخ ادب پر نظر پڑی۔ حضرت مولانا شبلی
نعمانی کی فیض صحبت سے مستفیض ہوا اور شعر العجم کے بعض اجزا
ممدوح کی زبان مبارک سے سنے۔ مولانا آزاد دہلوی کی سخندانِ
فارس بھی نہایت شوق سے پڑھی۔ ارادہ ہوا کہ پہلے ان کاملین
فن کے مصنفات کا خلاصہ کرلیا جائے تو قلم اٹھایا جائے مگر یہ
خیال بھی رفتہ رفتہ زینت طاق نسیاں ہوگیا۔ اس زمانے میں
اساتذۂ جامعہ الہ آباد وغیرہ کی خواہش ہوئی کہ ایک مختصر

تاریخِ ادب ابتدائی درجات کے لئے مہیّا ہو جائے تو مناسب ہے۔ مؤلف کو بھولا ہوا خیال یاد آیا اور یہ چند اوراق تحریر کئے۔ آتشکدہ وخزانۂ عامرہ وغیرہ سے بھی مدد لی۔

تمتّع زہر گوشۂ یافتم ‏ ‏ ‏ ‏ زہر خرمنے خوشۂ یافتم

اب یہ تالیف مطبع کے حوالے کی جاتی ہے۔ اربابِ ذوق عیوب کو نظر انداز کریں اور خدا اسے پاک تحقیق کی توفیق عطا فرمائے والسلام۔

فتحپور۔ بارہ بنکی
یکم جولائی ۱۹۲۴ء

ناصری

باب اول

آثارِ شکستہ

تمہید

ام البلاد کی قومیں جب دنیا کو آباد کرنے نکلیں تو وہی شرافت
پناہ فرقہ جو آریہ یا کہلاتا ہے بام دنیا سے اترا اور مختلف ممالک
کی زینت ہوا۔ نگار خانۂ چین۔ حکمت یونان۔ قانونِ روم اسی کی
بیش بہا یادگاریں ہیں اور وید اور ژند و پاژند اسی کے کارنامے۔
اندلس کی زمین سے چاندی نکالنا اسی فرقے کا کام تھا اور ایران میں
درفش کاویانی کی ترصیع میں اسی کا نام تھا۔ فلسفۂ لغت کے ماہرین
کہتے ہیں کہ ایران (ملک کا نام) بھی اسی قوم کے نام سے مشتق
ہوا اور شاید یونان کی کتب قدیمہ میں اسی کو آریان لکھا ہے۔

آثار قدیم

بہر تقدیر سرزمینِ ایران ابتدائے آفرینش سے جنت نشان
ہے۔ ملک کی شادابی۔ زبان کی شیرینی۔ تخیل کی نزاکت۔ ذہن
کی جودت یہاں کے رہنے والوں کو فطرت کی طرف سے عطا ہوئی
ہیں۔ ان خصوصیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے انشا پردازی سے
اس ملک کو خالی سمجھنا کسی زمانے میں بھی ذرا مشکل ہے۔ یہ اور بات
ہے کہ کبھی بادِ مخالفت کے تند جھونکوں نے ان کی نظم و نثر کے
اوراق منتشر کر دیئے ہوں یا کسی جہاں سوز جنگ نے ان کے
علوم کے خزانے جلا دیئے ہوں لیکن کرمان شاہ کے ویرانے

آج تک تاریخ قدیم کا مقبرہ بنے پڑے ہوئے ہیں اور قصر شیریں وخرابۂ شاپور وخرابۂ استخر وغیرہ اُن نقوش کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہیں جن سے ان پُرانی قوموں کی جواں بختی اور بلند اقبالی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی طرح قدیم زمانے کے اصطلاحات علمیہ اور معارف دینیہ بھی زبان حال سے پکار پکار کے کہتے ہیں کہ

ایک غافل قوم کی کھوئی ہوئی عظمت ہیں ہم
گوش عبرت سے سنو افسانۂ عبرت ہیں ہم

اللہ! اللہ!

ہم روئے زمیں پُراست وہم زیر زمیں — ایں صفحۂ خاک ہر دو رو تصویر است

ادوار سلطنت

تفحص آثار و تصفح اخبار سے اتنا معلوم ہوا ہے کہ مہ آبادیوں سے پیشتر بھی بہت سی سلطنتیں گذر گئی تھیں اور تمدن وتہذیب کسی نہ کسی قسم کی موجود تھی مگر نہ ان خاندانوں کے نام معلوم ہو سکے نہ کوئی اور خاص واقعہ قابل ذکر ملا ہے۔ تسلسل تاریخ قائم کرنے کے لئے خاندان مہ آبادیاں سے ابتدا کی جاتی ہے پھر پیشدادی کیانی۔ اشکانی اور ساسانی حکمراں شمار کئے جاتے ہیں یہانتک کہ اسلام کا حملہ ہوتا ہے اور برکت اسلام سے ایک باضابطہ تاریخ عجم شروع ہوتی ہے۔

باشندگانِ قدیم کے مذہبی حالات وعقائد ہندوؤں سے مشابہ تھے اور اعمال وافعال اور رسم ورواج کے مقابلے سے واضح ہوتا ہے کہ یہ دونوں قومیں ابتدا میں ایک تھیں

ذیل میں چند امور شمار کئے جاتے ہیں :—

(۱) مہ آبادیوں کے زمانے میں چار برن تھے - کاتوزی یعنے زاہدان گوشہ نشین - نیساری یعنے افسران ملک و فوج - نسودی سختی نہ برداشت کرنے والے اور الوہتشی سختی برداشت کرنے والے - پیشدادیوں نے ترمیم کی اور چار گروہ دیوں قائم کئے - آسورنی علمائے ملت - آرتشتار سلاطین و سپاہ - استر یوشتی کاشتکار - ہتخشی مزدور وغیرہ -

(۲) جانوروں کا مارنا گناہ عظیم تھا -

(۳) تناسخ پر اعتقاد جزو مذہب تھا -

(۴) صبح - دوپہر - شام اور آدھی رات کو عبادت کی جاتی تھی - ان کی گیتا کا نام گاتھا اور منتر کی جگہ منتھرا تھا -

(۵) خدائی کارکن جنھیں ہندو لوگ دیوتا کہتے ہیں ان کے یہاں فرشتہ کہلاتے تھے اور آگ - پانی - ہوا - بجلی - بہار - حسن - عشق غرض ہر چیز کا ایک دیوتا یا فرشتہ مانا جاتا تھا - زرتشت نے اس اعتقاد کو بالآخر مٹا دیا -

(۶) اجرام سماوی کی مورتیں بنائی گئی تھیں اور اُن کی پرستش کی جاتی تھی - افسانہ گو اسیکی طرف اشارہ کرتا ہے :—

بدو گفت سہراب کای خوب چہر — بتاج و بتخت و بہ ماہ و بہ مہر

کہ این بارہ با خاک پست آورم — ترا اے ستمگر بدست آورم

(۷) قربان - جنیو - ہون وغیرہ کا بھی پتہ لگتا ہے -

(۸) گائے کی تعظیم بھی کی جاتی تھی اور جب سے فریدوں کی

پرورش کرنے والی گائے برمایہ کو ضحاک نے ذبح کر ڈالا تھا اور کاوہ نے اُس کا چمڑا اور فسش کاویانی میں تعظیماً لگا دیا تھا (جسکے سایہ میں فریدون کو فتح حاصل ہوئی) تو گائے کی تعظیم اور محبت اور بڑھ گئی یہانتک کہ بادشاہوں کے نام گاو یار وغیرہ ہونے لگے۔

(۹) برہمنوں کی طرح ان کے یہاں موبداور دستور تھے جو اپنے علم اور تقدس کی وجہ سے ایک ممتاز گروہ تھے اور قوم ان کی بیحد عظمت کرتی تھی۔

(۱۰) شگون اور فال وغیرہ کا بھی بہت خیال تھا اور بعض وجوہ سے خیال ہوتا ہے کہ ان کے سروں پر چوٹی بھی ہوتی تھی۔

(۱۱) بادشاہ کی تعظیم بھی بیحد کی جاتی تھی اور بزرگان مذہب میں شمار ہوتا تھا۔

(۱۲) بسنت کے مشابہ جشن گل کوبی ہوتا تھا جسمیں زرد پھول توڑے جاتے تھے۔ ابتک لٹریچر میں موجود ہے :-

خدائگانِ جمال و خلاصۂ خوبی — بہ باغِ حسن درآمد بہ رسمِ گل کوبی

سپیمبر کے مشابہ ھمردگیراں کا جلسہ رہتا تھا اور نسل و ولادت کے فرشتے کی تمجید کی جاتی تھی۔ ہولی کے چند روز بعد چراغاں روز اسفند ہوتا تھا۔ شاعری میں اثر موجود ہے :-

سیاہ روز شدم بہر عشرتِ دگراں — دریں زمانہ چراغان روز اسفندم

دسمبر میں بزرگوں کی روحوں کی تعظیم کرتے تھے اور ایک تہوار آتش سوز ہوتا تھا جسمیں آتش خانے روشن کئے جاتے تھے

اور آگ کے دیوتا کی تعظیم ہوتی تھی۔ جون کے مہینے میں آبریزاں ہوتا تھا جسمیں ایک دوسرے پر رنگ ڈالتے تھے۔ اعتدال خریفی کا جشن ستمبر میں ہوتا تھا اور اعتدال ربیعی میں نوروز اور خرم روز ان کے مشہور جشن تھے جنکی مثالیں ہندوستان میں بھی ملیں گی۔

مقدس کتاب

یہ مذہبی حالات جو تحریر ہوئے ہیں بادی النظر میں معلوم ہوتے ہیں کہ کچھ تو مہ آبادیوں اور پیشدادیوں کے وقت سے چلے آتے تھے اور کچھ زرتشت کے بعد جاری ہوئے۔ افسوس ہے کہ دین زرتشتی سے پہلے کے صحف قدیم موجود نہیں اور نہ سردست کوئی ذریعۂ تحقیق موجود ہے ورنہ اس قوم کے ارتقائے مذہبی کی تاریخ مسلسل لکھی جاتی۔ لیکن جہانتک اندازہ ہوسکا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زرتشت کی حیثیت اس تاریخ میں وہی ہے جو گوتم بدھ کی ہندوستان میں ہوئی ہے۔ گشتاسپ اور اسفندیار جو کیانیان دوم کے ابتدائی سلاطین میں تھے زرتشت کے فروغ کے باعث ہوئے جسکی تعلیم و تلقین قدیم عجائب پرستی کی مخالف تھی اور آتش پرستی کے پردے میں ایک نئی روشنی پھیلا رہی تھی۔ اس مصلح دین و ملت کی مقدس کتاب کا نام ژند[ل] تھا مگر یہ کتاب نہایت مشکل تھی اس لئے شرح لکھی گئی اور اس کا نام پاژند[ع] رکھا گیا تاکہ بقول مولانا آزاد "جب ژند پاژند سے ٹکرائے تو جلوۂ حق روشن نظر آئے"۔ مگر شرح متن سے مشکل ہوگئی لہذا اُس کی ایک تفسیر

[ل] لفظی معنی چقماق کا وہ جزو جو آگ نکالتا ہے۔
[ع] چقماق کا دوسرا جزو۔

لکھی گئی جس کا نام استایا اوستا[1] ہے۔ ساسان پنجم نے خسرو پرویز کے زمانے میں چند کتب قدیمہ کا اپنے زمانے کی فصیح زبان میں ترجمہ کیا جو دساتیر کے نام سے مشہور رہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ نامے سلاطین مہ آباد پر نازل ہوے تھے لیکن اصل کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے تاریخ زبان میں انکا درجہ ژند و اوستا کے بہت بعد آتا ہے۔

نمونے کے طور پر ان کتب قدیمہ کے اقتباسات درج کئے جاتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ قبل اسلام اور بعد اسلام کی فارسی میں کس قدر تفاوت ہے۔ ژند کے متعلق اتنا اور تحریر کرنا ضروری ہے کہ اس کتاب کے پچیس بابوں میں سے صرف اُنیسواں باب وندیداد پورا ہے باقی اوراق پریشان رہ گئے۔

استا کا فقرہ۔ اشہم وہو وہستم ہستی اُستا ہماے
راستی نعمت کبریائی ہے۔ رحمت ہو اور فراواں ہو۔ اور تقدس سے

یداشاے وہیشتاے اشہم (وغیرہ)
خیر ترین اشیا ہے۔ چاہتی ہے کرتی ہے۔ ہوگی۔

خوردہ استا (نمازوں اور دعاؤں کے صحیفہ) کا اقتباس۔

مس دوہ و فیروز گرباد مینوے خورشید امرگ راومند
بزرگ و فیروز مند باد مینوی خورشید بے مرگ خالص نورمند

---

[1] یوروپ کے محقق کہتے ہیں کہ اوستا اصل زرتشت کی کتاب ہے۔ جس کی زبان میں ارمنی و کلدانی و اشوری وغیرہ شامل ہیں۔ ژند اس کی شرح پہلوی زبان میں ہے اور پاژند اسی ژند کی دوسری تدوین ہے جس میں خالص فارسی الفاظ زیادہ ہیں اور غیر زبانوں الفاظ شاذ و نادر ہیں۔

خرد ہمند ارو تند اسپ ہمت وہبخت وہورشت

خردمند قوی اسپ بہ نیک نیت نیک گفتار و نیک کردار تمازبراں

دساتیر کا اقتباس

ہوزامیم فہ مزدان ہز ہزماس وزماس ہرشیور

پناہم بہ یزدان از منش و خوی بد و رشت گمراہ کنندہ

ہرو بور فہ فشید شمتائے ہرشندہ ہرششگر زمریان

وبراہ بد برندہ بنام ایزد بخشائندہ بخشائشگر مہربان

فروہید ور۔

دادگر

دیکھنا! اس عجیب اتفاق کو کہ یہ آخری دو فقرے اپنے معانی میں اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے کس قدر مشابہ ہیں۔

ان کتابوں کے ترجمے انگریزی وغیرہ میں ہوگئے ہیں جنکے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حقائق و معارف۔ حکمت اخلاق و سیاست مدن وغیرہ کے ذخیرے ان قوموں کے پاس نہایت عمدہ تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام نے ایران کے کمالات کو معراج پر پہونچا دیا اور اپنے علوم و فنون سے اس ملک کو اتنا متاثر کیا کہ بعد اسلام کے تصانیف۔ اصطلاحات و خیالات وغیرہ میں عرب کے زلہ ربا معلوم ہوتے ہیں لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو پرانی فارسی میں منطق و فلسفہ و فقہ و ادب وغیرہ کے مصطلحات خالص فارسی میں ملتے ہیں اور

علمی کما

بعض مقامات پر مباحث علمیہ بھی ترجمے کے لباس میں نظر آتے
ہیں جن سے پورا یقین ہو جاتا ہے کہ یہ قومیں زمانۂ سابقہ میں کافی
ترقی کر چکی تھیں - ذیل کے اصطلاحات حکمیہ ملاحظہ ہوں :-

عقل اوّل = مہین ہوش — واجب = بابست
علت = ایرایہ — ممکن = شایست
علت مادی = تابیخ — ممتنع = ناباییست
علت صوری = پیکری — جوہر = گوہر
علت فاعلی = کاری — عرض = پیان
علت غائی = کرائی — بسیط = آدرز
قدیم = باش — مرکب = دربست۔ کاموس
حادث = رستہ - نورستہ

منطقی اصطلاحیں دیکھیے :-

نوع = گونہ — دعویٰ = خواستہ
جنس = مہ گونہ — برہان = روشنگر
فصل = بازآر — برہان تطبیق = برہم روشنگر
خاصہ = ویژہ — برہان سلمی = زینہ روشنگر -

سلطنت کے نظم و نسق کے متعلق بھی بہت کچھ معلوم
ہوگیا ہے - بادشاہ کی عظمت بیحد کی جاتی تھی کیونکہ جس طرح
وہ مرتبے میں افضل ہوتا تھا ویسے ہی نیک نیتی اور نیکوکاری میں
بھی سب سے فوقیت رکھتا تھا - اہل دربار کو تعظیم سلطنت
خاص طور سے ملحوظ رہتی تھی . اگر کوئی شخص بادشاہ کی جبروتی

قسم کھاتا تھا تو لوگ اُس سے ملنا جلنا چھوڑ دیتے تھے۔ آئین مہ آبادی میں تاکید تھی کہ رعایا کو آرام سے رکھنا بادشاہ کا فرض ہے۔ وزیر سب سے بڑا مہندس اور حکیم ہوا کرتا تھا اور تمام عمال سرکاری اسکے ماتحت ہوتے تھے۔ خاص ماتحتوں میں دو استوار (امین) دو سندہ بند (وقائع نویس) ہوتے تھے جو منصب وزارت کے مخصوص معین تھے۔ خبر رساں لوگ رَوَند کہلاتے تھے۔ فوج میں ایک لاکھ پر سپہبد۔ اُن سے نیچے کئی سر ہزار کے سردار۔ پھر سو سو پر سپہبد آ پھر دس دس پر سالار پھر چار چار پانچ پانچ کے افسر۔ ہر شہر میں فرہنگ روز (کوتوال) ہوتا تھا جو سراغ رسانی اور واقعہ نگاری کے فرائض کا نگراں تھا۔ مالگذاری مہ آبادیوں کے زمانے میں بیسواں حصہ آمدنی کا تھی لیکن ساسانیوں کے زمانے میں دہ یک کا سلسلہ قائم ہوا۔ فوجداری و دیوانی کے محکموں کے افسر فرہنگ دار اور داوستاں تھے یعنے قاضی و مفتی۔ آئین مہ آباد کے فتوے بغیر بادشاہ کو بھی قتل کا اختیار نہ تھا۔ سوداگر اور مسافر اگر فلاکت میں مبتلا ہو جاتے تھے تو سلطنت کی طرف سے اُن کی مدد کی جاتی تھی۔ بیمار اپاہج بیمار خانوں میں داخل کئے جاتے تھے۔ سراؤں کی تعمیر اور سڑکوں کی درستی پر پوری تاکید رہتی تھی۔ حرم سراؤں کے بھی آداب و قواعد مقرر تھے۔ مختصر یہ کہ ہر حیثیت سے ایک نظم اور ضابطہ کا پتہ لگتا ہے جن سے اسلاف عجم کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔

موسمی حالت کے متعلق بھی کچھ بیان کر دینا لازم ہے کیونکہ موسمی حالا

ہر ملک کی انشا پر تنقیدی نظر پڑنا ممکن نہیں تا وقتیکہ وہاں کے
عقائد و رسوم کے ساتھ ساتھ سیاسی و طبیعی حالات کی اطلاع نہ ہو جائے
فن انشا کی لطافت ہمیشہ نزاکت خیال اور شیرینی ادا سے وابستہ
رہتی ہے اور استعارات و تشبیہات بلکہ امثال و محاورات تک کا
تجزیۂ صحیح اس امر پر شاہد ہے کہ تفاوت تخئیل بقدر تفاوت حالات
طبیعی و سیاسی و مذہبی ہوا کرتا ہے۔ انگریز انشا پرداز گرمی کو عیش
کا زمانہ سمجھتا ہے اور سردی کو مصیبت کا عالم جانتا ہے کیونکہ
ملک اکثر اوقات سرد رہا کرتا ہے لیکن عرب کو اگر کوئی چیز بآسانی
ہاتھ آجاتی ہے تو اُسے غنیمت بارد کہتا ہے یا جسکے دیکھنے سے دل
کو راحت ہوتی ہے اُسے قرۃ العین (آنکھ کی ٹھنڈک) کہتا ہے
کیونکہ ملک گرم ہے اور سردی مغتنمات سے ہے۔ ایران کی
سرزمین سرسبز و شاداب ہے۔ کوہستانی مناظر اور صحراؤں کے
سبزے نہایت دلکش اور روح پرور ہیں موسم اس ملک کے چار
قرار دئے گئے ہیں۔

بہار ۲۱- مارچ سے شروع ہوتی ہے کیونکہ ملک سرد ہے
اور برف جب گھل کے بہ جاتی ہے تو پھول وغیرہ کثرت سے نکل
آتے ہیں اور ہر ٹکڑا زمین کا گلزار ہوتا ہے۔ ایرانیوں کو پھولوں
سے عشق ہے ہر گھر میں پائیں باغ موجود ہے۔ جاڑوں میں جو چمن
برف کی چادر میں ڈھکی ہوئی تھی۔ نوروز آیا اور برف پگھلتے ہی
شاخیں ہری ہونی شروع ہوئیں۔ آج کلی پھوٹی۔ کل پھول نکلا
ہوا میں خنکی۔ پانی سرد۔ مگر آفتاب گرم۔ غرض عجب لطف کا

زمانہ ہے۔ ہندی شاعر نوروز کا حال نظم کرتے وقت پانی برسنے کا نظارہ پیش کرتا ہے جو واقعیت کے سراسر خلاف ہے۔ خاقانی کو دیکھو کس مزے سے کہہ گیا ہے :-

نوروز برقع از رخ زیبا برافگند   برگستواں بہ دُلدلِ شہبا برافگند

یہ برقع کیا ہے۔ وہی برف کی چادر ہے جو ہر خوبصورت چیز کے چہرے سے ہٹ گئی ہے۔ یا مثلاً نظامی نے کہا ہے :-

دہن ناکشادہ لب آبگیر   کہ آید لب غنچہ را بوے شیر

یعنے ابھی حوضوں کے کنارے کی برف اچھی طرح گھل کے بہ نہیں چکی مگر غنچہ کو اپنی پرورش کے لئے پانی ملنے کی امید پیدا ہوگئی ہے۔

تابستان کی ابتدا ۲۲-۲۳ جون سے ہے۔ دریاؤں میں پانی زور و شور سے بہتا ہے۔ میوے تیار ہیں۔ گرمی پڑنے لگی ہے۔ ناشپاتیاں۔ سیب۔ انگور اس کثرت سے ہیں کہ جانور تک ان سے سیر ہو جاتے ہیں۔ کاروبار تجارت بخوبی چلنے لگتے ہیں۔ یہیں سے گرم بازاری یا سرد بازاری سمجھ میں آتی ہے کہ کیا چیز ہے اور یہ محاورات کیوں قائم ہوئے۔ پھر گرمی ہنگامہ۔ گرمی صحبت شعر گرم۔ حسن گرم۔ گرمی گفتار وغیرہ کو دیکھو اور قیاس کرو کہ کیا لطف کا زمانہ ہوگا۔ ہندوستان والا گرمی سے پناہ مانگتا ہے جب تک ایران نہ جائے کیا سمجھے ؟

پائیز ۲۳ ستمبر سے شروع ہوتا ہے۔ برف باری کا آغاز سرد بازاری کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔ کسانوں نے بیج بو دیئے۔ اوپر سے برف گری اور زمین ڈھک گئی۔ فردوسی نے

اسی خیال میں بڑھاپے کی آمد دکھائی ہے۔

بگسترد کافور بر جائے مشک — گل ارغواں شد بہ پائیز خشک

زمستاں ۲۱-دسمبر سے شروع ہوتا ہے۔ برسات کی شدت
برف باری کی کثرت۔ آگ بغیر گذارا نہیں۔ پانی کے قطروں کی
برف کی وجہ سے یہ قطع ہوتی ہے کہ جیسے کوئی آسمان پر سے روئی
دھنک دھنک کے پھینکتا ہے۔ شاعر کہتا ہے

برآمد زکوہ ابر کافور بار — مزاج زمیں گشت کافور خوار

ذرا کافور کا رنگ اور برف کا رنگ دیکھئے۔ پھر دونوں کا
مزاج انتہائی سرد۔ جبتک طبیعی حالات نہ معلوم ہوں اس شعر کا
کیا لطف ہے؟ ہندوستان گرم ملک ہے۔ ہمیشہ ٹھنڈی جگہ پر
بیٹھنے کو جی چاہتا ہے۔ ایران کی حالت اسکے خلاف ہے کہتا ہے۔

عجب جائیست این کاخ دل آویز — کہ چوں جا گرم کردی گفت برخیز

جا گرم کردن کسی جگہ تھوڑی دیر بیٹھنا ہے۔ گویا۔ دنیا تھوڑی
دیر بھی ایک مقام پر اطمینان سے بیٹھنے نہیں دیتی۔ پھر سرد ملک
میں گرم جگہ کو چھوڑ کر گھڑی گھڑی ٹھنڈی جگہ پر بیٹھنا جس بےچینی
کو ظاہر کرتا ہے اُس کا اندازہ اہل عجم ہی کر سکتے ہیں۔

قدیم زبانیں

اس سرسبز اور زرخیز سرزمین کی زبانیں ابتدا میں کیا تھیں؟ اسکا
جواب پرانی فارسی کتابوں میں جہاں دیکھئے یہی ملتا ہے کہ سات
زبانیں رائج تھیں۔ فارسی۔ دری۔ پہلوی۔ ہروی۔ سگزی
زاولی اور سغدی۔ ان میں سے چار آخری زبانوں کے نام شہر
ہرات۔ سگز (سیستان) زابل۔ سغد (سمرقند

وغیرہ) سے منسوب ہیں۔ یہیں ان کا نشو و نما ہوا ہوگا اور یہیں خاتمہ۔ ممکن ہے کہ اب بھی ان ممالک کے محاورات و فقرات میں کوئی خصوصیت باقی ہو جس میں ان مردہ زبانوں کا اثر موجود ہو۔ لیکن کوئی تصنیف یا کتابہ موجود نہ ہونے کی وجہ سے سر دست انکے متعلق کوئی تحقیقی بات نہیں کہی جا سکتی البتہ فارسی - دری اور پہلوی کے بارے میں کچھ عرض کیا جاتا ہے۔

دری

دری کو کہا گیا ہے کہ کسی زمانے میں دربار کی زبان تھی۔ اب قہستان میں اسکے نشان پائے جاتے ہیں۔ اہل یورپ کے تحقیقات کے نتائج سے جو استنباط کیا جا سکتا ہے وہ اتنا ہی ہے کہ غالباً یہ قدیم فارسی ہے جس میں غیر زبانوں کے الفاظ و محاورات داخل نہیں ہیں۔ کیکاؤس و کیخسرو وغیرہ اسی کو بولتے تھے اور نقش رستم اور خرابات استخر کے کتبے اسی زبان میں ہیں۔

پہلوی

پہلوی۔ کہتے ہیں کہ یہ زرتشت کی زبان ہے اور اوستا وغیرہ اسی زبان میں تصنیف ہوئی ہیں۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ محض اُس رسم کتابت کا نام ہے جو ارامی اور اشوری قوموں سے حاصل کی گئی تھی۔ اس رسم الخط میں مثلاً "بادشاہ" کے لئے ایک صورت خاص وضع کی گئی تھی اگر یہ صورت تحریر میں ارامی اور سریانی وغیرہ میں آتی تھی تو اس کا تلفظ "ملِک" کیا جاتا تھا اور اگر فارسی میں آتی تھی تو "شاہ" ہوتا تھا۔ یہ فرق صرف اہلِ زبان کو معلوم تھا۔ اخلاف کے زمانے میں انکے فارسی تلفظ مفقود ہو گئے اور ارامی و اشوری و سریانی وغیرہ کے تلفظ داخل ہو گئے۔ نتیجہ

وغیرہ ابتدا میں کیا تھیں اور غیر قوموں اور فاتحوں کے اثر سے
ان میں ارتقاے تدریجی ہوتے ہوتے کیونکر "اردو" زبان قائم
ہو گئی - انگلستان کی تاریخ سے اندازہ ہوگا کہ انگلیس اور
سیکسن زبانیں کیا تھیں - پھر یونان و ڈنمارک - اندلس و لاطن
فرانسہ و جرمن کے اثر سے موجودہ انگریزی زبان کیونکر قائم
ہوئی - فی الحقیقت اس تالیف کا منشا اسی زبان کے انشا
کے خصوصیات اور انشا پردازوں کے حالات قلمبند کرنا ہیں -
لیکن اخلاف کے کمالات کا سلسلۂ تاریخی قائم کرنے کے لئے
اسلاف کے حالات و خصوصیات کا علم لابدی ہے کیونکہ اساس لغت
و انشا وہی مٹا ہوا النقش ہے لہذا اس مقام پر اختصار کیا جاتا ہے -
انشاءاللہ آئندہ ہر ایک دور کے سلسلے میں اس ارتقاے
تدریجی کا ذکر آئے گا -

قدیم شعر و شاعری

اس باب کے ختم کرنے پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کچھ
اسلاف کی نظم کا بھی ذکر کیا جائے کیونکہ پرانی قوموں میں شعر
کا وجود مستقل تاریخی دنیا میں نثر سے پیشتر دکھائی دیتا ہے مگر
نہایت افسوس سے معذرت کی جاتی ہے کہ کوئی شعر اس وقت
تک ایسا دستیاب نہیں ہوا جو اس زمانے سے منسوب ہو سکے -
ممکن ہے کہ پارسیوں کی بعض دعائیں نظم ہوں یا اور کتب میں
کچھ منظومات درج ہوں لیکن ہمارے تذکرہ نویس صرف اتنا
لکھتے ہیں کہ پہلا مصرعہ بہرام چوبیں کا ہے جس نے فخریہ شیر مار
کے کہا تھا

لیکن تاریخ ادب سمجھنے کے لئے اس کا علم بھی نہایت ضروری ہے - اکثر محاورات و الفاظ - بیشتر تلمیحات و تشبیہات انھیں افسانوں سے وابستہ ہیں - بلکہ قومی خیالات اور رواسم وغیرہ پر ان کا اچھا خاصہ اثر ہے - وما ھذا الا اساطیر الاولین -

باب دوم

اَساطیرِ اوّلین

تمہید

سلاطین مہ آباد اور ان کے پیشرو خاندانوں کے حالات
قصص و حکایات سے بھی کسی مسلسل صورت میں نہیں ملتے۔
شاہنامہ فردوسی اور افسانہائے پہلوی وغیرہ سے معلوم
ہوتا ہے کہ سب سے پہلا حکمراں خاندان پیشدادیوں کا
تھا۔ اُس کے بعد کیانی۔ اشکانی اور ساسانی بادشاہ ہوئے
اول الذکر دو سلسلوں کے حالات محض افسانے ہیں مگر
اشکانیوں اور ساسانیوں کے واقعات فی الجملہ تاریخی امتیاز
بھی رکھتے ہیں۔

کیومرث

پیشدادی خاندان کا پہلا تاجدار کیومرث ہے جو
مذہب زرتشت میں گیا مرت کہلاتا ہے اور ایرانیوں کا باوا
آدم یہی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ بادشاہ اور رعایا پہاڑوں میں
مسکن گزین تھے اور چیتے یا تیندوے کی کھال پہنا کرتے تھے
وحشی جانوروں کو رام کرنا اور انسان کے لئے بکار آمد بنانا
اسی وقت سے شروع ہوا۔ ولیعہد سلطنت اس کا بیٹا
سیامک تھا جو دیوؤں کے ہاتھ سے کسی جنگ میں مارا گیا
لہذا کیومرث کی سی سالہ سلطنت کے بعد اس کا پوتا ہوشنگ

تخت نشین ہوا۔

ہوشنگ

یہ وہی ہوشنگ ہے جس کا نام تاریخ عرب میں اوشہنج ہے۔ اس کی چہل سالہ سلطنت میں آگ کا چقماق سے نکالنا معلوم ہوا اور پارسیوں کا جشنِ سَدَہ اسی اکتشاف کی یادگار ہے۔

طہمورث

تہمورس (طہمورث) دیوبند اپنے باپ ہوشنگ کے بعد وارث سلطنت ہوا۔ لقب خود بتاتا ہے کہ جنوں اور دیوؤں پر غالب آگیا تھا مگر مغلوب قوموں کی جان بخشی اس شرط پر کردی تھی کہ مختلف زبانیں اور خط و کتابت سکھاویں۔ چنانچہ افسانہ نگار کہتے ہیں کہ یہ بادشاہ تیس زبانیں جاننے لگا اور تیس ہی سال سلطنت کرکے دنیا سے گذر گیا۔

جمشید

جمشید اسی پڑھے لکھے باپ کا بیٹا تھا جو قصص و روایات میں قدیم عظمت و سطوت کا مرکز بن گیا ہے۔ اس کا پایۂ تخت استخر تھا جسے تختِ جمشید بھی کہتے ہیں۔ جن۔ دیو۔ پری۔ اس کا مطیع ہوا۔ غرض کائنات پر تسلط تھا۔ اور تخت شاہی ہوا میں اُڑتا تھا اسی وجہ سے عرب اسے سلیمان بن داؤد سمجھتے ہیں حالانکہ ابن المقفع ان "جاہل عربوں" کا مضحکہ اُڑاتا ہے کہ جمشید و سلیمان کے درمیان کم سے کم تین ہزار برس کا فاصلہ تھا۔ بھلا یہ دونوں ایک کیونکر ہو سکتے ہیں۔ ہندوؤں کا یام یہی جم سمجھا گیا ہے کیونکہ شید محض نام پر اضافہ ہے

جیسے خور اور خورشید) اور زرتشتیوں کا جم یا جما بھی یہی ہے۔ شاہنامہ میں لکھا ہے کہ اس کی سلطنت سات سو برس رہی آلات جنگ۔ اسباب لباس و غذا۔ بنا سے مکانات۔ آلات عیش و طرب سب کا موجد یہی ہے۔ نظام سلطنت کے قوانین اولاً اسی نے ترتیب دئے تھے اور ادارات مذہبیہ وحربیہ و مالیہ وغیرہ قائم کئے تھے۔ زر و جواہر کا استعمال زینت و آرائش میں اسی کے وقت میں ہوا اور جام و شراب کا ایجاد کرنے والا بھی یہی منجلا بادشاہ نکلا۔ غالب مرحوم کہہ گیا ہے:-

ساقی چو من پشنگی و افراسیابیم   دانی کہ اصل گوہرم از دودۂ جم است
میراث جم کہ مے بود اینک بمن سپار   زیں پس رسد بہشت کہ میراث آدم است

فارسی انشا میں خصوصیت کے ساتھ دو چیزیں اس زمانے کی بہت مشہور رہیں:-

(۱) جام جم اجرام سماوی اور اقالیم ارضی کا کرہ جن پہ نظر کرکے جمشید گذشتہ اور آئندہ واقعات علم نجوم کی قوت سے بتلایا کرتا تھا۔

(۲) جشن نوروز جس کی ابتدا اس وقت سے ہوتی تھی جب آفتاب برج حمل میں داخل ہوتا تھا اور اعتدال ربیعی شروع ہو جاتا تھا۔ عظمت و اقبال کی فراوانی حد سے بڑھ گئی تو بادشاہ کے دماغ میں غرور آگیا اور خدا کے مقابلے پر آمادہ ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ضحاک کے ہاتھ سے مارڈالا گیا۔ ضحاک کا نام اوستا میں اژدہاک ہے۔ زمانۂ آل ساسان

ہیں اس کا تلفظ عربی کر دیا گیا تاکہ یہ قدیم ایرانیوں کا دشمن بھی
اُسی قوم عرب میں شمار ہونے لگے جو آخر عہد میں سلطنت ایران
سے برابر نبرد آزمائی کیا کرتے تھے اور بالآخر آل ساسان کے
زوال کا باعث ہوئے ضحاک کو نہایت ظالم بادشاہ کہا گیا
ہے اور ظلم کا نتیجہ یوں نکلا کہ دو سانپ اسکے شانوں پر ظاہر
ہوئے۔ جنکی غذا کے لئے دو آدمیوں کے بھیجے روزانہ آتے تھے۔
ہزار برس کی سلطنت میں اس بادشاہ نے اتنے ظلم و ستم کئے
کہ سارا ایران گھبرا گیا۔ کیانیوں سے اس قدر عداوت تھی کہ
واجب القتل ہونے کے لئے اس خاندان سے انتساب کافی
تھا۔ ایک کیانی بی بی حالت حمل میں جان بچا کے بھاگی اور
پہاڑوں میں رہنے لگی۔ وہاں بچہ پیدا ہوا جس کا نام فریدون
رکھا۔ ماں کا دودھ سوکھ گیا اور بچہ مصیبت میں گرفتار ہوا۔
خدا کی رحمت سے ایک گائے آئی جس کا نام مایہ یا مایون
یا پرمایون بتایا گیا ہے۔ اسکے دودھ سے فریدوں کی پرورش ہوئی۔

یکے گاؤ پر مایہ خواہد بدن   جہاندار را دایہ خواہد بدن

ضحاک کو نجومیوں نے بتلایا کہ تیرا دشمن پیدا ہوا ہے
اور فلاں پہاڑ میں پرورش پا رہا ہے۔ ظالم بادشاہ لشکر لیکے
چڑھ دوڑا۔ ماں نے خبر پائی تو فریدوں کو لیکے دوسرے مقام پر
جا چھپی۔ پرمایہ گائے رہ گئی جو ظالم کے ہاتھ سے بیگناہ ماری
گئی۔ ماران ضحاک کی غذا کے لئے قضاء کار کا رکا وہ آہنگر
کے بیٹوں کی باری آئی۔ بڑھے لوہار نے گھبرا کے اپنا پیش بند

فریدوں

یا برمایہ کا چمڑا ایک نیزے پر لٹکایا اور حبِّ قومی کا علم بلند کیا۔ ستم رسیدہ ایرانی جوق جوق اسکے ساتھ ہو گئے اور پہاڑوں سے فریدون کو بادشاہ بنا کے لائے۔ کیانی تاجدار کے دیدار سے قوم کی قوت ایسی بڑھی کہ میدان جنگ میں ظالم ضحاک قتل ہوا اور کیانیوں کی عملداری ہو گئی۔ برمایہ کی یادگار میں گرزِ گاو سر بنایا گیا اور کاوہ کے علم کا چمڑا زر و جواہر سے مرصع کیا گیا جو درفش کاویانی کے نام سے آجتک فارسی لٹریچر پر لہرا رہا ہے اور ظالم کش بادشاہ کا نام بھی اوستا[1] سے لیکے آج تک فارسی انشا میں محبت کے ساتھ لیا جا رہا ہے :-

فریدون فرخ فرشتہ نبود ز مشک و ز عنبر سرشتہ نبود
بداد و دہش یافت آں نیکوئی تو داد و دہش کن فریدون توئی

ایرج فریدوں کے تین بیٹے تھے سلم - تور - ایرج - ایرج سب سے چھوٹا تھا اور باپ کو بیحد محبوب تھا - دونوں بڑے بھائی اپنے چھوٹے بھائی سے حسد کرتے تھے - باپ نے دور اندیشی کی اور اپنا ملک تینوں کو اپنی زندگی میں بانٹ دیا تاکہ بعد کو قتل و خونریزی نہ ہو مگر ہونے والی بات ہو کے رہتی ہے - سلم کو چین و ماچین ملے - تور نے ترکستان اور ماوراءالنہر کی حکومت پائی - ایرج کو سرزمین ایران و ہندوستان ہاتھ آئی - دونوں بھائیوں کو حسد ہوا کہ چہیتے بیٹے کو سب سے اچھا اور زرخیز ملک دیا گیا اور چھوٹے بھائی کے خون کے پیاسے

---

[1] اوستا میں تحفہ اتھاریا اور ہندی میں تری تنا ہے اس بادشاہ کا نام ہے۔

ہو گئے یہانتک کہ اُس کی زندگی کا خاتمہ کرا دیا اور نوجوان بیٹے کی لاش باپ کے پاس بھجوا دی۔ فریدون اس غم میں نہایت بیقرار ہوا اور قسم کھا گیا کہ خون کا انتقام ضرور لیا جائے گا۔

منوچہر

ایرج کا بیٹا **منوچہر** جب سن شعور کو پہونچا تو خون ناحق کے انتقام لینے میں کامیاب ہوا اور فریدون کے سامنے سلم و تور کے سر کاٹ کے بھیجے۔ اسی وقت سے کیانیوں اور تورانیوں کی جنگ کا آغاز ہوتا ہے اور **کیقباد۔ کیکاؤس و کیخسرو** وغیرہ کی زندگی انھیں لڑائیوں میں ختم ہوتی ہے۔ زابلستان اور سیستان کے شہر دآزمانہ پہلوان۔ سام۔ زال اور رستم کے کارنامے ان انسانوں کی آجتک زینت ہیں۔ اُدھر افراسیاب بادشاہ توران کسی سے پست نظر نہیں آتا۔ رستم کے بیٹے سہراب کا باپ سے لڑوا دینا اور ایرانیوں کی زندگی کو تلخ کر دینا اسی کا کام تھا۔ بالآخر کیخسرو کے ہاتھ سے افراسیاب مارا گیا اور قومی لڑائیوں کا فی الجملہ خاتمہ ہوا۔

کیقباد و کیکاؤس و کیخسرو۔

انشائے عجم کے ناظرین کو اس زمانے کے مختلف واقعات لٹریچر میں نظر آئیں گے۔ کہیں **ہفتخوان رستم** کا ذکر ہوگا۔ کہیں "**نوشدارو پس از مرگ سہراب**" کا محاورہ ملیگا۔ کہیں **چاہ بیژن اور منیژہ** کا حوالہ ہوگا۔ کبھی **خون سیاوش۔ پر سیاوشان۔** کبھی **سیمرغ** اور **کوہ قاف** نام آئیں گے۔ جن کی تفصیل شاہنامہ وغیرہ میں ملیگی۔

افراسیاب کے بعد کیخسرو دنیا سے کنارہ کش ہو گئے

لہراسپ گوشۂ عبادت میں گیا اور اپنے داماد لہراسپ کو سلطنت کرنے

گشتاسپ کے لئے چھوڑ دیا۔ لہراسپ کے بعد گشتاسپ بادشاہ ہوا۔
جسکے زمانے میں زرتشت کا ظہور اور آتش پرستی کا رواج ہوا۔

اسفندیار ولیعہد سلطنت اسفندیار رویئین تن خواہ مخواہ رستم سے
حسد کرنے لگا اور خود ایک ہفتخوان سر کرکے پُرانے ہیرو
اور محسن کیانیاں سے لڑنے پر آمادہ ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رستم
کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اسکے تھوڑے عرصے کے بعد رستم کے سوتیلے
بھائی شغاد نے از راہ حسد رستم کی راہ میں ایک کنواں کھودا

چاہ رستم جو خس پوش تھا۔ رستم اپنے رخش پر سوار نادانستہ اس
کوئیں میں گرا اور ہلاک ہوا۔

گشتاسپ کے بعد بہمن دراز دست بادشاہ ہوا

دارا پھر داراب پھر اُس کا بیٹا دارا جسکے زمانے میں سکندر
یونانی کا حملہ ہوا۔ دونوں بادشاہوں کی لڑائی کا حسرتناک
انجام یہ ہوا کہ دارا کے دو مصاحب سکندر کے شریک ہوگئے
اور عین میدان جنگ میں اپنے آقا کو مار ڈالا۔

درخت کیاں را قرو بخت بار   کفن دوخت بر ذرع اسفندیار

سکندر سکندر کی قسمت تاریخ عجم میں عجیب ہے اردا ے
ویراف اسے "ملعون رومی" کہتا ہے۔ فردوسی اسے دارا کا
سوتیلا بھائی بتاتا ہے اور اس طرح یونانیوں کی عظمت کو
کیانیوں کی عظمت قرار دیتا ہے۔ نظامی نے اسے ذوالقرنین
سمجھا ہے جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ

اس نے آتش پرستی کو مٹا کے خدائے واحد کی پرستش اہل ایران میں جاری کی۔

یونانیوں کی حکومت کے بعد پارتھیا کے لوگ یعنی اشکانیو ں کی حکمرانی ہوئی جنھیں عرب کے مورخ ملوک الطوائف کہتے ہیں اور اس خاندان کا خاتمہ اردشیر بابکان کے ہاتھ سے ہوا۔ جو ساسانی خاندان کا پہلا حکمران تھا اور اپنا نسب ساسان بن بہمن بن گشتاسپ تک پہونچاتا تھا۔

اشکانیاں

آل ساسان

آل ساسان کے افسانے کسی قدر تاریخی پہلو لئے ہوئے ہیں۔ اسی خاندان کو اہل یونان "کسراس" اور عرب "اکاسرہ"[۱] عجم کہتے ہیں۔ تاریخ عرب و عجم میں ان بادشاہوں کے حالات نہایت وقعت کے ساتھ درج ہوئے خصوصاً اردشیر و شاپور و نوشیرواں کے قصے آجتک دنیا کو بتا رہے ہیں کہ نصفت و عدالت شان و شوکت سیاست و کیاست میں علم امتیاز انھیں کا بلند تھا مگر ارمنی مورخین انکے خلاف ہیں کیونکہ ان سلاطین کے ہاتھوں عیسائیوں کو شدید نقصان پہونچے تھے۔

اردشیر

اردشیر بابکان کا پہلا کارنامہ یہ ہوا کہ ملوک الطوائف کے آخری بادشاہ اردوان کو حکمت عملی سے زیر کیا اور میدان جنگ میں شکست فاش دی۔ پھر قوم کرد پر حملہ آور ہوا اور مملکت کو ان کے دغدغے سے پاک کیا ہفتان بخت شہر کرمان کی ایک بلا تھی جس سے تمام ملک پریشان تھا۔ اردشیر نے

---

[۱] واحد کسرےٰ

اس کا بھی خاتمہ کیا اور قرۃ کیانی کی وقعت ثابت ہوگئی۔

شاپور

شاپور بن اردشیر کی عظمت بھی اپنے باپ سے کم نہیں۔ نقش رستم اور خرائبہ شاپور کے نقوش سے ثابت ہے کہ اسنے قیصر روم کو شکست دیکر ایران کا اثر مشرق سے مغرب تک پھیلا دیا تھا۔ ان کتبوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ سلاطین ساسانیہ اپنی سلطنت کو خلافت الٰہی اور اپنے کو خلیفۃ اللہ بلکہ خدا کا وارث سمجھتے تھے چنانچہ ایک عبارت منقوشہ کا ترجمہ یہ ہے :-

"یہ تو تو بیح ہے مجھ بندۂ خدا شاپور کی جس کی جگہہ معبودوں میں ہے۔ جو شاہنشاہ ایران وغیر ایران ہے۔ جو سلسلۂ آسمانی خدا کا وارث ہے۔ جو بیٹا بندۂ خدا ارتخشتر کا ہے" الخ

مانی

شاپور کے زمانے میں مانی ظاہر ہوا جس نے پہلے بادشاہ کے بھائی پرویز کو اور پھر خود شاپور کو اپنے مذہب میں داخل کیا۔ اسکے مذہب کو عربوں نے ثنویہ لکھاہے مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زرتشت کا مذہب بھی ایک قسم کی ثنویت ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ دونوں میں فرق کیا ہے اور کیوں ایک دوسرے کے مخالف ہیں؟ مذہب زرتشت یا مجوسیت میں ایک قادر مطلق یا خالق مطلق ہے۔ پھر اس کی دو حیثیتیں ہیں۔ ہرمزد (خالق خیر) اور آنرمینوش یا اہرمن (خالق شر) لیکن یہ مذہب مادیت لئے ہوئے ہے۔ تمام حیوانات و نباتات کو انسان کے فائدہ کیلئے سمجھتا ہے اور خود انسان کو توالد و تناسل۔ جنگ و جدال۔ سلطنت و تجارت وغیرہ کی اجازت دیتا ہے۔ برخلاف اسکے

مانی کا مذہب نور کو خیر اور ظلمت کو شر کہتا ہے اور تمام امور دنیا
کو ظلمانیت یعنی خالق شر کا اثر سمجھتا ہے۔ لٹریچر میں اثر موجود ہے۔
سیہ بخت۔ سیہ روز۔ سیہ گلیم وغیرہ بُرے معنوں میں ہیں روشن روز۔
روشن رواں وغیرہ اچھی حالت ظاہر کرتے ہیں۔ مانی کا مذہب
چاہتا ہے کہ انسان بالکل دنیا کو ترک کرے اور گوشۂ تجرد میں
بیٹھ کے اپنے کو فنا کر دے۔ اس مذہب کے پانچ درجے ہیں معلمین
(ابناء الرحم)۔ مشمسین (ابناء العلم)۔ قسیسین (ابناء العقل) صدیقین
(ابنائے ذاتِ غیر مرئی)۔ سماعین (ابنائے ذکاوت)۔ (پروفیسر
بیون کا خیال ہے کہ یہی صدیق رفتہ رفتہ زندیق ہو گیا اور
خلیفہ مہدی باللہ کے زمانے میں تمام مانی کی امت کو زنادقہ
کہنے لگے جن کا استیصال بنی عباس کے زمانے میں عرصے تک
ہوا کیا)۔ مانی گوتم بدھ کو ہندوستان کا پیغمبر۔ جناب عیسیٰ کو
سرزمین اسرائیل کا نبی اور اپنے کو بابل و نینوی وغیرہ کا پیغمبر
سمجھتا تھا۔ اس کی کتابیں سات ہیں کتاب الہدیٰ والتدبیر
سفر الجبابرہ۔ سفر الاسرار۔ کنز الاحیاء وغیرہ چھ کتابیں سریانی
دستو اور شاپورقان پہلوی میں ہے۔ اس نے اپنے تصانیف کے لیے
عقیدۂ خاص خط ایجاد کیا تھا جو نہایت اہتمام سے لکھا جاتا تھا اور
ہے۔ ایرانیوں کا ایک گروہ اس رسم الخط کی خوشنمائی میں مدد دیتا
تھا لہذا غالباً اسی وجہ سے مانی کو مصور سمجھا گیا ہے اور تصویر کشی
اس کا معجزہ قرار دیا گیا ہے۔
غرض شاپور نے جب یہ مذہب قبول کیا تو ایرانیوں کو

شاق ہوا اور جب وہ لوگ بھی مانی کے آئین ماننے پر مجبور کئے گئے تو اور زیادہ پریشان ہوئے - آخر مجوسیوں کا ایک موبد بادشاہ کے سامنے آیا اور عرض کرنے لگا کہ اگر مجھے مناظرے کی اجازت دیجائے تو بہت اچھا ہے تاکہ حق و باطل کا فیصلہ ہو جائے اور ایران میں صرف ایک مذہب قائم رہے - بادشاہ نے اجازت دیدی - نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ کو مانی کا مذہب ترک کرنا پڑا اور مجوسیت کو غلبہ ہوا - مانی پر حکم شرک لگایا گیا اور واجب القتل ٹھرایا گیا مگر وہ ایران سے بھاگ گیا اور شاپور کے زمانۂ سلطنت تک ہندوستان و چین میں اپنا مذہب پھیلاتا رہا -

ہرمزد

شاپور کے بعد اُس کا بیٹا ہرمزد تخت نشین ہوا - رام ہرمزد اسی کا بنایا ہوا ہے - ایک سال سلطنت کر کے انتقال کر گیا -

بہرام

پھر بہرام پسر ہرمزد مسند آرائے سلطنت ہوا اور عالم جوانی کی وجہ سے عیش و عشرت کیطرف مائل ہو گیا - بادشاہ کو عیش پرست سمجھ کے مانی واپس آیا اور چاہا کہ پھر اپنا مذہب پھیلائے مگر بہرام نے گرفتار کرا کے اُس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا -

اس کے بعد کئی صدیوں تک اکاسرۂ عجم مذہب زرتشت کے پیرو رہے یہانتک کہ نوشیروان عادل کا زمانہ آیا ابھی اسکا باپ کواد (قباد) سلطنت کر رہا تھا کہ ایک شخص مزدک ظاہر ہوا جس نے موبدوں کے اثر کو توڑ کے مساوات

مزدک

بین الناس کو قائم کرنا چاہا اور خود دعویٰ پیغمبری کیا۔ **قباد** خود چاہتا تھا کہ کسی طرح موبدوں کا اثر کم ہو۔ اُس نے **مزدک** کو باریابی دی اور اُس کا دین قبول کیا۔ اس کا خیال تھا کہ تمام برائیاں حرص و حسد و غصہ کے شیاطین کی وجہ سے دنیا میں آئی ہیں۔ **نوشیروان** نے اسکے نیرنگ اور شعبدوں کی حقیقت بیان کر کے باپ کے خیالات بدل دیئے۔ پھر ایک روز **مزدک** اور اُسکے پیروؤں کی دعوت ایک باغ میں کی اور ظاہر کیا کہ اس تقریب کے موقع پر میں آئین **مزدک** کو قبول کرونگا۔ مزدکی لوگ جوق جوق آنے لگے لیکن جو گروہ باغ میں داخل ہوا **نوشیروان** کے سپاہیوں نے اُسے تہ تیغ کیا اور زمین میں سر کے بل دفن کر دیا اور پاؤں باہر کھڑے رکھے۔ آخر میں **مزدک** آیا۔ اسے نوشیروان نے یہ دردناک منظر دکھایا اور کہا "تمھارے اقوال و اعمال کے یہ درخت اُگے ہیں"۔ پھر اُسے بھی قتل کیا اور یوں ہی دفن کیا۔

نوشیروان

نوشیروان جب خود بادشاہ ہوا تو بقیہ مزدکیوں کو رہنا دشوار ہو گیا۔ بیشتر ہلاک ہو گئے۔ اور باقی خفیہ طور سے اپنے عقیدے پر قائم رہے مگر علانیہ زرتشت کے مذہب کو مانتے رہے۔ اس کے بیٹے **انوشہ زاد** نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا لہذا باپ کا برتاؤ اس مذہب کے ساتھ بھی اچھا نہ تھا۔ وجہ ہے کہ عیسائی مورخ عدالت نوشیروان کی شہرت کا سبب مزدکیوں اور عیسائیوں کے قتل کو بتاتے ہیں جو موبدان

پارس کی خوشنودی کا باعث ہوا تھا۔حقیقت یہ ہے کہ نوشیرواں
اُن بادشاہوں میں سے گذرا ہے جس کی عقل وکیاست،فراخدلی
اور عالی حوصلگی پر تاریخ سلاطین عالم کو ناز ہے اور جن لوگوں نے
نوشیرواں وقیاصرۂ روم کے محاربات وغیرہ کو پڑھا ہے وہ
جانتے ہیں کہ یہ بادشاہ کس مرتبہ کا تھا۔ اسکے ملفوظات وحِکَم
کے ترجمے آجتک شہادت دیتے ہیں کہ معاملۂ عدل وانصاف
میں کسی شاہزادے کا قتل کرڈالنا یا کسی ضعیف سے مجوج ہوجانا
اسکے لئے ایک معمولی امر تھا۔ اسی کے زمانے میں ولادت حضرت
رسول مقبول علیہ الصّلوٰۃ والسّلام واقع ہوئی اور اسی کے
ایوان کے چودہ کنگرے شب مولود گرے اور آتشکدے سرد
ہوگئے۔ نوشیرواں نے کاہنوں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا
کہ آل ساسان کے چودہ بادشاہ حکومت کرینگے پھر انکا زمانۂ
سلطنت ختم ہوجائیگا اور پیغمبر عرب کے پیرو سلطنت عجم کے
مالک ہونگے۔ بادشاہ نے کہا کہ کم سے کم دوسو برس کی مدّت
اس کو بھی چاہئیے۔ اصحاب فیل کا واقعہ بھی اسی زمانے میں ہوا
اور نتیجہ یہ ہوا کہ ملک یمن ایرانیوں کے تصرف میں آگیا۔ ہندوستان
ویونان کے فلسفہ وطب وغیرہ کی کتابوں کے ترجمے اسکے حکم
سے پہلوی میں کئے گئے اور ملک خاطر خواہ ترقی پذیر ہوا۔

بالِ الکاسرہ

نوشیرواں کے بعد اس کا بیٹا **ہرمز** تخت نشین
ہوا۔ پھر ہرمز چہارم بادشاہ ہوا جسکی سفاہت وظلم کی وجہ
سے بہرام چوبین غالب آگیا اور ساسانیوں کی سلطنت

کمزور ہونے لگی پھر خسرو پرویز کی باری آئی مگر وہ زیادہ
سلطنت نہ کر سکا اور اپنے بیٹے شیرویہ کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اس
ظالم بیٹے نے بادشاہ ہوتے ہی اپنے اٹھارہ بھائیوں کو بھی قتل کر ڈالا
اور بالآخر خود بھی مر گیا۔ اسی زمانے میں مرض طاعون پھیلا اور رہا سہا
ایران غارت ہو گیا۔ پھر اس کا ہفت سالہ بچہ اردشیر بادشاہ
بنایا گیا مگر وہ بھی غاصب شہر براز کے ہاتھوں قتل ہوا۔ پھر
پوران دخت پرویز کی بیٹی بادشاہ ہوئی جس نے اپنی
قابلیت خداداد سے ملک کی حالت بہت کچھ درست کی مگر موت
نے اُسے بھی مہلت نہ دی۔ اسکے بعد پیروز پھر اُسکی بہن
آرزم دخت کو سلطنت ملی مگر یہ سب بھی تباہ ہوئے۔ خلاصہ
یہ کہ خسرو پرویز سے لیکے یزدجرد سوم تک تیرہ بادشاہ ہوئے
اور پانچ برس کے عرصے میں سب ختم ہو گئے۔ آخری بادشاہ
عربوں سے شکست کھا کے بھاگا اور ایک بے حقیقت مخلوق کے
ہاتھ سے طمع زر میں مارا گیا۔

اب اس خاندان کے قصے زبانوں پر ہیں اور کتابے شکستہ
دیواروں پر۔ اسلام کے آنے سے ایران کی حالت بالکل بدل گئی
نہ وہ لٹریچر رہا۔ نہ وہ مذہبی خیالات۔ نہ وہ عقائد۔ نہ وہ رسوم۔ البتہ
دوربین نظریں آنے والی سولزیشن میں مٹے ہوئے نشان ان صنادید
عجم کے دیکھتی ہیں اور چشم ظاہر بین کے لئے صرف اتنا ہے کہ

پردہ داری می کند بر طاق کسریٰ عنکبوت   چغد نوبت می زند بر گنبد افراسیاب

باب سوم

آغاز اسلام اور انشائے عجم

عرب کا داخلہ

یزدجرد سوم کے خاتمہ نے آل ساسان اور دین زرتشت کی شوکت کو ایران سے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا اور دین اسلام اور تمدن عرب کا فاتحانہ شان سے گل و بلبل کی سرزمین پر داخلہ ہوا۔ فاتحوں کی شجاعت و ذکاوت اور زبان عربی کی فصاحت و وسعت نے جب ایران سا سرسبز و شاداب ملک اور ایرانیوں سے نفیس الطبع لوگ پائے تو دونوں قوموں کے باہمی تعلقات سے سیاسی اور علمی منظر رنگ بدلنے لگے۔ یوں تو یونانیوں اور اشکانیوں کی بھی صدیوں عملداری رہی مگر ایران کی زبان کسی طرح تسخیر نہ ہوئی۔ خدا جانے سامی زبانوں میں کیا جذب تھا کہ قبل اسلام ارامی و کلدانی و سریانی وغیرہ سے یہ زبان متاثر ہوئی اور اس صلاحیتِ تاثر اور مادۂ قبول کا یہ نتیجہ ہوا کہ عربوں کے آتے ہی اُن کی زبان کے الفاظ اس کثرت سے داخل ہوئے کہ آج بغیر عربی کی اچھی تعلیم کے فارسی زبان کے خصوصیات سے لذت ملنا ناممکن ہے۔

زبان پر عرب کا اثر

ایرانیوں نے سب سے پہلے اپنے حروف تہجّی یک قلم موقوف کئے (جو بائیں طرف سے داہنی طرف لکھے جاتے تھے) اور عربی کے حروف تہجی کو ایرانی جامہ پہنایا۔ جہاں آوازیں مشترک تھیں

وہاں عربی حروف کا داخل کرنا آسان تھا۔ غیر مشترک آوازوں
کے لئے پ۔ چ۔ ژ۔ گ اختراع کئے گئے اور بائے فارسی۔
جیم فارسی۔ زائے فارسی اور کاف فارسی نام رکھے گئے۔ پھر عربی
صرف و نحو کی تقلید شروع کی اور اضافت و توصیف و تصغیر و
نسبت وغیرہ کو اختیار کر کے زبان کو وسیع کیا۔ اسکے بعد عربی
الفاظ و محاورات پر تصرف شروع کئے اور معنی وضعی پر بھی
فی الجملہ نظر رکھتے ہوئے اپنی زبان میں نازک طریقوں سے الفاظ
عرب کا استعمال شروع کیا مثلاً سیر عربی میں چلنے کو کہتے ہیں لیکن
فارسی میں سیر کردن محض دیکھنے کے معنوں میں رہ گیا اور تماشا
کا بھی یہی حال ہوا کہ "نظارہ" کے حدود میں آگیا۔ یا شمہ عربی
میں سونگھنا تھا فارسی میں ذراسی چیز کو کہتے ہیں (جتنی شاید
سونگھنے کو درکار ہوتی ہے)۔ اسی طرح ارتفاع و سبق وغیرہ
وغیرہ بکثرت الفاظ ہیں جنکے عربی و فارسی معانی میں تفاوت
بعیدہ ہوگیا ہے حالانکہ بالاصالۃ عربی ہیں۔ اسکے علاوہ بہت سے
مشدد الفاظ کی تشدید کو دور کیا کہ زبان میں ثقل نہ پیدا ہو۔ خاصیت
و کیفیت و جادہ وغیرہ اسی کی مثالیں ہیں۔ پھر عربی مرکبات کو
بطور مفرد بولنا شروع کیا۔ ماجرا۔ ماورا۔ ماسوا وغیرہ کے
لفظی معنی دیکھو اور فارسی میں ان کا بے تکلف استعمال دیکھو۔
عربی محاورات کو بھی اپنی زبان میں داخل کیا مثلاً زر خالص
کو زر جعفری کہنے لگے حالانکہ نسبت خود بتاتی ہے کہ جعفر برمکی نے
عرب میں سونے کو خالص کیا تھا عجم سے کیا واسطہ؟ اور زر مغربی

کہنا اور تعجب خیز ہے کیونکہ عرب اقصائے مغرب کے سوسنے کو خالص سمجھتے تھے۔ ایرانیوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اسی طرح لالہ کو شقائق یا شقائق النعمان کہنا یا طوفان نوح و برش ذوالفقار وغیرہ کی تلمیحیں بے تکلف لانا یا ویس ورامین وغیرہ کو چھوڑ کر قیس ولیلی۔ وامق و عذرا۔ سعد وسلمی کا ذکر کرنا یا الفس ز دل صحیح۔ شب زندہ داری۔ بسر و چشم و خنکی چشم۔ دختر رز۔ اشک شمع۔ دامن کشاں رفتن وغیرہ وغیرہ بولنا ان سب سے ثابت ہوتا ہے کہ فارسی زبان نے عرب کا اثر بہت جلد قبول کیا اور اپنے کو اس قابل بنایا کہ علوم و فنون قدیمہ و جدیدہ کے لئے مختلف اعتبارات سے مفید ثابت ہو۔

تاریخ بتاتی ہے کہ جنگ ذوقار اور قادسیہ کے بعد سے انتہائے عجم پر سطوت عرب قائم ہوگئی اور مفتوحین کو فاتحین کے علوم و فنون سیکھنے میں اس قدر انہماک ہوا کہ تحریر و تقریر بیشتر عربی میں ہونے لگی۔ دواوین و دفاتر کی زبان عربی تھی۔ غرض ان ڈھائی تین صدیوں میں ایسا کچھ ہوا کہ اسلامی علوم و فنون کے بیشتر ائمہ عجمی نژاد لوگ ہوئے۔ حدیث۔ تفسیر۔ فقہ۔ اصول۔ معانی بیان وغیرہ وغیرہ میں جس قدر بیش بہا کتابیں ایرانیوں کے قلم سے نکلی ہیں اگر ان کا احصا کیا جائے تو ایرانی زبان کی تاریخ کے بجائے یہ کتاب عربی زبان کی تاریخ ہو جائیگی۔

عربی زبان ایران میں

اب دیکھنا یہ ہے کہ عربی علوم و خیالات کا اثر اہل عجم پر تدریجاً کیونکر ہوا۔ زمانۂ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

عرب جاہلیت

عرب کے تمدن و معاشرت کے متعلق مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ملوک حمیر و غسان وغیرہ کے درباروں کے علاوہ اس ملک میں بدویت غالب تھی اور صرافت نسب۔ حمیت قوم۔ آزادیِ خیال یہاں کے رہنے والوں کے خاص جوہر تھے۔ یہ قوم اگرچہ قعرِ جہالت میں پڑی تھی اور (بقول گبن) علوم و فنون کی لہرین اوپر ہی اوپر گذر جاتی تھیں اور ان لوگوں کو خبر بھی نہ ہوتی تھی لیکن فن شعر و خطابت میں انھیں یدِ طولیٰ ہو گیا تھا۔

حقیقتِ شعر

حقیقت شعر[1] کے جاننے والے اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ شاعری ایک وجدانی اور ذوقی چیز ہے جس کا تعلق احساس سے ہے۔ احساس کسی اثر ڈالنے والے واقعے سے متاثر ہونے کو کہتے ہیں اور ادراک اشیا کا معلوم کرنا اور استدلال و استنباط سے کام لینا ہے۔ مثلاً کسی واقعے سے صدمہ ہونا یا کسی بات پر حیرت ہونا یا کسی امر سے خوش ہو جانا یہ سب احساسات ہیں اور شعر فی الحقیقت احساسات کی تصویر ہے جو الفاظ میں کھینچی جاتی ہے اس غرض سے کہ یہ تصویر دوسروں کے دلوں پر وہی اثر ڈالے جو قائل کے دل پر پیدا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض محققین فلک نیلگوں۔ نجم درخشاں۔ نسیم صبح۔ شادابیِ چمن۔ ویرانیِ بیابان وغیرہ کو شعر سمجھتے ہیں کیونکہ ان چیزوں سے دل پر اثر پڑتا ہے۔

محاکات

عربی میں اس تصویر کشی کا علمی نام محاکات ہے جس کا موقلم تخییل ہے

---

[1] مولانا شبلی نعمانی نے شعر العجم کی چوتھی جلد میں اس پر محققانہ بحث لکھی ہے جو قابل ملاحظہ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ شاعر جب کسی واردات قلبی یا موجود خارجی کی تصویر شعر کے ذریعے سے کھینچنا چاہتا ہے تو اُن امور کا برتنا فرض سمجھتا ہے جنسے جذبات انسانی برانگیختہ ہوتے ہیں اور تناسب الفاظ حد بیان اور لہجۂ ادا کا پورا خیال رکھتا ہے جسکے مجموعے کو عروضی اصطلاح میں وزن و بحر وغیرہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ شعرائے کاملین جس امر کا اظہار چاہتے ہیں یا جیسا اثر ڈالنا چاہتے ہیں اُسکے مناسب بحر و ردیف و قافیہ وغیرہ اختیار کرتے ہیں اور محض لفاظی کے شاعر کسی خیال کے موزوں کر لینے کو شعر سمجھتے ہیں حالانکہ چند الفاظ کا کسی بحر عروضی کے مطابق کر لینا اور بات ہے اور اپنے خیال کے لئے مناسب وزن کا منتخب کرنا اور بات ہے۔

داند آنکس کہ فصاحت بکلامے دارد ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

کہتے ہیں کہ ایک ہندی شاعر شیخ علی حزیں کے سامنے یہ شعر بغرض اصلاح لے گیا:۔

سیہ چوڑی بدست آن نگار نازنیں دیدم
بشاخ صندلیں پیچیدہ مارے عنبریں دیدم

اُنھوں نے آخری دو لفظ دونوں مصرعوں سے کاٹ دئے اور کہا کہ جبتک انتخاب بحر کا سلیقہ نہ ہو شعر کہنا بیکار ہے۔ اب شعر یوں رہ گیا:

سیہ چوڑی بدست آں نگارے بہ شاخ صندلیں پیچیدہ مارے

اہل ذوق سمجھتے ہیں کہ محض بحر کے بدلنے سے شعر کا اثر کتنا موقوف کیا ہو گیا۔

تخیل قوت اختراع کا نام ہے جو احساسات کے تجربے میں ...

کرتی ہے بلکہ اگر اوراکات بھی قیدِ وزن وقافیہ وغیرہ میں آتے ہیں تو
اُن پر بھی شاعرانہ رنگ چڑھا دینا اسی قوتِ اختراع کا کام ہے۔ مثلاً
آفتاب کا وقت طلوع سرخی مائل ہونا۔ دریاؤں کا بہنا۔ حبابوں کا
اُبھرنا اور ٹوٹنا۔ موجوں کا دریا کے کناروں سے ٹکرانا۔ ان موجودات
خارجی کا حال اتنے ہی الفاظ میں بیان کر دینا محاکات ہے جیسا کہ اکثر
نیچرل نظموں میں آجکل نظر آتا ہے۔ انیسؔ نے بھی اسی سماں کا نقشہ
کھینچا ہے اور اس محاکات پر دو طرح کا رنگ چڑھایا ہے۔ ایک رنگ
وہ ہے جو ہر صاحب ذوق کو روزانہ نظر آتا ہے اور اُس کی قوت تخیل
ان موجودات کے متشابہات بیان کرکے تصویر میں رنگ بھرتی ہے
(اس مثال میں محض آفتاب نکلنے کا ذکر ہے) :-

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زارِ صبح — گلزارِ شب خزاں ہوا آئی بہارِ صبح
کرنے لگا فلک زرِ انجم نثارِ صبح — سرگرم ذکرِ حق ہوئے طاعت گزارِ صبح

تھا چرخِ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

دوسرا سماں صبح عاشور کا ہے۔ شاعر موجودات خارجیہ کی تصویر
کھینچتا ہے مگر اُس رنگ میں جو اُسے نظر آتا ہے کیونکہ خود مسلمان ہے اور
حسینؑ مظلوم کا ماتمدار :-

تھا بسکہ روزِ قتلِ شہ آسماں جناب — تھا خون کو ملے ہوئے چہرے پہ آفتاب
تھی نہرِ علقمہ بھی خجالت سے آب آب — روتا تھا پھوٹ پھوٹ کے دریا میں حباب

اک وھوم تھی جو قتلِ شہِ کائنات کی
ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

غرضکہ محاکات کا کمال یہ ہے کہ مطابق اصل ہو اور اگر ضرورت ہو تو
جزئیات کا بھی استقصا کر لیا جائے تاکہ پوری شے کی تصویر نظر آ جائے بلکہ
الفاظ کی نرمی و درشتی اور آوازوں کی بلندی و پستی سے بھی حسب ضرورت
کام لیا جائے ورنہ محاکات ناقص رہ جائیگی۔ مثلاً طوفان نوح کا زور و
شور جب حد سے گذرا تو حکم الٰہی ہوا کہ بارش موقوف ہو اور زمین کا پانی
بھی خشک ہو جائے۔ چنانچہ قرآن مجید میں حکم خدا کے یہ الفاظ ہیں:۔
یٰۤاَرْضُ ابْلَعِیْ مَآءَكِ وَیٰسَمَآءُ اَقْلِعِیْ وَغِیْضَ الْمَآءُ
اے زمین اپنا پانی نگل لے اور اے آسمان صاف ہو جا اور پانی سوکھ گیا
وَقُضِیَ الْاَمْرُ
اور حکم پورا ہو گیا۔

الفاظ کی آوازیں عربی میں خود بتا رہی ہیں کہ یہ کوئی ہیبت کا
مقام جس کا نقشہ اردو ترجمہ نہ کھینچ سکا کیونکہ محاکات حکایت الصوت
پر مبنی ہے جو عربی سے اس مقام پر مخصوص ہے۔ اسی طرح معانی میں
بھی مقتضائے حال کا خیال رکھا جاتا ہے مثلاً شاعر کے خیال میں امام حسینؑ
کے پاس کربلا میں زعفر جن آیا مگر فرزند رسول کو اس حال زار میں
دیکھ کے نہ پہچان سکا۔ اس نے پوچھا کہ "آپ کون شخص ہیں" جواب
کامل یوں ہوتا کہ بتلایا جاتا کہ میں بہت بڑی عزت والا شخص ہوں
فرزند رسول ہوں۔ زمین و آسمان پر میرا تصرف ہے لیکن مقتضائے
حال ان تمام تفصیلوں کو روکتا ہے۔ انیس کو اس موقع کا پورا
اپنے اعتقاد یا حقیقت حال کو پہلے مصرع میں ظاہر کئے دیتے
محاکات کو اس رنگ آمیزی سے الگ رکھتے ہیں کہ تصویر

نفاست میں فرق نہ آئے :-

یہ تو نہ کہہ سکے کہ شہ مشرقین ہوں	سوا اس نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں

تخییل کا زور

تخییل کا زور یہ ہے کہ شاعر کائنات کو اپنے رنگ میں سر کھینچ کے لاتا ہے۔ بادشاہ کے تاج کے لئے موتی درکار ہوتے ہیں تو یوں کہتا ہے :-

علم برکش ای آفتاب بلند	خراماں شو ای ابر مشکیں پرند
بیار ای ہوا قطرۂ ناب را	بگیر ای صدف در کن آں آب را
برآ ای در از قعر دریای خویش	بہ تاج سر شاہ کن جای خویش

اگر ان اشعار میں قوت تخییل خطاب کا رنگ نہ بھرتی تو محاکات محض تھی کیونکہ اُس زمانے کے لوگ موتی کی پیدائش یوں ہی مانتے تھے مگر قوت تخییل نے خطاب کا رنگ بھر کے سطوت شاہانہ کو ظاہر کر دیا جس کے بغیر تصویر ناقص رہی جاتی تھی یا مثلاً باز وغیرہ کی عادت ہوتی ہے کہ بار بار اُس تسمے کو نوچتے ہیں جن سے پاؤں بندھا ہوتا ہے۔ بادشاہ کے ہاتھ پر یہی باز بیٹھا ہے۔ سلمان ساوجی محاکات کے ساتھ ساتھ صنعت حسن تعلیل اپنی قوت تخییل سے پیدا کرتا ہے اور یوں کہتا ہے :-

گشتست پای باز مشرف بدست تو	ہر پای خویش بوسہ بسالی ازاں دہد

یا مثلاً مسائل فلسفیہ منطقیہ وغیرہ پر نظر ثانی کی جاتی ہے تو قوت تخییل اُن رازوں کو کھول دیتی ہے جو ر وکھا سوکھا فلسفہ کبھی ادا نہ کر سکتا۔

موجیم کہ آسودگی ما عدم ماست	ما زندہ بہ آنیم کہ آرام نگیریم

دیکھئے کس لطف سے اس مسئلہ کا انکشاف ہوا کہ جو چیز ساکن نظر آئے اُس کے بھی ذرات ضرور متحرک ہونگے کیونکہ سکون محض کا نتیجہ عدم ہے اور وجود حرکت کا نتیجہ ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اہل فلسفہ اسے تصفیہ شدہ

کہہ کے مغالطات کی فہرست میں جگہ دیں مگر اثر کے لحاظ سے جو اس تخییل کا مرتبہ ہے اُسے اہل ذوق ہی خوب سمجھتے ہیں۔ اسی قوت نے تشبیہ و استعارہ۔ صنائع و بدائع حسن بندش و ترکیب وغیرہ کو خلق کیا ہے۔ صاحب ذوق سلیم اپنے اندازہ صحیح کی بنا پر ان سے کام لیتا ہے اور محسوسات بلکہ معقولات تک کی تصویریں نہایت عمدہ رنگ میں کھینچتا ہے مگر جن کا مذاق بگڑا ہوتا ہے وہ محاکات و تخییل کے استعمال میں بے اعتدالی کرتے ہیں اور شعر اُن کا بے اثر ہو جاتا ہے۔

شعر جاہلیت — شعرائے جاہلیت ان بے اعتدالیوں سے اکثر بری تھے۔ جس حریت اور شرافت کی آب و ہوا میں ان کی پرورش ہو رہی تھی وہاں تملق اور چاپلوسی کا گذر نہ تھا۔ لوگ اپنے رنگ میں مست تھے اور اُسی مستی کے عالم میں شعر بھی کہہ گذرتے تھے جو سراسر حقیقت ہوتا تھا۔ گرم ملک میں نشو و نما۔ خون کا رگوں میں جوش مارنا۔ قوم آزاد اور آزادی پرست! ایسے عالم میں ارادے بڑھے ہوتے ہیں اور اُمنگوں کا زور ہوتا ہے۔ فسق ہو یا غیر فسق۔ خیر ہو یا شر۔ جنگ ہو یا صلح۔ غرض ہر بات بلا ارادہ آزادی سے کی جاتی تھی اور جب کامیابی ہوتی تھی تو اُس پر فخریہ شعر کہے جاتے تھے۔ حسان بن ثابت کے وقت تک یہ حالت تھی جنھوں نے زمانہ اسلام کو بھی دیکھا تھا کہ جب اُن سے اچھے شعر کی تعریف پوچھی گئی تو کہا۔

وان اشعر بیت انت قائلہ — بیت یقال اذا انشدتہ صدقا

"سب سے اچھا شعر وہ ہے کہ جب پڑھا جائے تو سننے والے بول اُٹھیں [illegible]"

قوت تخییل بھی بقدر مناسب استعمال ہوتی تھی بلکہ جدت خیال

کبھی کبھی حقیقت سے بھی دور ہو جاتی تھی مگر ایسی جدت معیوب تھی۔ نابغہ نے عمدہ شعر کی تعریف میں جو کہا تھا اُس کا نظامی نے یوں ترجمہ کیا ہے۔

در شعر مپیچ و در فن او　　چوں اکذب اوست احسن او

یہ بھی ایک آزادی خیال کی دلیل ہے ورنہ قضیۂ شعریہ کے متعلق بھی بیان ہو چکا ہے کہ جدت تخییل سے کیا کیا فائدے ہوتے ہیں۔ اس قوم کے عشق و حسن کے افسانے بھی بالکل نیچرل ہیں اور اُس کے عنوان اظہار بھی سراسر موافق فطرت ہیں۔ بنی امیہ کے دَور میں سلطنت قائم ہوئی تو آزادی خیال پر دوسرے تمدن کا اثر پڑا۔ جس زمانے میں جھوٹی حدیثیں بنانا آسان ہوں اگر شعر بھی جھوٹی مدح سرائیوں کے کام میں آنے لگا ہو تو مستبعد نہیں۔ خلفائے عباسیہ کے دور میں تو کچھ ایسا ہوا کہ فن شعر پرانی روش سے بالکل جدا ہو گیا۔ سلاطین و وزرا کو خوش کرنا اور انعامات و جائزات حاصل کرنا شاعروں کا پیشہ ہو گیا۔ یہ زمانہ خالی محاکات یا سچی تعریفوں کو کہاں پسند کر سکتا تھا۔ قوت تخییل نے غلبہ حاصل کیا۔ جدت طرازیاں اور رنگ آمیزیاں ہونے لگیں۔ ہر شاعر یہ چاہتا تھا کہ کوئی نیا مضمون باندھے تاکہ زیادہ انعام ملے۔ غرض کہ اس عہد (مستشعر؟) میں نازک خیالی اور مضمون آفرینی کا دور ہو گیا اور متنبی اور ابوالعلا معری وغیرہ کا رنگ پھیل گیا۔

عجم میں تقلید عرب

ایرانیوں میں جو علمی رنگ عربوں کا اچھی طرح پھیلنے لگا وہ اسی زمانے کا رنگ تھا۔ یہ رنگ زیادہ تر خطابت کا تھا جو شعر کے رنگ پر غالب تھا سامعین کو محظوظ و متاثر کرنا شاعروں کا فرض تھا ورنہ حقیقت میں

یہ فرض خطیب کا ہے کہ اپنے لکچر کے اثر سے سننے والوں کو متاثر کرے نہ شاعر محض واردات قلبی کا بیان کرنے والا ہے۔ گویا اپنے شعر کا مخاطب صحیح خود ہی ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آنچہ از دل خیزد بر دل ریزد۔

اختلاف مذاہب

اسی سلسلے میں عرب کی مذہبی تاریخ پر بھی نظر رکھنا چاہیئے۔ اصولی اختلافات نے مسلمانوں کو تین فرقوں پر منقسم کر دیا تھا۔ سنی۔ شیعہ خارجی۔ پھر ہر شعبہ میں فروعی اختلافات ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر گروہ کئی کئی گروہوں پر منقسم ہو گیا۔ ہمیں اس مقام پر بخوف طول اس تاریخ کو ترک کرنا پڑتا ہے اگرچہ عجم کی انشاپردازی اور انشاپروری پر اختلاف مذاہب کا بھی خاص اثر ہوا ہے اور مختصراً اتنا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت وقت کی عنایت جس فرقے پر ہوئی یا پبلک کا انہماک جس رنگ کی طرف ہوا اُس قسم کی انشا میں خاص قوت پیدا ہو گئی خصوصاً علم کلام کے اختلافات نے خیالات عوام پر جو اثر ڈالا اُس کا نتیجہ انشا میں بالخصوص نظر آتا ہے۔ عدلیہ۔ جبریہ۔ مفوضہ۔ غلاۃ۔ قدریہ نے اپنے اپنے خیالات پھیلانے کے لئے کبھی نثر کو ذریعہ قرار دیا کبھی قصیدہ شعریہ سے مدد لی۔ انھیں ہنگاموں میں ایک گروہ صوفیوں کا ظاہر ہوا جس کا اثر فارسی کی نثر و نظم پر بلکہ مذہب پر بھی کافی طور سے طاری ہوا ہے۔

تصوف

تصوف کا لفظ بظاہر صوف سے مشتق ہے جسکے معنے ہیں بالوں کا کپڑا۔ اور چونکہ بیشتر حضرات صوفیہ لباس صوف پہنتے تھے اسر[illegible] صوفی کہلاتے تھے۔ فارسی زبان میں ان لوگوں کو "پشمینہ [illegible]" بھی کہتے ہیں جس سے اس اشتقاق کی تصدیق ہوتی ہے ور[illegible] نے "صفا" (صفائے قلب) سے بھی مشتق کیا ہے اور ان لوگوں کا

کہا ہے اور بعض نے یونانی لفظ "سفاس" سے اسکا اشتقاق کیا ہے۔ اس فرقے کی ابتدا اُس مخالفت سے بتائی گئی ہے جو دنیوی تلذذ اور عیش سے زہاد و قوم میں پیدا ہو جاتی ہے اور لباس صوف سے اس امر کا اظہار کیا جاتا ہے کہ ان لوگوں کو دنیوی لذتوں سے کوئی سروکار نہیں۔ جس زمانے میں فارسی لٹریچر کی بعد اسلام ابتدا ہونے والی تھی اُس وقت تک حسن بصری، سفیان ثوری، فضیل بن عیاض، ابراہیم ادہم، رابعہ عدویہ وغیرہ گذر چکے تھے جو اس فرقے کے سلف صالح کہلاتے ہیں۔ ان لوگوں کا اعتقاد تھا کہ خدا فاعل مطلق ہے اور خیر و شر محض اُن اعتبارات کے نام ہیں جو انسانوں نے قائم کئے ہیں۔ رفتہ رفتہ وحدت حقیقی کا پرتو ان لوگوں کو نظر آیا اور "ہمہ اوست" کا اعتقاد راسخ ہوا۔ انکے اقطاب و اوتاد وغیرہ کے حالات پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وحدت الوجود کے ساتھ بے ثباتی عالم پر وثوق بلکہ وجود اشیا کو موہوم سمجھکر اُن سے کنارہ کشی۔ ریاضتہائے شاقہ میں عمر بسر کرنا اور فنا ہو کر بقا حاصل کرنا اس فرقے کے خصوصیات میں سے تھا اور جن انشا پردازوں پر اس رنگ کا اثر پڑا ہے انکے اقوال سے فلسفۂ اخلاق اور الٰہیات کے عجیب عجیب مسائل حل ہوئے ہیں جن کا ذکر مناسب مقاموں پر آئے گا۔ حسن مطلق سے عشق انکا شعار تھا اور مجاز کو حقیقت کا زینہ سمجھتے تھے۔ توحید باری سے مراد انکے نزدیک محض نفی شرک نہیں بلکہ ماسوی اللہ کو بے حقیقت سمجھتا ہے اور حقیقت محض اُسی کی "ذات واحد" ہے۔ بعض کا خیال یہ ہے کہ چونکہ خدا ایک خزانۂ مخفی تھا اور (بموافق الفاظ حدیث قدسی) اُس نے محض اپنی معرفت کے لئے خلق کو پیدا کیا

لہذا اسی معرفت کے لئے اضداد کو ظہور میں لایا۔ ظلمت اس لئے کہ نور ممتاز ہو۔ شر اس لئے کہ خیر کی معرفت ہو۔ مرض کی غرض یہ ہے کہ صحت کی برکت کا احساس ہو ورنہ ذات بحت ان تمام امور سے بلند تر ہے البتہ ہر فرد ماسوی اللہ کی کسی نہ کسی اسم الٰہی کا مظہر ہے۔

اب بخوف طول تشریح ترک کی جاتی ہے اور یہ مضمون اتنے تبصرے پر ختم کیا جاتا ہے کہ تصوف میں اہل عجم کو امتیاز خاص حاصل ہوا اور انھیں کے تصانیف عربیہ وفارسیہ سے خیالات وحالات صوفیہ اہل اسلام میں پھیلے۔
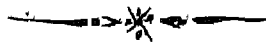
باب چہارم

طاہریہ و صفاریہ

مامون رشید کا زمانہ

جنگ قادسیہ سے مامون الرشید کے عہد تک تقریباً دو سو برس کا زمانہ گذرتا ہے۔ اس اثنا میں عجم پر علوم عرب کا کیا اثر ہوا اس کی تفصیل کے لئے اُن مصنفات علمیہ کو دیکھنا چاہئے جو اہل عجم کے قلم سے عربی زبان میں لکھے گئے کیونکہ نئی روشنی نے اس زمانے کے لوگوں کو ایسے عالم انوار میں پہونچا دیا جہاں قبل اسلام کی زبان اور خیالات کا رنگ بالکل ماند ہو گیا تھا۔ بڑے بڑے آئمہ حدیث و لغت و فلسفہ و فقہ و اصول یہی ایرانی لوگ تھے اور نشر علوم اسلامیہ و اصلاح معارف علمیہ میں جس قدر کوشش ایرانیوں کے دست و قلم سے ہوئی اُس کا اندازہ تاریخ اسلام کے پڑھنے ہی سے ہو سکتا ہے۔ فارسی زبان میں لکھنے پڑھنے کا آغاز مامون رشید کے عہد میں معلوم ہوتا ہے اور مرو کا ایک شاعر ابو العباس اس قابل نظر آتا ہے جس کا نام ابتدا میں لیا جائے کیونکہ اس نے مامون رشید کی تعریف میں ایک قصیدہ کہا تھا جس کے آخری اشعار میں فارسی کا پہلا شاعر ہونے کا دعوےٰ کیا ہے۔

ابو العباس مروزی

ای رسانیده به دولت فرق خود بر فرقدین
گسترانیده به فضل و جود در عالم یدین

---

۱ صاحب مجمع الفصحا نے اس سے قبل بہرام اور ابو حفص سعدی کا بھی ذکر کیا ہے

مرخلافت را تو شائستہ چو مردم دیدہ را
دین یزداں را تو بائستہ چو رخ را ہر دو عین

. . . .

کس بدیں منوال پیش از من چنیں شعرے نگفت
مر زبان پارسی را ہست با ایں نوع بین
لیک ازاں گفتم من ایں مدحت ترا در ایں لغت
گیرد از مدح و ثنائے حضرت تو زیب و زین

ان اشعار سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اگرچہ بحر عرب سے حاصل کی گئی ہے مگر نفاست طبع نے ارکان افاعیل کو اسی قالب میں ڈھالا ہے جو فارسی کے لئے موزوں ہیں اور ترقی کے معنے بھی یہی ہیں جیسا کہ سکاکی نے بحور عروضی کے گننے کے بعد کہا ہے :۔

"ترقی بآواز بلند پکار رہی ہے۔ کہ وہ طبع سلیم سے کہ جو چاہے ان پر بڑھائے یہاں سلامتی طبع کے سوا کسی کی حکومت نہیں ہے"

ہم آگے بڑھ کے دیکھیں گے کہ شعرائے عجم نے نہ صرف بعض زحافات کو زبان فارسی کی شاعری کے لئے مخصوص کیا بلکہ نئی نئی بحریں او[ر] نئے نئے اقسام شعر بھی پیدا کئے ورنہ عرب سے صرف قصیدہ گوئی ملی تھی [illegible] شعرائے عجم بھی قصیدہ گوئی پر اکتفا کرتے نظر آتے ہیں اور [illegible] سلاطین ہیں۔

اسی بادشاہ کے عہد میں جب تیسری صدی کا آغاز [illegible] خلافت کے سپہ سالار طاہر ذوالیمینین کو خراسان کی [illegible] ملی۔ طاہر کو خود مختاری کا دعویٰ نہ تھا مگر سطوت و اقتدار سے

اور اسکے خاندان کو مثل خود مختار حکمرانوں کے بنا دیا تھا۔ یہ خاندان عربی نژاد تھا لیکن دربار کی زینت کے لئے شعرا کا ہونا بھی لازم تھا اس لئے بعض شاعر پیدا ہو گئے:۔

حنظلہ بادغیسی غالباً پہلا شخص ہے جس نے باقاعدہ شاعری اختیار کی۔ صاحب چہار مقالہ نے اسے صاحب دیوان کہا ہے۔ چند اشعار یہ ہیں:۔

یارم سپند گرچہ بر آتش ہمی فگند — از بہر چشم تا نرسد مر ورا گزند
او را سپند و مجمرہ ناید ہمی بکار — با روی ہمچو آتش و با خال چون سپند

اسی حنظلہ کے دو شعر چہار مقالہ میں درج ہیں جنھیں پڑھ کے احمد خجستانی حکومت کے شوق میں اپنے گدھے بیچ کے نکل کھڑا ہوا اور رفتہ رفتہ بیہق و خواف و نیشاپور پر قابض ہو گیا۔ وہ کہتا تھا کہ اگر دیوان حنظلہ نہ پڑھتا تو یہ حکومت نہ ملتی (پروفیسر براؤن کا قیاس ہے کہ سامانیوں کے زمانے میں فارسی اشعار زبان زد خاص و عام تھے۔ اگرچہ اس زمانے کے شعرا کے نام نہیں ملتے نہ کلام ملتا ہے) سال وفات حنظلہ کا ۲۱۹ھ ہے۔

محمود وراق ۲۲۱ھ میں فوت ہوا۔ محمد بن طاہر کا درباری تھا۔ دو شعر اسکے نقل کئے گئے ہیں:۔

نگارینا بہ نقد جانت ندہم — گرانی در بہا ارزانت ندہم
گرفتستم بجان دامان وصلت — نہم جان از کفت و دامانت ندہم

ان اشعار میں غزل گوئی کی ابتدا نظر آتی ہے۔ عرب یا قصیدہ میں عاشقانہ اشعار کہتے تھے۔ شاید اسی ٹکڑے کو

جدا کر لیا ہے اور بعد کے شعرا نے اُس کا غزل نام رکھ کے ایک علیحدہ صنف نظم کی قرار دیدی ہے۔ محمود کا مذاق شعر بھی ایرانی رنگ میں آگیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ عرب سے کوئی سروکار نہیں۔

(۱) **فیروز مشرقی** ۔یمنی الاصل تھا ۲۸۳ھ میں وفات پائی۔ چند شعر منقول ہیں :۔

مرغیست خدنگ او عجب دیدی	مرغیکه شکار را و ہمہ جانا
دادہ پر خویش کرگسش ہدیہ	تا بچہ اش را برد بہ مہمانا

ولہ

سرو سیمیں ترا درمشک تر — زلف مشکیں تو سرتا پا گرفت

صفاریہ

خاندان طاہریہ کے آخری حکمراں محمد بن طاہر کو ۲۵۹ھ میں یعقوب بن لیث صفار نے گرفتار کر کے اس خاندان کا خاتمہ کیا اور خراسان و فارس پر صفاری خاندان کی حکومت ہوئی ۲۶۵ھ میں یعقوب کا انتقال ہوا اور اُس کا بھائی عمرو بن لیث جانشین ہوا پھر اس کا پوتا طاہر بن محمد چند روز کی حکمرانی کے بعد آل سامان کے ہاتھوں گرفتار ہوا اور اسی ۲۹۰ھ میں اس خاندان کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اس چند روزہ خاندان کے عہد حکومت میں چند شعرا پیدا ہوئے جن میں **ابو سلیک گورگانی** قابل ذکر ہے۔ کہتا ہے :۔

بہ مژہ دل ز من بدزدیدی	ای بلب قاضی و بمژہ نگار
مزد خواہی کہ دل ز من ببری	ای شگفتا اگر دیدہ و زر [illegible]

دیکھو فارسی مذاق کی چھیڑ چھاڑ [illegible] ہے کہیں شگفتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اکثر [illegible]

عیش کے متوالے انھیں گاتے تھے اور جی بہلاتے تھے۔ مگر ان چٹکلوں سے حقیقی شاعری کا قائم ہونا دشوار رہے۔

رباعی کا آغاز

صفاری خاندان کی یادگار عالم شعر میں آجتک باقی ہے جسے رباعی کہتے ہیں۔ یعقوب کا ایک کمسن بچہ دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ شرط یہ تھی ایک گڑھے میں اخروٹ تاک تاک کے ڈالے جائیں۔ اس بچے نے جو اخروٹ پھینکا تو گڑھے میں نہ گیا۔ اداس ہو گیا اتفاقاً وہ اخروٹ لڑھکتا ہوا الٹا پلٹ آیا اور گڑھے میں گر گیا۔ بچہ فرط جوش میں کہنے لگا "غلطاں غلطاں ہمی رود تا لب گو" باپ کو یہ کلام موزوں پسند آیا۔ شعرا سے کہا کہ اسکی تقطیع کرو۔ اس وقت تک اس بحر میں شعر نہیں کہے گئے تھے۔ تقطیع میں دشواری ہوئی۔ بعد جد و جہد بحر ہزج میں تقطیع ہو گئی۔ پھر تین مصرعے لگا کر رنگ زمانہ کے موافق دوبیتی بنالی۔ مدتوں یہی صنف دوبیتی کہلائی تھی پھر رباعی نام ہو گیا۔ کیا معلوم تھا کہ یہ معمولی ابتدا عمر خیام اور سحابی کے سے رباعی گو پیدا کریگی جو فارسی شعر کے لئے مایۂ ناز ہو جائیں گے!

رباعی کا آغاز

صفاری خاندان کی یادگار

باب پنجم

سامانیہ

نہ کس بود چو آل سامان بکور — دائم بہ امارت خراسان مشہور
بود اسمعیلے و احمدے و نصرے — دو نوح و دو عبد الملک و دو منصور
(عنصری)

خود مختار ریاستیں

تیسری صدی کے وسط میں خلافت عباسیہ کا آفتاب ڈھلنے لگا۔ مامون کی علم دوستی نے جس قدر شہرت و عزت اس خاندان کے لئے تاریخی دنیا میں پیدا کر دی تھی اُس کا عکس متوکل کی متعصبانہ رفتار نے دکھلا دیا۔ نہ وہ علوم و فنون کا دور دورہ رہا نہ وہ عظمت و سطوت کا شہرہ۔ طاہر نے خاندان مامون کا قائم کیا تھا۔ یعقوب صفار نے متوکل کی بدنظمی سلطنت سے فائدہ اُٹھا کر طاہریوں کو مٹایا اور رفتہ رفتہ بلخ۔ طخارستان۔ سندھ۔ نیشاپور۔ فارس۔ طبرستان۔ رامہرمز اور اہواز پر قبضہ کر لیا اور صفاریوں کی حکومت قائم کی۔ اسی زمانے میں حسن بن زید علوی نے طبرستان میں (علویوں) کی سلطنت قائم کی اور اس خاندان کے حکمرانوں نے علوم و فنون کے نشر میں فراخدلی سے کام لیا۔ اہل افریقہ نے ایک انقلاب پھیلانے کی کوشش کی اور بعدہ وہ واسط میں طوفان عظیم برپا کیا۔ اسی طرح اور بھی اسباب پیش آنے لگے جو زوال سطوت کا پیش خیمہ بن سکتے ہیں۔

آل سامان کا آغاز

مامون الرشید کا جب ہرو میں قیام تھا تو ایک شخص اسد بن سامان دربار میں حاضر ہوا تھا جو کھرا ایرانی تھا اور بہرام چوبین کی نسل میں سمجھا جاتا تھا۔ مامون کی مرحمت سے اس کے چاروں بیٹوں کو مختلف بلاد کی حکومتیں ملیں۔ نوح کو سمرقند ملا۔ احمد کو فرغانہ۔ یحییٰ کو شاش اور الیاس کو ہرات۔ نوح کے بعد اس کا بیٹا احمد حاکم سمرقند ہوا۔ لیکن چند روز کے بعد اپنے بیٹے نصر کو قائمقام کر کے خود گوشہ نشین ہو گیا سنہ ۲۶۱ھ میں معتضد باللہ نے اُسے ماوراء النہر کی حکومت دی۔ اس نے اپنی طرف سے اسمٰعیل کو بخارا کا حاکم مقرر کیا۔ فتنہ اندازوں نے دونوں بھائیوں کو لڑوا دیا اور نصر گرفتار ہو کے اسمٰعیل کے سامنے آیا مگر اسمٰعیل نے باوجود فتح دست بستہ معذرت کی اور نصر کا ماتحت رہا۔ اُسکے انتقال کے بعد سنہ ۲۷۹ھ میں اسمٰعیل کو سمرقند کی بھی حکومت ملی۔

آل سامان کی حکومت

اسی تاریخ سے آل سامان کی حکومت کا آغاز ہوا اور اسمٰعیل سامانیوں کا پہلا حکمراں قرار پایا۔ اسی نے صفاریوں کا بھی خاتمہ کیا یہانتک سنہ ۲۹۵ھ میں انتقال کر گیا۔ اسمٰعیل کے بعد احمد بن اسمٰعیل جانشین ہوا اُس کے بعد نصر بن احمد تخت نشین ہوا۔ رودکی اسی کی خوان دولت کا پروردہ ہے جو آدم الشعرا کہلاتا ہے۔ سنہ ۳۳۱ھ میں نصر نے وفات پائی اور اُسکا بیٹا نوح وارث تخت ہوا۔ یہ بھی مربی علوم و فنون تھا۔ خلفائے عباسیہ کے زمانے میں یونانی فلسفہ کا ترجمہ خوب ہو چکا لیکن بعض باتیں مبہم رہ گئی تھیں۔ نوح نے ابو نصر فارابی کو حکم دیا کہ سب ترجموں کو سامنے رکھ کے ایک جامع اور معتبر ترجمہ تیار کرے۔ چنانچہ تعمیل حکم کی گئی اور کتاب کا نام تعلیم الثانی رکھا گیا جسکی وجہ سے ابو نصر فارابی کا لقب بھی معلم ثانی

ہوگیا۔ کہتے ہیں کہ دفتروں کی زبان بھی اسی وقت سے فارسی ہوگئی نوح کا انتقال ۳۴۳ھ میں ہوا اسکے بعد عبد الملک اور عبد الملک کے بعد منصور بن نوح تخت نشین ہوا جسکے وزیر نے تاریخ طبری کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ اس کی وفات کے بعد نوح ثانی وارث حکومت ہوا۔ دقیقی اسی کے دربار کا شاعر ہے۔ نوح ثانی کے بعد منصور ثانی پھر عبد الملک ثانی ہوا پھر اسمعیل بن عبد الملک فرمانروا ہوا جو اس خاندان کا آخری حکمراں تھا۔ ۳۹۵ھ میں یہ خاندان تقریباً ایک سو دس برس حکومت کرکے ختم ہوگیا۔

آلِ زیار — آل سامان کے زمانے میں ایک بات یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ طبرستان کا علاقہ ان سے جدا تھا جو نصر ثانی کے زمانے تک حسن بن علی اطروش کے قبضہ میں رہا۔ پھر مرداویج بن زیار نے اس صوبے پر قبضہ کرکے خاندان زیاریہ کو قائم کیا جنکی علمی تربیت آل سامان کے ساتھ ساتھ جاری رہی خصوصاً شمس المعالی امیر قابوس بن وشمگیر کے زمانے میں بڑے بڑے اساتذہ فن کی تربیت ہوئی۔ بالآخر سامانیوں کی طرح یہ خاندان بھی غزنویوں کے ہاتھوں ختم ہوا۔ آل بویہ کی تربیت کی ابتدا بھی مرداویج کی ذات سے وابستہ ہے جن کا ذکر آیندہ آئے گا۔

بنی فاطمہ — تاریخی تعلقات قائم رکھنے کے لئے یہ بھی قابل ذکر ہے کہ مصر کے خلفائے بنی فاطمہ کی حکومت سامانیوں ہی کے زمانے میں قائم ہوئی

قرامطہ — اور قرامطہ کا ظہور بھی اسی عصر میں ہوا جنکے اذکار سے تاریخ عرب بھری پڑی ہے۔ یہ فرقہ ابتدا میں شیعوں کا ہم خیال تھا مگر رفتہ رفتہ جادۂ اسلام سے بہت دور ہوگیا۔ فردوسی کو تعریضاً سلطان محمود نے اسی فرقے سے منسوب

آل بویہ

کیا تھا حالانکہ یہ انتساب بالکل بے بنیاد تھا۔ اسی عہد میں آل بویہ ترقی
کی معراج پر پہونچ گئے جو بہرام گور کی نسل میں تھے اور منصب امیر الامرائی
پر فائض ہو کے تمام کاروبار خلافت کے مالک بن گئے تھے اور دیلمیوں
اور گیلانیوں کی مدد سے بویہ کے تینوں بیٹے عماد الدولہ۔ رکن الدولہ
اور معز الدولہ کا قبضہ اصفہان۔ نوبندجان۔ کازرون۔ شیراز اور
کرمان وغیرہ پر ہو گیا تھا حقیقت یہ ہے کہ علمی اعتبار سے یہ انقلابات نہایت
مفید ثابت ہوئے۔ ہر خاندان اپنے اپنے مقام پر تربیت اہل علم میں
مصروف تھا۔ اور اساطین حکما و علما و مورخین و شعرا وغیرہ کا ظہور
اسی زمانے میں ہوا۔ اگر تاریخ انشائے عرب لکھنے کا موقع ہوتا تو معلوم
ہوتا کہ متنبی سا شاعر۔ ابن زکریا سا طبیب۔ طبری سا مورخ اور
شیعہ اور سنیوں کے کامل فقیہ و محدث وغیرہ اسی عہد میں گزرے۔
منصور حلاج کا ظہور بھی اسی عصر میں ہوا جس نے تصوف کی روح
بلاد اسلام میں پھونک دی لیکن انشائے عجم کا تعلق چونکہ آل سامان
سے ہے لہذا اب اصل مقصود کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔

ترجمۂ تاریخ طبری

فارسی نثر کی پہلی کتاب منصور[1] بن نوح نے اپنے وزیر سے لکھوائی
یعنی تاریخ طبری کا فارسی ترجمہ۔ اس کی خوبی کے متعلق شمس العلما[2]
آزاد دہلوی لکھتے ہیں کہ تم نے پڑھے طوطے اور بولتی مینا کو دیکھا ہے
جب تک پنجرے میں ہوتے ہیں سکھی ہوئی بولیاں بولتے ہیں۔ جب پنجرے
سے چھوٹ جاتے ہیں تو درختوں پر جاتے ہی اپنا جنگلا بولنے لگتے ہیں۔

---

[1] وفات ۳۶۶ھ۔ [2] تعجب ہے کہ بعض اقتباسات اصل کے ترجمے نہیں ہیں اور بعض اقتباسات ترجمہ کے تاریخ طبری میں موجود نہیں۔

اُس وقت کے تعلیم یافتہ کچھ ایرانی نسلوں سے تھے کچھ عربوں کی نسل سے خلط ملط تھے۔ کئی سو برس کے بعد جو بیکھی سکھائی زبان چھوڑ کر اپنے عزیز بزرگوں کی بولی بولنے اور لکھنے کا موقع پایا تو طبعی آوازیں کھل نکلنے لگیں۔ اُن کا قدیمی انداز تم ابھی سن چکے ہو۔ اب اگرچہ تین سو برس کی مدت نے محاورہ کو بہت توڑا ہے۔ پھر بھی تازہ تصنیفوں میں دیکھو وہی چھوٹے چھوٹے فقرے اصلی مطلب کو ادا کرتے ہیں۔ سادی عبارتیں استعارہ۔ تشبیہ اور مبالغہ کی رنگ آمیزی سے پاک ہیں۔ مرادف فقرہ یا مرادف لفظ کا نام نہیں۔ جو ہیں مطلب کی باتیں ہیں" اسکے بعد ابو علی محمد بن محمد البلعمی کی ترجمہ تاریخ طبری کا اقتباس کیا ہے اور بالمقابل آجکل کی رائج فارسی لکھی ہے تاکہ فرق معلوم ہو سکے۔ مثلاً

حال افریدون

پس جہاں بہ افریدون درست شد۔ و کاوہ بر مال و خزینہ کہ حاصل کردہ بود تمام بروے سپرد و لشکر برداشت دگر و جہاں برآمد و ہمہ جہاں از مخالف و از ظالم پاک کرد و ہر کجا حرب کردے آں علم پیش داشتے۔ فیروز یافتے

حال افریدون

پس سلطنت بر افریدون مسلم شد و کاوہ مال و خزینہ کہ حاصل کردہ بود ہمہ را بوے سپرد۔ پس لشکر برداشت و عالمے را تسخیر نمود و جہاں را از دشمن و ظالم پاک کرد و ہر جا کہ جنگ میکرد ہماں علم خود را پیش خود می داشت و فیروزی می یافت۔

اِس ترجمے کو غور سے دیکھا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ بیشتر مقامات پر جملوں کی ترکیبیں اور حروف و افعال کا استعمال بالکل عربی ہے

کہیں کہیں خالص فارسی کی بھی چاشنی ہے۔ اگر چہ نظمیں نہایت ڈھیلی ڈھالی ہیں۔ عالمِ طفولیت سے عہدِ شباب کے زمانے میں انشا کا رنگ بدلنے لگا۔

شعرائے عصر

شعرائے عصر کی تعداد سینکڑوں تک پہونچتی ہے مگر مشہور نام یہ ہیں۔ ابوالعباس۔ ابوالمثل۔ ابواسحٰق جوئباری۔ خبازی نیشاپوری۔ ابوالحسن کسائی۔ شہید بلخی۔ ابوعبداللہ فراوی۔ رودکی۔ دقیقی۔ رابعہ قزداری۔ معمر جرجانی۔ ابوالمظفر نصر بن محمد نیشاپوری وغیرہ جن میں سے ابوعبداللہ فراوی اور شہید بلخی کو شاید اقدمیت کا شرف حاصل ہے۔ رودکی نے شہید کا مرثیہ بھی کہا ہے:-

کاروانِ شہید رفت از پیش	وانِ ما رفتہ گیر و می اندیش
از شمار دو چشم یکتن کم	وز شمار خرد ہزاراں بیش

رابعہ

رابعہ کے نام نے اس عہد میں ایک خصوصیت اور ظاہر کی وہ یہ کہ عورتیں بھی شعر کا مذاق رکھتی تھیں۔ اس کا باپ کعب اعراب میں سے تھا۔ خود عجم میں پیدا ہوئی تھی۔ نہایت حسین اور صاحبِ فضل و کمال تھی۔ بکتاش نامی غلام سے اسے الفت تھی۔ مجازی عالت جب گذری تو حقیقت کا مرتبہ آیا اور صوفیہ میں شمار ہونے لگا مگر اسلامی جماعت میں عورت کا اجنبی مرد سے محبت کرنا معیوب تھا لہذا لوگوں نے رابعہ کو قتل کر ڈالا۔ مولانا شبلی نے یہ دو شعر منتخب فرمائے ہیں:-

دعوتِ من بر تو آں شد ایزدت عاشق کناد
بر یکے سنگیں دلے نامہرباں چوں خویشتن

تا بدانی در رہ عشق و داغ ہجر و غم کشی
چوں بہ ہجر اندر رسیدی پس بدانی قدر من

مریوں کی فصل چھوڑ کر اپنے ابتدائی دور تغزل کا اور یہ سوز و گداز ! واقعی سچی جلی آواز ہیں کچھ تو اثر ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔

رودکی — گذشتہ تین سو رودکی اس دور کا مشہور شاعر ہے اور تمام تذکرہ نویس متفق ہیں کہ پہلا دیوان میں اسی نے مرتب کیا یہی وجہ ہے کہ کوئی اسے مقدم الشعراء کہتا ہے کوئی آدم الشعراء۔ پورا نام و نسب اس کا ابو عبداللہ جعفر بن محمد بن حاکم بن عبدالرحمن بن آدم ہے اور ابوالفضل البلعمی کا خیال ہے کہ عرب و عجم میں اس سے بہتر شاعر نہیں ہوا۔ عنصری کہتا ہے کہ رودکی کی طرح میری غزل نہیں ہوتی۔ تخلص کی وجہ یا تو یہ ہے کہ رودک[1] کا رہنے والا تھا یا رود[2] خوب بجاتا تھا۔ بچپنے سے نابینا تھا لیکن علم و عقل میں شہرت حاصل کر لی تھی موسیقی میں بھی کمال تھا اور آواز میں بھی سوز و گداز تھا۔ آخر قسمت نے یاوری کی اور امیر نصر سامانی کا ندیم ہو گیا اور اسی کے حکم سے کلیلہ و دمنہ[3] کو فارسی میں نظم کیا جسکے صلے میں چالیس ہزار درہم ملے۔ افسوس کہ یہ کتاب اب نہیں ملتی ورنہ رودکی کی واقعہ نگاری پر تنقید نہایت

---

[1] ایک گاؤں کا نام جو نخشب میں ہے اور نخشب کو نسف بھی کہتے ہیں۔
[2] باجے کا نام۔ [3] یہ کتاب اصل میں سنسکرت میں ہے۔ اور پنچ تنتر نام ہے۔ ساسانیوں کے زمانے میں اس کا فارسی میں ترجمہ ہوا۔ پھر عبداللہ بن المقفع نے عربی میں ترجمہ کیا۔ رودکی کا ترجمہ ابن المقفع کی عربی سے ہے۔ دوسری طرف عبرانی و سریانی میں اس کے ترجمے ہوئے۔ پھر ان ترجموں کے ترجمے لاطینی میں ہوئے جس سے مختلف زبانوں میں یورپ کی ترجمے ہو گئے۔ پلپیز فیبلس انگریزی میں اس کا نام ہے۔

کہیں کہیں نا ہو سکتی عنصری نے اس کا ذکر کیا ہے :—
مال طفولیت زردم رودکی زمہتر خویش عطا گرفت بہ نظم کلیلہ در کشور
شعرا سے بہ امیر نصر بادغیس میں آیا جہاں کی آب و ہوا انہیں پسند آئی کہ
برس ابوالعباس مقیم رہا۔ آخر اُمرا و اہل فوج عاجز آ گئے اور چاہا کہ وطن واپس
پہنچنا چاہیں۔ رودکی سے کہا کہ پانچ ہزار اشرفیاں دینگے اگر امیر کو یہاں سے
لے چلو۔ رودکی نے منظور کر لیا اور امیر کے سامنے یہ اشعار گائے :—

بوے جوے مولیاں آید ہمی یاد یار مہرباں آید ہمی
ریگ آموی[1] و درشتیہای آں زیر پایم پرنیاں آید ہمی
آب جیحوں با ہمہ پہناوری خنگ ما را تامیاں آید ہمی
ای بخارا شاد باش و شادزی شاہ سویت میہماں آید ہمی
شاہ سرو است و بخارا بوستاں سرو سوے بوستاں آید ہمی
شاہ ماہ است و بخارا آسماں ماہ سوے آسماں آید ہمی

نصر کی نظروں میں وطن کا نقشہ پھر گیا اور ایسا خوش ہوا کہ موزے تک
نہ پہنے اور گھوڑے پر سوار ہو کر چل کھڑا ہوا یہاں تک کہ ایک منزل پر جا کے
دم لیا۔ یہ ہے حقیقی شاعری کا اثر۔ اندھا شاعر اُتنا ہی کہتا ہے جتنا احساس
ہوتا ہے۔ اپنے وطن کی تہر مولیاں کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ صرف خوشبو پر
اکتفا کی ہے۔ وطن کی مصیبتوں کو کتنا آسان سمجھتا ہے کہ دریا کی ریت
اُسے ریشم معلوم ہوتی ہے۔ دولت شاہ وغیرہ کے زمانے میں مذاق
اتنا بدل گیا تھا کہ ان اشعار کے مؤثر ہونے پر اُسے تعجب ہے لیکن اس زمانے
کے لوگ سمجھ سکتے ہیں کہ جدید نیچرل نظموں سے یہ نظم کچھ کم نہیں۔ صاحب

---

[1] دریائے جیحوں

چہار مقالہ کی خوش مذاقی دیکھو کہ لکھا ہے:-
"ہنوز این قصیدہ را کسے جواب نگفتہ است کہ مجال آں ندیدہ اند کہ ازیں مضائق بیروں روند"

رودکی کی پُرگوئی کا یہ حال تھا کہ رشید سمرقندی نے اس کے اشعار کی تعداد ایک لاکھ بتائی ہے۔ شاعری کا دائرہ بھی اچھا خاصہ وسیع تھا۔ مولانا شبلی فرماتے ہیں کہ "واقعہ نگاری۔ خیال بندی۔ موعظت و نصیحت۔ عشق و محبت۔ مدح و ثنا۔ صنائع و بدائع۔ سب چیزیں پائی جاتی ہیں اور درجہ کمال پر پائی جاتی ہیں"[1] نمونے ملاحظہ ہوں:-

(۱) اخلاق و موعظت۔

زمانہ پندے آزادہ وار داد مرا — زمانہ را چو نکو بنگری ہمہ پند است
بروز نیک کساں گفت غم مخور زنہار — بسا کسا کہ بروزِ تو آرزو مند است

زمانے نے ایک مرتبہ احرار کی شان سے مجھے نصیحت کی۔ اگر غور سے دیکھو تو سارا زمانہ نصیحت ہی نصیحت ہے (ذرا اس خیال کا زور دیکھو اور ابتدائی شاعری کو دیکھو!) اس نے کہا کہ دوسروں کی خوش حالی پر حسد نہ کر کیونکہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو چاہتے ہیں کہ تیری حالت تک پہونچ جائیں۔

(۲) عمر خیام کا فلسفہ یاد کرو اور رودکی کے یہ شعر دیکھو:-

شاد زی با سیاہ چشماں شاد — کہ جہاں نیست جز فسانہ و باد
ز آمدہ شادماں نباید بود — وز گذشتہ نکرد باید یاد

---

[1] تفصیل کے لئے شعر العجم جلد اول ملاحظہ ہو۔

باد و ابر است این جہان افسوس   بادہ پیش آر ہر چہ بادا باد

اللہ رے سادگی ادا اور بے تکلفی اور یہ فلسفیانہ مضمون!

(۳) مدحیہ رنگ میں قوت تخیل دیکھو:-

شاہے کہ بروز رزم از رادی   زرین نہد بہ تیر در پیکان

تا کشتۂ او ازاں کفن سازد   تا خستۂ او ازاں کند درمان

(۴) واقعہ نگاری کا نمونہ بادغیس کے واقعے میں درج ہوا۔

(۵) مرثیہ کا نمونہ شہید بلخی کے حال میں لکھا جا چکا۔

(۶) غزل نے مستقل صورت اختیار نہیں کی تھی قصیدے کی تشبیب میں یا عاشقانہ رنگ کے اشعار اس کا نمونہ ہو سکتے ہیں۔ عنصری نے اس صنف میں رودکی کے کمال کا اعتراف کیا ہے جیسا کہ مذکور ہوا

(۷) قصیدہ گوئی کے حدود ایسے قائم کئے کہ آج تک اضافہ نہ ہو سکا۔ تشبیب۔ تخلص۔ مدح۔ خاتمہ کے مقامات قابل دیکھنے کے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ الفاظ میں جزالت و متانت اور معانی میں قوت تخیل کامل طور سے نظر آتی ہے۔ ایک تشبیب ملاحظہ ہو:-

بیاراں می کہ پنداری روان یاقوت ناب ستی   و یا چون بر کشیدہ تیغ اندر آفتاب ستی

بپاکی گوئی اندر جام مانند گلاب ستی   بخوشی گوئی اندر دیدۂ بیخواب خواب ستی

سحاب ستی قدح گوئی و می قطرۂ سحاب ستی   طرب گوئی کہ اندر دل دعای مستجاب ستی

اگر می نیستی یکسر ہمہ دلہا خراب ستی   اگر در کالبد جان را ندیدستی شراب ستی

ظہوری کے ساقی نامہ میں پیچ در پیچ تخیل نے سادگی ادا کو مٹا دیا

سلہ متوسطین و متاخرین نے اس تلفظ کو ترک کر دیا تھا قاآنی وغیرہ نے پھر اختیار کیا ہے۔

پڑھانا پڑھا اچھا کہ سیدھی سادی بندش ہیں خدا جانے کیا کیا کہہ گیا۔ رودکی نے رباعیاں اور قطعے بھی کہے ہیں اور اچھے کہے ہیں۔ ایک قطعہ ملاحظہ ہو :-

نگارینا شنیدستم کہ گاہِ محنت و راحت ٭ سہ پیراہن سلب بودست یوسف را بعمر اندر
یکے از کید شد پرخوں دوم شد چاک از تہمت ٭ سوم یعقوب را از بوی رو شن کرد چشم تر
رخم مانند آں اول دلم ماند بدان دوم ٭ نصیب من شود در وصل آں پیراہن دیگر

دقیقی

دقیقی۔ ابومنصور محمد بن احمد بلخی (یا سمرقندی) سامانیوں کے آخری دور کی یادگار ہے۔ امیر ابوالمظفر محتاج چغانی کی ذات سے اس کی ابتدائی تربیت ہوئی پھر نوح بن منصور سامانی نے اپنے دربار میں بلایا اور شاہنامہ تصنیف کرنے کا حکم دیا۔ کوئی کہتا ہے کہ بیس ہزار شعر نظم کر ڈالے۔ کوئی کہتا ہے صرف ایک ہزار شعر نظم کر چکا تھا کہ محبوب ترکی غلام کے ہاتھ سے زندگی کا خاتمہ ہوگیا۔ مجمع الفصحا میں یہ واقعہ سنہ ۳۷۱ھ کا بتایا گیا ہے۔ بعض روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آخر عہد میں امیر نصر بن ناصر الدین سبکتگین کے دربار میں بھی شرفیاب ہوا اور بعضوں نے اسے بھی شعرائے دربار محمود غزنوی میں شمار کیا ہے لیکن صحیح ترین روایت یہی معلوم ہوتی ہے کہ نوح بن منصور سامانی کے دربار کا شاعر تھا۔ مولانا آزاد دہلوی کا ان ہزار شعروں کے بارے میں خیال ہے کہ اسکے "کلام میں بیان ماجرا کا سلسلہ کہیں درہم برہم اور کہیں بیچ میں سے کترا ہوا ہے۔ جس بات کی تفصیل کو جی ڈھونڈھتا ہے۔ اُسے گول مول کر جاتا ہے۔ جو معمولی بات ہے اُسے تفصیل دیتا ہے۔ اکثر جگہ پہلے مصرعہ میں داستان کا مطلب کہتا ہے۔ دوسرے مصرعے میں آگے کا مطلب نہیں ہوتا۔ فضول الفاظ سے بھرتی کرکے قافیہ کا فرض ادا کر دیتا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی اُسے فردوسی سے پست ضرور

سمجھتے ہیں مگر "رتبۂ کلام" کو مانتے ہیں اور معرکہ آرائی کے سماں کا نمونہ یہ پیش کرتے ہیں تاکہ تقابل کا اہلِ نظر کو موقع مل جائے:۔

ز بس بانگ اسپان و جوش و خروش — ہمی نالۂ کوس نشنیدہ گوش
درفشانِ بسیار برافراشتہ — سر نیزہ ہا ز ابر بگذاشتہ
چو رستہ درخت از برِ کوہسار — چو بیشۂ نیستاں بوقت بہار
ز تاریکیٔ گرد و بانگ سپاہ — کسے روز روشن ندیدے براہ
بگردند یک تیر باراں نخست — بسانِ تگرگ بہاراں درست
بپوشیدہ شد چشمۂ آفتاب — ز پیکانہاے درخشاں چو آب
تو گفتی ہوا ابر آرد ہمی — وزاں ابر الماس بارد ہمی

ایک مرتبہ فردوسی نے دقیقی کو خواب میں دیکھا تھا کہ وہ اپنے گشتاسب و ارجاسب کی لڑائی کے بھی ہزار اشعار شاہنامہ میں داخل کرنے کی فرمائش کرتا ہے۔ فردوسی شاہنامہ میں کہتا ہے:۔

چو زیں تخم و اشتم نزد سپاس — مرا در دل آمد ز ہر سو ہراس
کہ روزے مرا ہم بباید گذشت — ز گفتار او در نشاید گذشت

غرض یہ اشعار نقل کئے۔ اسکے بعد شاعرانہ تعلّی کا جوش ہوا۔ ختم کرکے کہتا ہے:۔

دو گوہر نمودم بہ گوہر فروش — کنوں شاہ دارد بگفتار گوش
سخن چوں بدیں گونہ بایدت گفت — مگوی و مکن رنج با طبع جفت
چو طبعت نباشد چو آب رواں — مبر دست زی نامۂ خسرواں

[1] مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ دقیقی پہلا شخص ہے جس نے فارسی کو عربی

---

[1] یعنے اپنے اور دقیقی کے اشعار۔

کی آمیزش سے پاک کرکے مستقل زبان کی حیثیت قائم کی ہے۔ کچھ چیدہ اشعار نقل کرکے فرمایا ہے کہ ان اشعار میں جابجا فک اضافت اور الف اشباع ہے جو آج بھی متروک و معیوب ہے۔ دقیقی نے مثنوی کے ساتھ قصیدہ اور غزل کو بھی ترقی دی۔ اس نے بعض مسلسل غزلیں بھی لکھی ہیں اور یہ اس زمانے کے اعتبار سے بالکل نئی بات ہے!... آجکل جس چیز کو لوگ نیچرل شاعری کہتے ہیں فارسی میں غالباً سب سے پہلے اسی نے بنیاد قائم کی ہے[1]

سحرگاہاں کہ باد نرم جنبد | بجنباند درخت سرخ و اصفر
تو پنداری کہ از گردون ستارہ | ہمی بارد بہ سبز دیبای اخضر
نگار اندر نگار و لون در لون | ہزاراں در رشتہ بکر بیکر

ایک مسلسل غزل بہار کی رنگینی اور مے و معشوق پر لکھی ہے۔

برافگند ای صنم ابر بہشتی | زمین را خلعت اردیبہشتی
زمین بر سان خون آلودہ دیبا | ہوا بر سان نیل اندودہ وشتی
بدان ماند کہ گوئی از مے و مشک | مثال دوست بر صحرا نوشتی

x x x x x x x x

دقیقی چار خصلت برگزیدست | بگیتی از ہمہ خوبی و زشتی
لب یاقوت رنگ و نالۂ چنگ | مے خون رنگ و کیش زردہشتی"

تعجب ہے کہ اس آخری مصرعے سے لولدیکے، ہارن اور ایتھے وغیرہ نے قیاس کیا ہے کہ دقیقی مذہب زرتشت کا ماننے والا تھا۔ حالانکہ یہ محض ایشیائی شاعری ہے اور دقیقی نے اتنی بات پسند کی ہے کہ یہ مذہب شراب پینے کو منع نہیں کرتا۔ پروفیسر براؤن اس نکتے کو سمجھ گئے اور

---

[1] کیونکہ رودکی کے اشعار نیچرل شاعری کی بہترین مثال ہیں۔
— حسینی

اُسے پکّا مسلمان کہتے ہیں مجمع الفصحا وغیرہ میں اسکے وعظیہ و مدحیہ اشعار بھی درج ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر صنف میں کچھ نہ کچھ کہتا ضرور ہے۔

منجیک

اسی عصر کے اور شعرا ہیں جن کا کلام کم ملتا ہے مثلاً منجیک جو امرائے چغانیہ کا مداح تھا۔ صاحب مجمع الفصحا نے اسکے اشعار ملوک صفاریہ سیستان کی تعریف میں بھی نقل کئے ہیں۔ اسی طرح منطقی رازی کے اشعار درج ہیں

منطقی

جو دیلمیوں کے وزیر صاحب بن عباد کا مداح تھا۔ پروفیسر براؤن کا خیال ہے کہ اسے حسن تعلیل وغیرہ کا بہت شوق تھا اور اسے دربار عراق کا اثر سمجھا ہے جہاں شاعری میں اُتنی ترقی نہیں ہوئی تھی جتنی آل سامان کے دربار میں پائی جاتی تھی۔ ابو عبداللہ محمد جنیدی بھی صاحب ابن عباد کے شعرا میں سے تھا۔ امیر قابوس کے دربار میں نہایت اچھے اچھے شاعر تھے۔ بعضے غزنویوں کے عہد میں بہت مشہور ہوئے جنکا ذکر آیندہ باب میں آئے گا اور بعضے سامانیوں کے عہد میں ختم ہو گئے۔

جنیدی

خاتمۂ باب میں اُن امرا و ملوک کا ذکر کرنا ضروری ہے جنھوں نے علاوہ انشا پروری کے خود بھی انشا پردازی کی ہے خصوصاً ابو ابراہیم اسمعیل سامانی جسکے بعض اشعار سے اندازہ ہو گا کہ ان لوگوں کی ہمتیں کتنی بلند تھیں اور زبانیں کیسی شستہ تھیں۔

اسمعیل سامانی

گویند مرا چو زادہ‌ای خوب بسازی — منزل بکن آراستہ و فرش ملون
با نعرۂ گرداں چہ کنم لحن اغانی — با بوئیہ اسپاں چہ کنم مجلس گلشن
اسپ است و سلاح است مرا بزمگہ و کاخ — تیر است و سناں است مرا لالہ و سوسن
جوشِ مَی و نوشِ لبِ ساقی بچہ کار است — جوشیدن خون باید بر عیبہ و جوشن

منصور ثانی سامانی بھی شاعر تھا اور اچھا شاعر تھا۔ معاصرین میں امیر قابوس بن وشمگیر کی علم دوستی نے البیرونی سا مورخ اور بو علی سینا

قابوس

سا حکیم پیدا کر دیا۔ عربی و فارسی کے کئی رسالے اسکی تصنیف سے ہیں خصوصاً کمال البلاغہ اور سیر الملوک اسی کے قلم سے نکلے ہیں۔ یہ امیر خوش تدبیر خاندان قارن سے تھا جسے عرب کے مورخ اہل البیوتات کہتے ہیں اور سلسلہ نسب قباد پسر نوشیروان عادل سے ملتا تھا فلسفہ و نجوم و ہیئت کے علاوہ فن فصاحت و بلاغت کو خوب جانتا تھا۔ ایک رسالہ اسطرلاب پر بھی اس نے لکھا تھا۔ افسوس یہ کا ظالم و بدخو تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ منوچہر کے ہاتھوں مارا گیا۔ حکیم سنائی نے اسی وجہ سے کہا ہے :۔

نفقہ خواں لیک در جہنم جاہ — ہیچو قابوس دستگیر مباش

قابوس کی شاعری کا انداز ذیل کے اشعار سے معلوم ہو سکتا ہے :۔

کار جہاں سراسر آز ست یا نیاز — من پیش دل نیارم آز و نیاز را
من ہشت چیز را ز جہاں برگزیدہ ام — تا ہم بداں گذارم عمر دراز را
میدان و گوی و بارگہ و رزم و بزم را — اسپ و سلاح و جود و دعا و نماز را

ولہ

گل شاہ نشاط آمد و مے مہر طرب — زانروی بدیں دو میکنم عیش طلب
خواہی کہ دریں بدانی ای ماہ سبب — گل رنگ رخت دارد و مے رنگ دو لب

اس عہد کی ترقیوں کا خلاصہ یہ ہے کہ فارسی نثر میں کتابیں تصنیف ہونے لگیں جن کی زبان پرانی تھی اور طرز ادا سادی۔ نظم میں قصیدہ باضابطہ طور سے جاری ہوگیا اور اتنا لطیف تھا کہ بایدو شاید۔ رباعی کا آغاز ہوگیا مگر کوئی کامل شاعر

اس صنف میں نہیں ہوا۔ مثنوی بھی دقیقی نے شروع کر دی۔
قطعات کا سلسلہ تو پہلے ہی قائم تھا وہ اور بھی پر لطف ہو گیا۔
غزل البتہ معرض خفا میں رہی۔ علوم و فنون کی کتابیں اب بھی
عربی میں کثرت سے لکھی جاتی تھیں اگرچہ لکھنے والے بیشتر
عجمی الاصل ہوتے تھے جن کی تفصیل تاریخ انشائے عرب سے
تعلق رکھتی ہے۔

———>✻<———
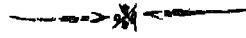
اس کتاب کو میں نے تفصیل کے ساتھ پڑھا ہے۔ بہت مفید ثابت ہوئی
Mohammad
27/04/04

باب ششم

غزنویہ

سلاطین غزنویہ کا عہد اگرچہ زیادہ دیرپا نہیں ہے مگر فارسی لٹریچر
الپتگین — کی روح رواں ہے۔ عبدالملک بن نوح سامانی کا ایک غلام الپتگین
نام ترقی کرکے خراسان کا گورنر ہوگیا۔ منصور بن عبدالملک کے عہد حکومت
میں وہ غزنین چلا گیا اور سولہ برس حکومت کرکے وہیں فوت ہوگیا۔ پھر
ابواسحٰق بن الپتگین وارث ہوا لیکن چند روز کے بعد مر گیا۔ الپتگین کا ایک
سبکتگین — غلام سبکتگین تھا جس کی قابلیت کے اعتراف کی وجہ سے جمہور نے
اسے غزنین کا حاکم مقرر کیا۔ یہی خاندان غزنویہ کا موسس ہے جیپال
کو ہندوستان میں اسی نے بار بار شکست دی اور سامانی دربار سے
ناصر الدین کا خطاب پایا۔ اسکی وفات کے بعد اس کا بیٹا اسمعیل
محمود — جو الپتگین کا نواسا تھا بلخ میں تخت نشین ہوا۔ محمود اس وقت غزنین میں
تھا۔ اس نے بھائی کو لکھا کہ آپ بلخ کی حکومت کیجئے اور مجھے غزنین کا
حاکم رہنے دیجئے۔ مگر اسمعیل نے نہ مانا۔ لڑائی چھڑی تو اسمعیل نے
شکست کھائی اور محمود کی بادشاہی مسلم ہوگئی۔ اسے سامانی دربار سے
سیف الدولہ کا خطاب مل چکا تھا۔ فتوحات ہندوستان وغیرہ کے
بعد اثر اچھا خاصہ ہوگیا اور دربار خلافت سے یمین الدولہ ولی
امیر المومنین لقب ملا۔

معاصرین — اسکی ہمعصر سلطنتوں کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ جن میں سے ہر ایک

قدردانی علم وکمال کے لیئے یکتا تھی ۔ آلِ بویہ بغداد میں نہایت شان سے بسر کر رہے تھے اور اہلِ علم زبانِ عرب میں بیش بہا تصانیف ان کے فیض سے لکھ رہے تھے ۔ فارسی شعرا بھی بقدرِ ضرورت موجود تھے ۔ منطقی اور خسروی سرخسی کے نام اسی دربار سے وابستہ ہیں ۔ سادات حسنی اور اُن کے بعد زیاریوں کی حکومت طبرستان میں تھی ۔ خصوصاً امیر قابوس بن وشمگیر کی علمی قابلیت اور قدردانی تاریخ انشا کا ایک مستقل جزو ہو گئی ہے ۔ مامونی امرائے خوارزم ایک طرف اہلِ علم کے لئے منازلِ ترقی بنا رہے تھے ۔ حکیم ابوعلی سینا جو ارسطوئے مشرق تھا اسی دربار میں پناہ گزین ہوا ۔ ابوریحان بیرونی ۔ ابونصر عراق ۔ حکیم ابوسہل مسیحی ۔ ابوالحسن خمار طبیب ۔ یہ سب خوارزم شاہیوں کے خوانِ کرم کے زلہ رُبا تھے ۔

محمود کے فتوحات

(سلطان محمود نے جب ملک گیری شروع کی تو ہندوستان کی طرح سامانیوں اور زیاریوں کے ملک بھی تسخیر کر لئے اور ان درباروں کے بیشتر کاملینِ فن مجبوراً غزنین کے دربار میں آ گئے ۔ محمود کی حکومت بخارا و سمرقند سے گجرات و قنوج تک ہو گئی ۔ افغانستان ۔ ماوراءالنہر ۔ خراسان ۔ طبرستان ۔ سیستان ۔ کشمیر اور بیشتر بلادِ ہندوستان اسکے زیرِ نگین تھے ۔ امرائے اسلام میں یہ پہلا امیر ہے جس نے سلطان کا لقب اختیار کیا اور ظل اللہ فی ارضہ اپنے کو لکھوانا شروع کیا ورنہ اس وقت تک "امیر" "اسپہبد" وغیرہ اُن امرائے اسلام کے لقب تھے جو خلافتِ عباسیہ کو بزرگ مان کے حکومت کرتے تھے ۔ محمود کا پورا نام مع القاب وغیرہ یوں تھا :۔

"الامیر السعید الملک المؤید یمین الدولہ و امین الملۃ ابوالقاسم محمود بن ناصر الدین ابی منصور سبکتگین ملک الشرق بجنبیہ و ظل اللہ فی ارضہ")

محمود کی علمی حالت

بہ نصیبہ و سلطان جس طرح صاحب سیف تھا اُسی طرح صاحب قلم بھی تھا۔ جواہر مضئیہ میں اس کا فقہائے اہل سنت میں شمار ہے۔ کہتے ہیں کہ فقہ میں اس نے ایک مبسوط کتاب لکھی تھی۔ غزنین میں ایک یونیورسٹی اور ایک کتب خانہ اور ایک عجائب خانہ اسی نے قائم کر دیا تھا جنکا مثال عالم میں بمشکل سے ملتا تھا۔ چند اشعار بھی کہے ہیں منجملہ اُنکے یہ قطعہ ہے

زتخت را گرفتم از سر سطوت — خون من ریختی و عذرت ہست
زانکہ ہنگام برگشودن شر طمت — گوی سبحان گرفتن اندر دست

محمود کی اخلاقی حالت

محمود کی اخلاقی حالت کی مورخین نے نہایت تعریف کی ہے۔ ہاں! ہر شخص میں کچھ کمزوریاں بھی ہوتی ہیں اور محمود ان سے خالی نہ تھا۔ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ دولت کی طمع بہت تھی اور جہاں کہیں دولت کا نام سن پاتا تھا کچھ نہ کچھ وصولیابی وہاں سے ضرور کر لیتا تھا۔ مثلاً لکھا ہے کہ ایک شخص نیشاپور میں بہت دولتمند تھا۔ محمود نے سن پایا تو اُسے غزنین بلا کے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ تو قرمطی ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ میں قرمطی نہیں ہوں بلکہ میرے پاس دولت ہے۔ بادشاہ اُس میں سے جس قدر چاہے قبول کرلے اور یہ لقب میرے نام سے ہٹا دے۔ محمود نے روپیہ لے لیا اور اُسے سند دیدی کہ قرمطی نہیں ہے۔ پروفیسر براؤن نے لکھا ہے کہ وہ اہل علم کو گھیر کے کسی نہ کسی طرح اپنے دربار میں ضرور لاتا تھا چنانچہ جب اسے معلوم ہوا کہ مامون خوارزمشاہ کے یہاں بڑے بڑے کملا کا مجمع ہے خصوصاً بوعلی سینا سا کامل حکیم اور طبیب موجود ہے۔ اس نے کہلا بھیجا کہ سب کو فی الفور حاضر دربار کرو۔ محمود کی سطوت ایسی تھی کہ یہ چھوٹے چھوٹے بادشاہ اُس کے حکم سے سرتابی کرسکتے۔ ابوریحان

بوعلی سینا

بیرونی اور خمار اور عراق غزنین کو چلے گئے مگر بوعلی سینا اور مسیحی نے انکار کر دیا اور خوارزم شاہ کے یہاں سے بھاگ گئے۔ مسیحی کی جان بادِ سموم کے نذر ہو گئی۔ بوعلی سینا بھاگتا ہوا امیر قابوس کے یہاں گیا جہاں اُس کی بڑی قدر و منزلت کی گئی پھر علاء الدولہ محمد کے یہاں گیا اور وزیر ہو گیا آخر سنہ ۴۲۷ھ میں انتقال کر گیا۔

ابوریحان بیرونی

۷ ابوریحان بیرونی ایک کامل منجم اور مورخ تھا جو خوارزم شاہی حکومت کے یہاں سے حسب الطلب سیاہ غزنین میں آ گیا تھا۔ سلطان محمود[1] نے امتحاناً کہا کہ اپنے نجوم کے ذریعے سے بتلاؤ کہ میں اس عمارت کے باہر کس دروازے سے جاؤنگا۔ اُس نے اس کا جواب لکھ کے رکھ دیا۔ محمود دیوار توڑ کے باہر نکلا اور جواب کا کاغذ پڑھا تو یہی لکھا تھا کہ بادشاہ کسی دروازے سے نہ جائے گا بلکہ دیوار توڑوا کر باہر جائے گا۔ محمود کھسیانا ہوا اور حکم دیا کہ ابوریحان کو کوٹھے کے نیچے پھینکدیں۔ جب وہ گرایا گیا تو اتفاقاً ایک مسہری کے پردے پر گرا اور زندہ بچ گیا۔ جب سلطان محمود کے سامنے پیش کیا گیا تو اُس نے اپنی نوٹ بک نکالی اور یہ پیشین گوئی بھی دکھائی جو پوری اُتری تھی۔ اب بادشاہ کا غصہ اور بڑھ گیا اور غریب ابوریحان کو قید کر دیا۔ چھ ماہ کے بعد وزیر نے سفارش کی اور کہا کہ اے بادشاہ آج سوائے بوعلی سینا کے اس حکیم کا مثل روئے زمین پر نہیں ہے۔ اب اس پر رحم کیجیے۔ دوسرے دن بادشاہ نے رہائی کا حکم دیا اور ایک ہزار دینار۔ ایک غلام۔ ایک کنیز اور ایک خلعت عطا کیا۔ پروفیسر براؤن نے لکھا ہے کہ فردوسی کے ساتھ بھی تشدد کیا

---

[1] چہار مقالہ۔

ایسی ہی مکافات کی گئی تھی اور ملا جامی نے بھی کہا ہے :۔

گذشت شوکتِ محمود و در فسانہ نماند   جز ایں قدر کہ ندانست قدرِ فردوسی

زوال غزنویہ

غرض سلطان محمود کا انتقال سنہ ۴۲۱ھ میں ہوا اور ۶۹ برس کی عمر پائی۔ حسب وصیت حکومت خراسان و عراق و جرجان و مضافات بڑے بیٹے مسعود کو ملی اور غزنین و کابل و ہند کا وارث چھوٹا بیٹا محمد ہوا مگر دونوں بھائیوں میں لڑائی ہوئی اور مسعود کو محمد نے قتل کیا۔ پھر مودود بن مسعود نے اپنے چچا محمد اور اس کے فرزند کو قتل کیا اور آل سبکتگین کے اقبال کو زوال آگیا۔ انہیں خانہ جنگیوں کے زمانے میں آل سلجوق نے خروج کیا اور خراسان و عراق پر قبضہ کرلیا۔

نثر

غزنویہ عہد میں نثر نے بہت زیادہ ترقی نہیں کی۔ ترجمہ تاریخ طبری اور قرابادین ابومنصور الموفق سامانیوں کے عہد میں لکھی جا چکی تھیں۔ ایک فارسی تفسیر قرآن مجید بھی سامانیوں کے عہد کی کیمبرج یونیورسٹی میں موجود ہے۔ عہد غزنویہ کے اضافوں میں دانش نامہ علائی حکیم بوعلی سینا کا لکھا ہوا۔ بہرامی کا خجستہ نامہ اور فرخی کا ترجمان البلاغہ ہے مگر یہ کتابیں اب نایاب ہیں۔ طبرستان کی زبان میں مرزبان نامہ لکھا گیا تھا مگر وہ بھی نہیں ملتا۔ کہتے ہیں کہ اسدی نے ایک فارسی کا لغت لکھا تھا اور صنائع و بدائع پر بھی ایک کتاب لکھی تھی۔ مصطلحات فارسی کو سلگمین نے چھاپ کے شائع کر دیا ہے اگر دیکھنے میں آتی تو ضرور کچھ اقتباس کیا جاتا۔ شیخ بوعلی سینا کی حکمت فارسیہ کا نمونہ پیش ہے اور مقابل میں مذاق حال کی فارسی درج ہے تاکہ موازنہ میں سہولت ہو :۔

فرمود تا کتابے در فارسی دری تصنیف کنم | فرمود تا کتابے تصنیف کنم بہ پارسی دری

نکلا مگر ڈاکوؤں نے سارا مال لوٹ لیا مجبوراً طلب علم کیطرف متوجہ ہوا اور خوب پڑھ لکھ گیا۔ اسی سلسلے میں شاعری کا بھی شوق ہوا اور وہی شوق اسکی ناموری اور ترقی کا باعث ہوا۔ محمود کے دس برس بعد ۴۳۱ھ میں وفات پائی اسکے اشعار کی تعداد ۳۰ ہزار بیان کی جاتی ہے مگر اب محض تین ہزار ملتے ہیں افسوس کہ اسکی مثنویاں وامق و عذرا، سرخ بت و خنگ وغیرہ نہیں ملتیں ورنہ موازنہ کا موقع خوب ہاتھ آتا۔ بدیہہ گوئی میں خاص مہارت تھی صاحب آتشکدہ لکھتے ہیں کہ ایک شب میں ایک مرتبہ ایک ہزار شعر کہہ ڈالے تھے۔ محمود نے ایک دن نشے کے عالم میں ایاز کی زلفیں کٹوا دیں۔ ہوش آیا تو رنجیدہ ہوا عنصری نے برجستہ کہا:—

گر عیب سر زلف بت از کاستن است   نہ جائے بہ غم نشستن و خاستن است

وقت طرب و شادی و مے خواستن است   کاراستن سرو ز پیراستن است

محمود خوش ہوگیا اور عنصری کا منہ جواہرات سے بھر دیا۔ شاعری پر تفصیلی ریویو شعر العجم میں موجود ہے خلاصہ اُس کا درج کیا جاتا ہے:—

(۱) قصیدہ گوئی میں متاخرین کو ناز ہے کہ گریز انکے یہاں جتنی نازک ہوتی ہے اسلاف کے یہاں نہیں ہوتی۔ ذرا انصاف سے یہ قصیدہ دیکھو:—

غنودستہ آں ماہ منور   خط و زلفیں آں مہروئے دلبر

یکے اسپغول نورستہ بالیں   یکے را لالہ خودروی بستر

یکے بے دو وصال و ماہ تیرہ   یکے بے نور روز و شب منور

مرا بہرہ دو چیز آمد بہ گیتی   دل پاک و زبانِ مدح گستر

یکے بر مہر جاناں وقف کردم   یکے بر مدح شاہنشاہ کشور

(۲) قصیدہ سے محض مدح سرائی کا کام نہیں لیا بلکہ واقعہ نگاری کا

بھی کام لیا ہے چنانچہ ایک قصیدے میں سلطان محمود کے فتوحات اور غزوات ۱۰۳ شعروں میں نظم کئے ہیں بعض اشعار یہ ہیں :-

شنیدہ خبر شاہ ہندوان جیپال   کہ بر سپہر بلندش ہمی بسود افسر

\+ + + + + + + + + + + +

خدایگان خراسان بدشت پیشاور   بہ حملہ ای بپراگند آن ہمہ لشکر

حکایت سفر مولتان ہمی دانی   وگر ندانی ثالج الفتوح پیش آور

اگر بہ دجلہ فریدون گذشت بے کشتی   بہ شاہنامہ بر آن ہر کجا ہست سمر

از آن سپس کہ درو وہم راہ نیابد باد   وزان سپس کہ بر آن باد را نبود عبر

بہ مولتان شد و در رہ دو نیمہ کرد   کہ ہر یکے را صد بندہ بود و چون خیبر

اسی طرح اور قصائد میں بھی واقعہ نگاری کی ہے۔

(۳) صنائع و بدائع کو بھی اسی حد تک باریاب ہونے دیا ہے جتنے آرائش کلام کے لئے ضروری ہیں۔ متاخرین کی طرح سے حسن کلام کو ان زیوروں سے لاد کے بھدا نہیں کر دیا :-

تضاد

کہ آن آراستہ زلفش زرہ گردد گہی چنبر
کہ آن پیراستہ جعدش ببارد مشک و گہ عنبر

تشبیہ ونیز ملیح

زمین چون تو شگفتہ گل ہمہ گلبن برنگ گل
ہمہ شمشادہا پر سنبل ہمہ بیجادہ پر شکر

تضاد و ترصیع
تجنیس

ز من طاعت و ز تو فرمان ز تو رزق و ز من احسان
ہمو درد و ہمو درمان ہمو فرزند و ہمو داور

تجنیس الصوت
حسن تکرار

سمن بوئے شبہ موئے بلا جوئے جفا گوئے
پری زادے پری روئے پری چہرے پری پیکر

یہ ہیں وہ داغ بیلیں جن پر سلمان ساوجی اور قاآنی نے اپنے کمالات کی عمارتیں قائم کی ہیں۔ سارا قصیدہ ایک ہی زور میں گیا ہے اور ایک شعر بھی کمزور نہیں ہے۔

(۴) مناظر قدرت کی تصویریں صفائی سے کھینچی ہیں:۔

ابر نوروزی ہمی در بار روئے گر شود — تا ز صنعش ہر درختی لعبتی دیگر شود

ہم وزن الفاظ

باغ ہمچون کلبۂ بزاز پر دیبا شود — باد ہمچون طبلۂ عطار پر عنبر شود

روی بستان را بپیچد حلۂ چینی شود — گوشوار ہر درختی رشتۂ گوہر شود

چون حجابی لعبتان خورشید را بینی کہ باز — گہ برون آید ز میغ و گہ بہ میغ اندر شود الخ

(۵) مضمون آفرینی بھی حد اعتدال میں ہے:۔

ز نور و ظلمت مانند میغ ابر ہمی — بہ در و مینا ماند سرشک ابر و گیا

فریفتہ است زمین ابر تیرہ را کہ ازو — ہمی ستاند در و ہمی دہد مینا

کتنا لطف ہے۔ مینہ کی بوندیں موتی ہیں۔ گھاس وغیرہ سبز شیشے۔ بادل زمین کے قریب میں آ گئے۔ موتی دے دے کے شیشے مول لے رہے ہیں۔

غزل ابھی تک ترقی پذیر نہیں ہوئی۔ ملاحظہ ہو:۔

مشکین شود چو باد بر زلف تو بگذرد — عاشق شود کسی کہ بر روی تو بنگرد

بر غالیہ بماند بر عارض تو باد — گاہش برو بمالد و گہ باز بسترد

سبزی کہ چینیانہ وار تنگ عنبر است — ہر شب بہ نزد چشم و بہ پیش تو کہ آورد

دارد ہزار حلقۂ مشکین پر شکن — ہر ساعتے بہ گرد گل تو کہ گسترد

چشم تو راست مایۂ نیرنگ و دلبری — نرگس ندیدہ ام کہ چنین رنگ دل برد

رباعیاں یادگاری ضرورتوں سے کہی ہیں یا عاشقانہ ہیں۔ مثلاً

تا در دو جہاں عدد انجم بود — تا خلق جہان و چرخ موجود بود

گر ملک بود بدست محمود بود — اقبال و ظفر نصیب مسعود بود

عاشقانہ رنگ یہ ہے :-

ای شب نہ کنی این ہمہ پرخاش کہ دوش	راز دل من چنان مکن فاش کہ دوش
دیدی چہ دراز بود دوشینہ شبم	ہاں ای شب وصل آنچنان باش کہ دوش

فرخی

فرخی۔ ابو الحسن علی بن قلوغ[1] سیستانی۔ ادب و موسیقی میں تعلیم پائی تھی اور چنگ خوب بجاتا تھا۔ ابتدا میں خلف بن احمد حاکم سیستان کے دربار میں رہا تضییق معاش نے مجبور کیا تو بلخ چلا گیا۔ ان دنوں یہاں کا امیر سلطان محمود کی طرف سے ابو المظفر چغانی تھا۔ دار الحکومت میں پہونچکے معلوم ہوا کہ امیر داغگاہ میں ہے لیکن اُس کا مختار کل عمید اسعد موجود ہے۔ عمید کے پاس گیا تو اُسکی نظروں میں نہ سمایا۔ سمجھا کوئی دیہاتی ہے۔ شاعری سے اسے کیا واسطہ۔ مگر تہذیباً وعدہ کر لیا کہ امیر کے دربار میں حاضر کر دونگا بشرطیکہ داغگاہ کی تعریف میں شعر کہہ لاؤ۔ نقشہ اُس کا بتا دیا کہ کوسوں کا میدان ہوتا ہے۔ سبزہ زار اور چشمے جا بجا نزہت افزائی کرتے ہیں گانا بجانا ہوتا ہے اور شراب کا دور چلتا ہے۔ امیر ایک ہاتھ میں پیالہ اور دوسرے میں کمند لیکے بیٹھتا ہے۔ شراب پیا جاتا ہے اور لوگوں کو گھوڑا انعام میں دیتا ہے۔ رات بھر میں فرخی نے قصیدہ کہا جسکے بعض اشعار یہ ہیں :-

چوں پرند نیلگوں بر روے پوشد مرغزار	پرنیان ہفت رنگ اندر سر آرد کوہسار
خاک را چوں ناف آہو مشک زاید بیقیاس	بید را چوں پر طوطی برگ روید بیشمار

+ + + + + + + +

داغگاہ شہریار اکنوں چناں خرم شود	کاندرو از خرمی خیرہ بماند روزگار
سبزہ اندر سبزہ بینی چوں سپہر اندر سپہر	خیمہ اندر خیمہ بینی چوں حصار اندر حصار

---

[1] براؤن نے جا مارغ لکھا ہے۔

هر کجا خیمه است خفته عاشقی با دوست مست   هر کجا سبزه است شادان یاری از دیدار یار

\+ \+ \+ \+ \+ \+ \+ \+ \+ \+

بر در پرده سرای خسرو پیروزبخت   از پئے داغ آتشے افروخته خورشید وار

داغها چون شاخهاے بسّد یاقوت رنگ   هر یکے چون ناردانه گشته اندر زیر نار

کودکان خواب نادیده مصاف اندر مصاف   مرکبان داغ ناکرده قطار اندر قطار

\+ \+ \+ \+ \+ \+ \+ \+ \+ \+

خسرو فرخ سیر بر باره دریا گذر   با کمند اندر میان دشت چون اسفندیار الخ

غرض قصیدے کو سن کے پھڑک گیا فی الفور ابو المظفر کے پاس لے کے پہونچا اور کہا کہ آج وہ شاعر لایا ہوں جس کا مثل دقیقی کے بعد سے آج تک پیدا نہیں ہوا ابو المظفر نے اُسے دربار میں جگہ دی۔ شراب کا دور چلا اور سرور کا عالم ہوا تو فرخی نے قصیدہ پڑھا۔ امیر بھی بیحد مسرور ہوا اور کہا کہ ہزار بچھیرے کمیت موجود ہیں جتنے چاہو پکڑ لو۔ فرخی بدمستی میں نہ پکڑ سکا اور تھک کر سو گیا۔ صبح کو جب ابو المظفر نے کیفیت سنی تو ہنسا اور اپنا اسپ خاصہ۔ ایک خیمہ۔ تین اونٹ۔ پانچ غلام اور کپڑے وغیرہ دئے پھر جب معلوم ہوا کہ فرخی نے جس گلّہ پر ہاتھ ڈالا تھا اُس میں بیالیس بچھیرے تھے تو وہ سب بھی عطا کر دئے۔ چند روز کے بعد بڑے ساز و سامان سے فرخی دربار سلطان محمود میں گیا حیثیت دیکھ کے فی الفور عزت افزائی ہوئی اور شعرائے خاص میں داخل کیا گیا۔ رفتہ رفتہ اتنا صاحب ثروت ہو گیا کہ بیس غلام زریں کمر ہمراہ رکاب چلتے تھے۔ سلطان محمود کے محبوب غلام ایاز سے بھی بڑی دوستی ہو گئی اور اُس کی تعریف میں بھی اشعار کہے ہیں۔ فرخی کا انتقال ۴۲۹ھ میں ہوا۔

صاحب مجمع الفصحا لکھتے ہیں "الحاصل حکیم فرخی را در شاعری طرزے   کلام برماے

مرغوب است و غزلیات شیرین عاشقانہ مسرت انگیز دارد و سخن وے
سہل ممتنع است و وے درمیان مدیح گویان زمانہ خود چنانست کہ سعدی
در غزل گویان" حقیقت بھی یہی ہے کہ فصاحت و سلاست خاص اس کا حصہ
ہے اور تر و ر طبیعت نے قصائد کو بیحد موثر بنا دیا ہے :-

برآمد نیلگوں ابرے ز روے نیلگوں دریا — چو رائے عاشقاں گرداں چو طبع بیدلاں شیدا

ببارید و زہم بگسست و گرداں گشت بر گردوں — چو پیلان پراگندہ میان آبگوں صحرا

تو گفتی گرد زنگارست بر مرآۃ چینی — تو گفتی موے سنجابست بر پیروزہ گوں دیبا

ہمی رفت از بر گردوں گہ تاریک گہ روشن — و زو گہ آسماں پیدا و گہ خورشید ناپیدا

بسان صندلی سوہاں زدہ بر لوح پیروزہ — بکردار عبیر بیختہ بر صفحہ مینا

ہوائے روشن اندر گمش متغیر گشت و شد تیرہ — چو جان دشمن آشفتہ ز تیغ خسرو والا

یمین دولت و دولت بدو پیراستہ گیتی — امین ملت و ملت بدو آراستہ دنیا

تو امیر دین پیغمبر ملک محمود دنیا پرور — ملک فعل و ملک سیرت ملک سہم و ملک سیما

طواف شاعراں دائم بگرد قصر تو دائم — ہما تا قصر تو کعبہ است و گرد قصر تو بطحا

یہ انتخاب فرخی کی جزالت و بلاغت کی کافی دلیل ہے صنائع و بدائع کا مناسب
استعمال۔ مناظر قدرت کا آئینہ۔ نوبنو۔ مدح ممدوح کی طرف نازک تخلیص
مبالغہ۔ اغراق تشبیہ و استعارہ کا لطف سب کچھ موجود ہے۔ واقعات
کی تصویر ابوالمظفر کی مدح میں گذر چکی ہے۔ اس صنعت خاص کی عمدہ
مثالیں اسکے قصائد میں متعدد ملتی ہیں بلکہ اس کا رنگ یہی ہے کہ غیر مادی
چیزوں کی بھی ایک خیالی تصویر پہلے دل میں کھینچ لیتا ہے پھر واقعہ نگاری
کے زور میں اسے بیان کرتا ہے تو خاص لطف پیدا ہوتا ہے۔ محفل
عیش کا رنگ دیکھئے :-

کئی عجم کی تاریخیں عربی میں ترجمہ ہو گئی تھیں[1] مثلاً:۔

تاریخ عجم	مترجمہ جبلہ بن سالم
سیر الملوک الفرس	؍؍ عبداللہ بن المقفع
؍؍	؍؍ زادویہ اصفہانی
؍؍	؍؍ محمد جہم برمکی
؍؍	؍؍ محمد بن بہرام اصفہانی
سکیران	؍؍ عبداللہ بن المقفع
تاریخ دولت ساسانی	؍؍ ہشام بن قاسم اصفہانی

فارسی میں کارنامۂ نوشیرواں۔ شہزادو پرویز۔ کارنامہ اردشیر بن بابک۔ بہرام و نرسی نامہ۔ مزدک نامہ وغیرہ کا بھی وجود تھا۔ اس کے علاوہ سلاطین ایران کے فرامین اور وصیت نامے بھی دستیاب ہو گئے تھے اسی وجہ سے طبری مسعودی ودینوری وغیرہ کو اپنے تاریخوں میں عجم کا حال لکھنا آسان ہو گیا تھا۔ دقیقی نے جب شاہنامہ لکھا تو سامانیوں کا کتب خانہ اُس کے استعمال میں تھا جسکے متعلق شیخ الرئیس کہتے تھے کہ اس سے بڑا اور عمدہ کتب خانہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ سامانیوں کے بعد محمود غزنوی کا اس کتب خانے پر قبضہ ہو جانا تعجب خیز نہیں ہے اور فردوسی کے لئے اتنا عمدہ سامان ملنا بھی مستبعد نہیں مگر وہ ان سے مدد لینے کا اقبال نہیں کرتا اور شاہنامہ کا ماخذ یوں بیان کرتا ہے:۔

یکے نامۂ بُد از گہ باستاں فراواں بدو اندراں داستاں
پراگندہ در دست ہر موبدے ازو بہرۂ بردہ ہر بخردے

[1] شعر العجم جلد اول۔

یکی پهلوان بود دهقان نژاد — دلیر و بزرگ و خردمند و راد
ز هر کشوری موبدی سالخورد — بیاورد و این نامه را گرد کرد
بپرسیدشان از نژاد کیان — وزان نامداران فرخ گوان
بگفتند پیشش یکایک مهان — سخنهای شاهان و گشت جهان
چو بشنید ازیشان سپهبد سخن — یکی نامور نامه افگند بن

یہ کتاب دو ہزار برس کی تصنیف تھی اور اسی پر شاہنامہ کے افسانوں کی اکثر بنیاد تھی۔ اسکے علاوہ اور ماخذ بھی ہیں جن کا حوالہ فردوسی برابر دے دیتا ہے مثلاً شغاد کی داستان کے متعلق لکھا ہے :-

یکی پیر بد نامش آزاد سرو — که با احمد سهل بودی بمرو
کجا نامهٔ خسروان داشتی — تن و پیکر پهلوان داشتی
به سام نریمان کشیدش نژاد — بسی داشتی رزم رستم بیاد
بگویم سخن آنچه زو یافتم — سخن را یک اندر دگر بافتم

اسی طرح بیژن اور طلحند وغیرہ کی داستانوں کے حوالے بھی ذکر کئے ہیں اور اگر کسی زمانے کی تاریخ نہیں ملی ہے تو صاف صاف لکھدیا ہے۔ مثلاً اشکانیوں کی طوائف الملوکی کا ذکر کرتا ہے :-

ازین گونه بگذشت سالی دویست — تو گفتی که اندر جهان شاه نیست
چو کوتاه شد شاخ و هم بیخ شان — نگوید جهاندیده تاریخ شان
ازیشان جز از نام نشنیده ام — نه در نامهٔ خسروان دیده ام

تاریخی ایمانداری کا اتنا خیال ہے کہ ہر واقعہ جتنا ملتا ہے اتنا ہی لکھتا ہے :-

گر از داستان یک سخن کم بدی — روان مرا جای ماتم بدی

شاہنامہ پڑھنے سے اندازہ ہو جائیگا کہ قدیم العہد واقعات میں اجمال ہے کیونکہ
صحیح تاریخ نہیں ملتی اور بعد کے واقعات تدریجاً مفصل ہوتے جاتے ہیں یہاں تک
کہ نوشیرواں وغیرہ کے جزوی احکام اور فرامین تک موجود ہیں۔ خود فردوسی
کی حیثیت پائے تخت کے مورخ کی ہے اسی وجہ سے ایرانیوں کا خاص
طور سے جنبہ دار ہے مگر اتنا سچا کہ بعض مقاموں پر ایرانیوں کے ظلم بھی
لکھ دئے ہیں چنانچہ رستم نے سیاوش کے خون کا انتقام جس طرح لیا ہے
اس کا نقشہ یوں کھینچا ہے :-

ہمہ غارت و کشتن اندر گرفت — ز تن بوم بر دست و بر سر گرفت
ز توران زمیں تا بہ سقلاب و روم — ندیدند یک مرز آباد و بوم
ہمہ سر بریدند برنا و پیر — زن و کودک خرد کردند اسیر

عربوں کا خاص طور سے مخالف نظر آتا ہے اور ایرانی نژاد اور پائے تخت کے
مورخ کے لئے یہ کیفیت سراسر فطری ہے۔ شاہنامہ ختم کرتے ہوئے یزدجرد کی
زبانی کہتا ہے :-

ز شیر شتر خوردن و سوسمار — عرب را بجائے رسید است کار
کہ ملک عجم را کنند آرزو — تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

اہل یورپ کی تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ شاہنامہ کی داستانیں اوستا،
یاتکار زریران۔ کارنامک ارتخشتر پاپکان۔ خدائی نامہ
وغیرہ سے مقابلہ کرنے پر مطابق پائی گئی ہیں۔ ہاں ایک شکایت ضرور ہے کہ
یونانی مورخین کے بیان سے یہ افسانے بالکل نہیں ملتے لیکن یہ عقدہ علامہ
ثعلبی نے یوں حل کیا ہے کہ ہمارے پاس ایران کی تاریخ کے متعلق دو ماخذ
ہیں۔ یونانی اور ایرانی۔ ہم جانتے ہیں کہ دونوں میں اختلاف ہے لیکن یہ مسلّم

مسئلہ ہے کہ گھر کا حال گھر والا خوب جانتا ہے اسلئے ہم نے یونانیوں کے مقابلے میں ایرانیوں کا زیادہ اعتبار کیا۔" بعض محققین کہتے کہ سیمرغ اور دیو سفید وغیرہ کے بے سر و پا افسانے درج ہونے کی وجہ سے یہ کتاب پایۂ اعتبار سے ساقط ہے مگر فردوسی کو وہی مجبوری ہے جو ہیرو ڈوتوس اور ثعالبی ایسے جلیل القدر مورخوں کو پیش آئی یعنے ان افسانوں کا قوم میں مشہور ہونا متقاضی تھا کہ ضرور نقل کر دیئے جائیں۔

شاہنامہ کے علمی فوائد

علاوہ تاریخ عجم ہونے کے شاہنامہ کی سلسل نظم سے مختلف زمانوں کے سیاسی اور تمدنی حالات خوب معلوم ہوتے ہیں اور قواعد معاشرت و عقائد مذہبی کی تصویریں اکثر ملتی ہیں کہیں معلوم ہوتا ہے کہ موبدوں کی رائے کے بغیر کوئی کام نہیں کیا جاتا تھا کہیں پتہ لگتا ہے کہ ایرانی لوگ ظالم کے خاندان میں حکومت باقی نہیں رکھتے تھے بعض مقامات پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بادشاہ تخت نشینی کے وقت کھڑے ہو کر تقریر کرتا تھا اور اپنے اصول حکومت ظاہر کر دیتا تھا۔ اسی طرح دربار میں بادشاہ کا مقام امرا و حجاب کے مقامات و فرائض وغیرہ وغیرہ سب ملتے ہیں۔ مولانا شبلی نے خوب فرمایا ہے کہ ان اعتبارات سے شاہنامہ ایران کا انسائکلوپیڈیا ہے۔

فردوسی کی وقعت

شاعری کی حیثیت سے فردوسی کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ "خدائے سخن" مانا گیا ہے کسی نے کہا ہے :۔

سکہ کاندر سخن فردوسی طوسی نشاند
کاندرم کہ ہیچکس از جملۂ فرسی نشاند
اول از بالائے کرسی بر زمیں آمد سخن
او دگر دستش گرفت و بر سر کرسی نشاند

ایک اور شاعر کا قول ہے :-

در شعر سہ تن پیمبرانند | ہر چند کہ لا نبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را | فردوسی و انوری و سعدی

لیکن **انوری** کہتا ہے :-

آفریں بر روانِ فردوسی | آں ہمایوں نژاد فرخندہ
آں نہ استاد بود و ما شاگرد | آں خداوند بود و ما بندہ

نظامی کا قول ہے :-

سخن گوے پیشینہ دانائے طوس | کہ آراست زلفِ سخن چوں عروس

سعدی کہتے ہیں :-

چہ خوش گفت فردوسیِ پاک زاد | کہ رحمت برآں تربتِ پاک باد

شاہنامہ کی عظمت

(علامہ ابن اثیر کہتے ہیں کہ "عربی زبان باوجود اس وسعت و کثرت الفاظ کے شاہنامہ کا جواب پیش نہیں کر سکتی اور در حقیقت یہ کتاب قرآن العجم ہے۔" غور سے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ شاہنامہ نے شعراء کے حوصلے پست کر دئے۔ ہر زمانے میں یہ کوشش رہی کہ اس کا جواب پیدا ہو مگر جو بات لاجواب ہو اُس کا جواب کیا؟)

دولت شاہ کہتا ہے کہ "اکابر و افاضل متفق اند × × × × × کہ دریں مدت روزگار اسلام مثل فردوسی از کتم عدم پاے بہ معمورۂ وجود ننہادہ والحق داد سخنوری و فصاحت دادہ و شاہد عدل بر صدق ایں دعوی کتاب شاہنامہ است کہ دریں پانصد سال گذشتہ از شاعران و فصیحان روزگار ہیچ آفریدہ را یارائے جواب شاہنامہ نبودہ۔" صاحب آتشکدہ کا بیان ہے کہ "دریں ہفت صد سال کسے از زمرۂ شعرا ابنامد

کہ راہ ہم چشمی او بسنجد ملکہ احدے نبودہ کہ سر از ربقۂ شاگردی او
اور آجکل صاحب مجمع الفصحاے ناصری نے لکھا ہے کہ "تا ایں عہد
شعرائے عجم در نظم پارسی کتابے مانند شاہنامہ و مثنوی مولوی در
عالم بیادگار نہ گذاشتہ اند" واہل البیت اعرف بما فی البیت۔ تعجب ہے
کہ پروفیسر براون کی نظر میں شاہنامہ کی شاعری سکندر نامہ سے پست
ہے حالانکہ مذاق سلیم کا حکم تقابل کے بعد یہی ہے کہ شاہنامہ کہیں بلند ہے
اور بقول مولانا شبلی دونوں میں قطرہ اور دریا کی نسبت ہے۔

شاہنامہ کے خصوصیات

تنقیدی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہنامہ نے فارسی زبان
میں روح پھونک دی ہے اور اس قابل بنا دیا ہے کہ یہ زبان دوسری
قوموں کی نظر میں باوقعت ہوسکے۔ بعض خصوصیات صوری و معنوی
حسب ذیل ہیں :-

(۱) شاہنامہ عربی زبان کی کشمکش سے بچنا چاہتا ہے۔ بہت بڑا
تغیر فارسی پر اسلام کے غلبے سے یہ ہوا تھا کہ عربی الفاظ زبان میں
بکثرت داخل ہوگئے تھے۔ رودکی وغیرہ کے کلام سے اتنا اندازہ ضرور ہوگیا
ہوگا کہ اسی وقت عربی اتنی خلط ملط ہوگئی تھی کہ زبان کی جزو مستقل معلوم
ہوتی تھی۔ دقیقی پہلا شخص ہے جس نے پرانی فارسی کے الفاظ واپس
لانے کی کوشش کی مگر کسی قدر آورد کے ساتھ۔ فردوسی نے فصاحت
زبان مروجہ کو باقی رکھتے ہوئے یہ خصوصیت برتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ
کبھی اپنی زبان کو دری کہتا ہے کبھی پہلوی کہتا ہے۔ اصطلاحات علمیہ
بھی حتی الوسع فارسی زبان کے لاتا ہے اور آمد کے ساتھ :-

از آغاز باید کہ دانی درست سرمایۂ گوہران از نخست
مادہ عناصر ازل

که یزداں ز ناچیز چیز آفرید | بداں تا توانائی آمد پدید
(لاشئی شئی — وجود)

وزو مایۂ گوہر آمد بچار | برآوردہ بے رنج و بے روزگار
(زمانہ)

نخستیں کہ آتش ز جنبش دمید | ز گرمیش پس خشکی آمد پدید
(حرکت — خاک)

وزاں پس ز آرام سردی نمود | ز سردی ہماں باز تری فزود الخ
(سکون — آب)

بوعلی سینا کی حکمت علائیہ سے موازنہ کروگے تو معلوم ہوگا کہ عربی کے تسلط کو اگر توڑا گیا ہے تو مطلب خبط ہوگیا ہے۔ فردوسی پر کسی کا تسلط نہیں۔ وہ خود زبان کا مالک ہے۔

(۳) محاکات کی خوبی یہ ہے کہ جزئیات بھی اگر تصویر پوری اتارنی ہو تو بیان کردیئے جاویں۔ شاہنامہ اگرچہ رزمیہ نظم ہے مگر اکثر مواقع پر زمانۂ قدیم کے رسم و رواج۔ اخلاق و عادات۔ سیاست و تمدن کا عمدہ نقشہ ہے۔ مثلاً اس زمانے کے رواسم تجہیز و تکفین کا ذکر نہایت خوبصورتی سے آگیا ہے۔ جہاں رستم نے اسفندیار کا تابوت روانہ کیا ہے:-

یکے نغز تابوت کرد آہنیں | بگسترد فرشے ز دیبائے چیں
وزاندود یک روی آہن بقیر | برآگند بر قیر مشک و عبیر
وزاں پس کہ پوشید روشن برش | ز پیروزہ بر سر نہاد افسرش

جنازہ اٹھایا جاتا ہے اور شہزادے کا جنازہ:-

چہل اشتر آورد رستم گزیں | زبالا فروہشتہ دیبای چیں
یکے اشترے زیر تابوت شاہ | چپ و راست اشتر پس اندر سپاہ
پشوتن ہمی رفت پیش سپاہ | بریدہ فش و دم اسپ سیاہ

بروبر نہادہ نگونسار زمیں   ز زین اندر آویختہ گرز کیں
ہمان نامور خود و خفتان ازوی   ہمان ترکش و مغفر جنگجوی

(۳) حسن و عشق کے بیان میں نہایت متین ہے۔ جامی و نظامی
کی طرح حد سے باہر نہیں ہوتا۔ اسی طرح بزم کے بیان میں بھی اعتدال
پسند ہے۔ یہ اسلام کی شجاعت و ملک گیری کے زمانے کا شاعر ہے۔
سوز و گداز۔ نالۂ و فریاد کی ادائیں کیا جانے۔ اسکے ہیرو بھی اسی
عنش کے ہیں۔ دل دیدینا اور بات ہے اور مٹ جانا اور بات سہراب
کے ایک حریف کے چہرے سے میدان جنگ میں جھلم ہٹ گئی۔ دیکھا کہ
ایک خوبصورت عورت ہے۔ یہ فریفتہ ہوگیا۔ وہ دھوکا دیکے نکل گئی۔
ہجر کا درد ہوا۔ نالوں کا وقت آیا مگر کیونکر:۔

ہمی گفت ازاں پس دریغا دریغ   کہ شد ماہ تابندہ در زیر میغ [ابر]
غریب آہوے آمدم در کمند [میری کمند میں آیا]   کہ از بند جست و مرا کرد بند
زہی چشم بندی [شعبدہ] کہ آں پرفسوں   بہ تیغم نخست [زخمی نہ کرو] و مرا ریخت خوں
ندانم چہ کرد آں فسونگر بمن   کہ تا گر مرا بست راہ سخن
بہ زاری مرا خود بباید گریست   کہ دلدار خود را ندانم کہ کیست

(۴) ایجاز و اختصار سے بھی کبھی کبھی علم بلاغت کی داد دیتا ہے۔
اور بتلاتا ہے کہ صاحب ذوق سلیم اختصار کے ذریعے سے کلام میں وہ
زور پیدا کرتا ہے جو تفصیل میں ممکن نہیں :۔

کنون جنگ سہراب و رستم شنو   دگرہا شنیدستی این ہم شنو

جنگ کی حالت میں ایک بار مشورے کی ضرورت ہوئی۔ لڑائی کو کہا

سرو ساقی و ماہ رو و نواز | پردہ بستہ ور رہ شہناز

زخمۂ رود زن نہ پست و نہ تیز | زلف ساقی نہ کوتہ و نہ دراز

مجلسے خوب خسروانی وار | از سخن چیں تہی و از غماز

بوستانے ز لالہ و سوسن | ہمچو روئے نگار و سینۂ باز

دوستانے مساعد و یکدل | کہ تواں گفت پیش ایشاں راز

ماہ روئے نشاندہ اندر پیش | خوش زبان و موافق و دمساز

جعد او بر پرند مشکی گیر | زلف او بر حریر چوگاں باز

بادۂ چوں گلاب روشن و تلخ | ماندہ در خم ز گاہِ آدم باز

از چنیں مجلس و چنیں بادہ | ہیچ زاہد مرا ندارد باز

مرثیہ گوئی میں اسے امتیاز خاص ہے جو اس سے پہلے کسی شاعر کے لیے نہیں پایا جاتا۔ محمود کی وفات پر جو مرثیہ کہا ہے اُس میں اصول مرثیہ گوئی خوب برتے ہیں۔ ممدوح کی عظمت۔ اُسکے مرنے پر ملک میں رنج۔ پھر متوفی سے مخاطبت جس سے بین کا انداز پیدا ہو۔ یہ سب باتیں ملاحظہ ہوں:—

شہر غزنین نہ ہمانست کہ من دیدم پار | چہ فتادست کہ امسال دگرگوں شدہ کار

کوئہا بینم پر شورش و سرتاسر کوی | ہمہ پر جوشن و پر جوشن و درویش و سوار

مہتراں بینم بر روی زناں ہمچو زناں | چشمہا کردہ ز خونابہ برنگ گلنار

ملک امسال دگر بار نیامد ز غزا | دشمنے روے نہادست در شہر و دیار

سیر مے خوردہ مگر دی کہ بخفتست امروز | دیر برخاست مگر رنج رسیدش ز خمار

خیز شاہا کہ رسولان شہان آمدہ اند | ہدیہا دارند آوردہ فراوان و نثار

کہ تواند کہ برانگیزد زیں خواب ترا | خفتنی خفتی کز خواب نگردی بیدار

بچھا را ز فرغ و بیم تو رفتند شہاں | تو شہا از فرغ و بیم کہ رفتی بچھار؟ الخ

غیر مانوس بحروں میں بھی اشعار کہے ہیں اور اچھے کہے ہیں۔ تغزل کے خیالات
وہی تشبیب میں ہیں یا رباعیوں میں جنکا ذکر بخوف طول ترک کیا جاتا ہے۔

مسعودی

مسعودی حکیم ابو نصر عبد العزیز بن منصور مروزی بھی اسی زمانے کے
فحول شعرا میں ہے۔ سلطان محمود کے دربار میں اسکی بھی کرسی تھی اور انعامات
وجائزات بہت پائے تھے۔ ۴۳۲ھ سال وفات ہے۔ صاحب مجمع الفصحا
کہتے ہیں کہ "زر کلامش بر محک اہل کمال کامل عیار و بے غل و غش شدہ"
دولتشاہ وغیرہ نے صرف ایک رباعی اسکی نقل کی ہے:۔

از شرب مدام و لاف مشرب توبہ　　وز عشق بتان سیم غبغب توبہ
دل در ہوس گناہ و بر لب توبہ　　زین توبۂ نادرست یا رب توبہ

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ طبیعت میں شوخی خاص طور پر تھی۔ ایک قصیدے
میں ساقی کو قبلۂ زردشت کہا ہے۔ بجد شوخ اختراع ہے:۔

برخیز و برافروز ہلا قبلۂ زردشت　　بنشین و برافگن شکم قاقم بر پشت
بس کس کہ ز زردشت بگردید و دگر بار　　ناچار کند روی سوی قبلۂ زردشت

+ + + + + + + + + +

آنکس کہ ترا کشت ترا کشت و مرا زاد　　وانکس کہ ترا زاد ترا زاد و مرا کشت الخ

حسن تکرار کے چند شعر یہ ہیں:۔

باران قطرہ قطرہ ہمی بارم ابروار　　ہر روز خیرہ خیرہ ازین چشم سیل بار
زان قطرہ قطرہ قطرۂ باران شدہ خجل　　زان خیرہ خیرہ خیرہ دل من ز ہجر یار
یارکہ ذرہ ذرہ نماید ہمی نظر　　ہجر آتش پارہ پارہ ہمین بر تنا و بار
زان ذرہ ذرہ آمدہ بدل آمدم چہ کوہ　　زان پارہ پارہ پارہ بچشم آمدم غبار الخ

عمر خیام کا رنگ ملاحظہ ہو:-

صبح است و صبا مشک فشاں می گذرد | دریاب کہ از کوی فلاں می گذرد
برخیز چہ خسپی کہ جہاں می گذرد | بوئے بستاں کہ کارواں می گذرد

فردوسی کے حالات

۷ فردوسی۔ ابوالقاسم[۱] حسن بن اسحق بن شرف شاہ مضافات طوس کا رہنے والا۔ غالباً ۳۲۹ھ میں پیدا ہوا۔ آزاد ماحول میں پرورش پانے کی وجہ سے طبیعت میں خاصہ زور پیدا ہو گیا۔ علمی مشاغل میں بسر ہوتی تھی اور شاعری کا جوہر اپنا رنگ دکھاتا تھا۔ سنا کہ دقیقی نے شاہنامہ نظم کرنا شروع کیا تھا مگر ہزار شعر کہہ کے مقتول ہو گیا تو دل کو بھی شوق ہوا۔ زوال جمشید و عروج ضحاک کی داستان نظم کی تو سننے والوں کو بہت پسند آئی۔ ابھی کیا تھا اسی کام پر متوجہ ہو گیا۔ طوس کے عامل ابو منصور نے حوصلہ افزائی کی۔ پھر ارسلان خان نے بھی توجہ کی۔ سلطان محمود کو خبر پہونچی کہ فردوسی طوس میں شاہنامہ نظم کر رہا ہے۔ ارسلان خان کو حکم بھیجا کہ فردوسی کو روانہ کر دو۔ حکم شاہی کا ماننا واجب! فردوسی غزنین کی طرف چلا۔ ابھی راستے ہی میں تھا کہ دراندازیاں شروع ہو گئیں اور شعرائے دربار کو یہ خیال ہوا کہ اگر وہ آ گیا تو سب کا رنگ پھیکا پڑ جائے گا۔ کہتے ہیں کہ عنصری کی ترغیب سے ایک شخص نے لکھ بھیجا کہ یہاں نہ آنا۔ پھر اُسی شخص نے جب عنصری کشیدہ ہو گیا تو لکھ بھیجا کہ پہلا خط عنصری کی شرارت سے تھا تم ضرور آؤ۔ شیخ معشوق طوسی نے پیشین گوئی کی تھی کہ شاہنامہ بہت کامیاب ہوگا۔ لہٰذا فردوسی ان باتوں سے کبیدہ

۱؎ علامہ شبلی نعمانی نے نہایت محققانہ طور سے حالات لکھے ہیں اور کلام کی تنقید بھی ادبی اور تاریخی حیثیتوں سے بے نظیر کی ہے۔ یہ حالات بیشتر شعر العجم ہی سے اخذ کیا گیا ہے۔

نہ ہوا بلکہ جواب میں لکھ بھیجا :-

بگوش از سر و چشم پیچ و ہاست　　　دلم گنج گوہر زبان اژدہاست

چہ سنجید بمیزان عسن عنصری　　　گیا چوں کشند پیش گلبن سری

غرض غزنین میں آ کے پہلے ایک باغ میں ٹھہرا۔ وہاں عنصری، فرخی اور عسجدی بھی سیر کرنے آئے تھے۔ یہ درباری تکلفات کے دل دادہ۔ فردوسی دامن صحرا کا تربیت یافتہ۔ پہلے یہ لوگ ہنسے اور کہا کہ یہاں سوائے شاعر کے کوئی نہیں ٹھہر سکتا۔ فردوسی نے کہا کہ میں بھی شعر کہتا ہوں۔ چاہو امتحان لے لو۔ سب ہنس پڑے اور کہا کہ اچھا آؤ۔ ہم سب ایک ایک مصرع کہتے ہیں۔ تم بھی کہو :-

عنصری　　چوں عارض تو ماہ نباشد روشن

فرخی　　مانند رخت گل نبود در گلشن

عسجدی　　مژگانت ہمی کند گذر از جوشن

شین کا التزام تھا شگفتہ قافیہ کہاں سے ملتا؟ فردوسی نے کہا :-

مانند سناں گیو در جنگ پشن

اب روایتیں مختلف ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ عنصری خوش ہو گیا اور دربار میں لے گیا۔ کسی کا بیان ہے کہ ماہک نامی ایک شخص سے دوستی ہو گئی۔ اس نے فضل بن احمد وزیر سے ذکر کیا اور وزیر بادشاہ کے پاس لے گیا۔ غرض فردوسی نے اپنے اشعار سنائے تو بادشاہ اور اہل دربار سب محو حیرت ہو گئے۔ ابتدا بادشاہ کی تعریف سے کی :-

زیزدان ابر شاہ باد آفریں　　　کہ نازد باو تخت و تاج و نگیں

جہان آفریں تا جہان آفرید　　　چو او مرز باسے نیامد پدید

ز کشمیر تا پیشِ دریائے چیں　　بر و شہریاراں کنند آفریں

چو کودک لب از شیرِ مادر بشست　　ز گہوارہ محمود[1] گوید نخست

بہ بزم اندراں آسمانِ وفاست　　بہ رزم اندراں شیرِ جنگ آزماست

بتن ژندہ پیل و بجاں جبرئیل　　بکف ابرِ بہمن بدل رودِ نیل

پھر اپنی برسوں کی محنت کا نتیجہ سنا یا یعنے شاہنامہ کے اشعار محمود کو شروع سے خواہش تھی کہ یہ کتاب نظم ہو جائے۔ فردوسی کو حکم دیا کہ اسے تمام کرو: — ایک باغ رہنے کو دیا اور فی شعر ایک دینار دینے کو کہا اور حکم دیدیا کہ جب ہزار شعر ہو جائیں تو ہزار اشرفیاں دیدی جایا کریں فردوسی کے وطن میں بارش کے موسم میں سیلاب آتا تھا۔ اُس کا ارادہ تھا کہ یہاں کے روپیہ سے بند بندھوا دے اسلئے متفرق لینا پسند نہ کیا بلکہ کہا کہ ختمِ کتاب کے بعد اکٹھا لے لوں گا۔ مگر بقول علامہ شبلی نعمانی "علمی تاریخ کا یہ ایک ناگوار واقعہ ہے کہ فردوسی کو اُسکی اعجاز بیانی کی داد نہیں ملی" یعنے جب شاہنامہ تیار ہوا تو اُس کو اشرفیوں کے بجائے روپئے دلوائے گئے۔ وجہ یہ ہوئی کہ ایاز ہو یا حسن میمندی حسن محمد ہو یا کوئی اور شخص۔ کسی نے بادشاہ سے کہدیا کہ فردوسی متعصب شیعہ ہے۔ اسوجہ سے بادشاہ ناراض ہو گیا۔ کوئی کہتا ہے کہ فخر الدولہ دیلمی کا تحفہ قبول کر لیا تھا جو متعصب شیعہ تھا اور محمود کو اُس سے علاوہ مذہبی اختلاف کے پولیٹکل عداوت بھی تھی۔ غرض کچھ ہو فردوسی پر ظلم ہوا۔ جس وقت یہ روپیہ پہونچا ہے فردوسی حمام میں تھا۔ دل ٹوٹ گیا اور

---

[1] مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ بچہ جب پہلے پہل بولتا ہے تو خدا کا نام لیتا ہے محمود بھی منجملہ اسمائے الٰہی ہے۔ لہٰذا لطفِ تخییل ظاہر ہے۔

وہ روپیہ سب وہیں لٹا کے کہلا بھیجا کہ "میں نے یہ خون جگر ان سفید[illegible]
کے لئے نہیں کھایا تھا"۔ جب محمود نے سنا تو دراندازوں پر خفا ہوا کہ
تم نے مجھے بدنام کیا۔ مگر ان لوگوں نے کہا کہ فردوسی نے گستاخی کی۔ اگر بادشاہ
خاک بھی دیتا تو اُسے آنکھوں پر رکھنا تھا۔ بادشاہ اور جل گیا اور کہا کہ
اس قرمطی کو گستاخی کا مزا چکھاؤں گا۔ صبح کو محمود باغ میں گیا تو
فردوسی پاؤں پر گر پڑا اور کہنے لگا:۔

چو در ملک سلطان که چرخش ستود — بسے ہست ترسا و گبر و یہود
گرفتند در ظل عدلش قرار — شدہ ایمن از گردش روزگار
چه باشد که سلطان گردوں شکوه — رہی را شمارد ازاں یک گروہ

بادشاہ کو رحم آگیا اور تقصیر کلام معاف کردی۔ اب فردوسی غزنین سے
بھاگا اور چلتے وقت ایاز کو ایک لفافہ دے گیا کہ بیس روز کے بعد
بادشاہ کو دینا۔ محمود نے جو مہر کھولی تو ہجو کے اشعار تھے۔ کلام کی
قوت دیکھو کہ محمود نے بڑی بڑی سلطنتیں مٹادیں مگر یہ ہجو نہ مٹا سکا۔
آجتک شاہنامے کے ابتدا میں درج ہوتی ہے۔ بدنصیب شاعر بھاگ
کے ہرات پہونچا تو شاہی جاسوس تعاقب میں پہونچے۔ چھ ماہ روپوش
رہا۔ پھر طوس گیا اور وہاں سے قہستان پہونچا جہاں کے حاکم نے ہجو
کے اشعار بحساب فی شعر ایک اشرفی مول لئے اور کہا کہ اسے شاہنامہ سے
مٹادو۔ فردوسی نے ایسا ہی کیا مگر وہ مشہور ہو چکی تھی۔ اور زبان زد ہونے کی
وجہ سے مٹنا دشوار ہو گیا۔ ناصر ملک نے محمود کو عریضہ بھیجا کہ فردوسی
کے حق میں بڑا ظلم ہوا۔ فردوسی جب غزنین سے چلا تھا تو جامع مسجد
پہ یہ شعر لکھ آیا تھا:۔

خجستہ درگہ محمود غزنوی دریاست — چگونہ دریا کاں را کرانہ پیدا نیست
چو غوطہا زدم و اندرو ندیدم دُر — گناہ بخت من است این گناہ دریا نیست

سلطان جامع مسجد میں نماز پڑھنے آیا تو ان شعروں پر نظر پڑی۔ نہایت متاسف ہوا۔ واپس آ کے ناصر ملک کا عریضہ ملا۔ دل کانپ گیا اور دربانوں کی زجر و توبیخ کی۔ اُدھر فردوسی مارا مارا پھرتا تھا۔ کبھی مازندران گیا۔ کبھی دارالمرز۔ کبھی کہیں۔ کبھی کہیں۔ مگر محمود کے خوف سے کسی امیر نے پناہ نہ دی۔ آخر بغداد آیا اور خلیفہ کو خوش کرنے کے لئے یوسف زلیخا نظم کی مگر ٹوٹے ہوئے دل میں وہ طاقت کہاں جو شاہنامہ کے تصنیف کے وقت تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ مثنوی پھیکی رہی۔ کچھ دنوں وہاں رہ کے فردوسی وطن واپس آیا۔ ادھر محمود کو کسی ہندوستانی راجہ سے مقابلہ کرنا تھا۔ خط بھیجا تھا جواب کا انتظار تھا۔ ایک دن وزیر سے کہنے لگا کہ میرے خلاف جواب آیا تو کیا ہونا چاہئے۔ اُس نے کہا:

اگر جز بکام من آید جواب — من و گرز و میدان و افراسیاب

محمود پھڑک گیا۔ پوچھا کس کا شعر ہے۔ کہا اُسی بدنصیب فردوسی کا۔ محمود کو بہت رنج ہوا اور فی الفور ساٹھ ہزار اشرفیاں بھجوائیں مگر اُس وقت پہنچیں جب فردوسی کا جنازہ دروازے سے باہر نکل رہا تھا۔ پھر یہ صلہ اُس کی لڑکی کو دیا مگر اُس نے لینے سے انکار کیا۔ آخر حاکم طوس نے ایک کاروانسرا بحکم سلطان فردوسی کی یادگار میں بنوا دی جسے ناصر خسرو وغیرہ نے دیکھا ہے۔ فردوسی کا مزار مدتوں آباد رہا اور سنہ [illegible] تک لوگوں نے اُس کی زیارت کی۔ ایک مولوی صاحب ابوالقاسم گرگانی تھے۔ انھوں نے فردوسی کے جنازے پر نماز نہیں پڑھی اور کہا یہ مجوسیوں کا مداح تھا

اور خود بھی انھیں خیالات کی پیروی کرتا تھا۔ رات کو خواب میں دیکھا کہ فردوسی بہشت میں نہایت شان سے ہے۔ پوچھا کہ تیری مغفرت کیونکر ہوئی کہا اس شعر کی بدولت :۔

جہاں را بلندی و پستی توئی نہ دانم چۂ ہر چہ ہستی توئی

سال وفات ۴۱۱ھ ہے۔ صاحب مجمع الفصحا نے ۴۱۶ھ لکھا ہے۔ معلوم نہیں اتنا اختلاف کیوں ہے۔ حالانکہ فردوسی نے ختم شاہنامہ کی تاریخ خود لکھی ہے :۔

ز ہجرت شدہ پنج ہشتاد بار کہ گفتم من این نامۂ شہریار

یعنے سنہ ۴۰۰ھ میں شاہنامہ ختم ہوا۔ اُسکے بعد چند ہی سال زندہ رہا۔ ۴۱۱ھ تک بھی بہت زائد زمانہ ہوتا ہے نہ کہ ۴۱۶ھ۔

اہنامہ کی
یخی حیثیت

فردوسی کی تصانیف میں شاہنامہ اور یوسف زلیخا ہیں اور کچھ غزلیہ اشعار و قطعات وغیرہ لیکن جس تصنیف نے اُسے "خدائے سخن" کا لقب دلایا ہے وہ شاہنامہ ہے جو تیس برس کی محنت کا نتیجہ ہے۔ تاریخی حیثیت اسکی اتنی مضبوط ہے کہ پروفیسر براؤن بہت کچھ تحقیق کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ "ہماری نظر میں اُسکی وقعت یہ دیکھ کے بڑھ جاتی ہے کہ جن کتابوں سے اُس نے شاہنامہ لکھا ہے اُن سے ترتیب وار مطابقت پائی جاتی ہے۔" اب دیکھنا یہ ہے کہ شاہنامہ کا ماخذ کیا ہے؟ مجمع الفصحا سے معلوم ہوتا ہے کہ جاماسپ نامہ۔ آئین بہمن۔ داراب نامہ دانش افزائے نوشیروانی۔ پاستان نامہ۔ دانشور نامہ۔ خرد نامہ وغیرہ کا وجود فردوسی کے زمانے میں تھا اور ان کتابوں سے اُس نے پوری مدد لی ہے۔ علاوہ بریں خلفائے بنی امیہ و بنی عباس کے عہد میں

میں کسی نہ کسی طرح ایک گوشۂ عافیت ڈھونڈھ نکالا گیا۔ سرداران فوج نے مشورہ کیا اور پھر لڑائی میں مصروف ہو گئے۔ ایسے وقت کے حالات کی تفصیل کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ واقعہ نگار اگر لکھے تو خلاف واقع ہوگا۔ سچی تصویر ایجاز و اختصار میں کھنچے گی۔

پئے مشورت انجمن ساختند نشستند و گفتند و برخاستند

جو اس ایجاز میں لطف ہے بھلا تفصیل میں کہاں؟

(۵) صنائع و بدائع کو یہ سمجھا گیا ہے کہ استحسان کلام کے لئے لازم ہیں اور جس طرح بنے ٹھوس ٹھاس کے لائے ضرور جائیں حالانکہ کلام لطیف میں یہ خوبیاں از خود پیدا ہوتی ہیں اور کوئی نہ کوئی معنوی غرض صحیح لئے ہوئے آتی ہیں۔ مثلاً مبالغہ جو جھوٹ سمجھا گیا ہے مذاق سلیم میں اظہار حقیقت کا بہترین آلہ ہے۔ کسی کو غصہ آتا ہے تو کہتے ہیں "تہرستند" "بخشم آمد" لیکن اگر یہ ظاہر کرنا ہو کہ غصہ کی حالت میں حرارت جسم بڑھ جاتی ہے۔ چہرہ تمتمانے لگتا ہے۔ گرم خون رگوں کو توڑ کے باہر نکلنا چاہتا ہے تو کیونکر ادا کریں۔ ادبی نزاکت میں اتنی قوت نہیں کہ مسائل حکمیہ کی ہر وقت متحمل ہو سکے۔ مبالغہ مشکل آسان کرتا ہے اور کہنے والا کہہ دیتا ہے کہ "برافروخت" یا "آتش غضبش برافروخت" اور اسی حال میں دشمن کو مار کے زمین پر گرا دیا تو کہتا ہے کہ "خرمن حیاتش بسوخت"۔ حسن تعلیل کے متعلق گذشتہ ابواب میں ذکر ہو چکا ہے۔ غرض "خدائے سخن" چاہے مضمون آفرینی کرے چاہے واقعہ نگاری ہمیشہ مصلحت آفرینش پر نظر رکھتا ہے اور خواہ مخواہ نہ محراب عبادت میں گلچینی کرتا ہے نہ باغ میں سجدے کرتا ہے:۔

بروزِ نبرد آں یلِ ارجمند ۔ بہ شمشیر و خنجر بہ گرز و کمند
درید و برید و شکست و ببست ۔ یلاں را سر و سینہ و پا و دست

دیکھو کس شان سے معرکۂ قتال کی تصویر کھینچی ہے اور آلات حرب کا برمحل استعمال کس اطمینان قلب اور چابک دستی کا مرقع دکھاتا ہے۔ علمائے بدیع نے اس کا نام "لف و نشر" رکھ دیا اور اتنا ہی نظر آسکا۔ مدرسے میں جا کے جھائی دیگا کہ لف و نشر کی تمثیل ہے۔ ذرا غور سے دیکھو کیا اتنی ہی بات ہے یا کچھ اور بھی ہے۔ یا

فرو شد بہ ماہی و برشد بہ ماہ ۔ بن نیزہ و قبضۂ بارگاہ
زبس گرد میداں کہ برشد بہ دشت ۔ زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت

ذرا انصاف سے کہنا کہ صنعت لف و نشر مرتب اور مبالغہ کہہ دینے سے ان شعروں کی خوبی ختم ہوگئی یا میدان کارزار کے دیکھنے والوں کے جلالت سے متاثر اور رعب سے متحیر دلوں کا نقشہ ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ مظفر و منصور فوج کی عظمت و جلالت کا اثر زمین کی تہ سے لیکے آسمان کی چوٹی تک ہے اور ہنگامہ اس بلا کا کہ زمین کے طبقے اڑتے نظر آتے ہیں۔ اس گھبراہٹ میں خدا جانے دیکھنے والے کے دماغ میں کیا کیا خیالات پیدا ہو رہے ہیں اور متخیلہ ان کی تصویریں آنکھوں کے سامنے کس کس رنگ میں لا رہا ہے۔

(۶) پرانی زبان کے باقیات صالحات کی غالباً آخری جلوہ گاہ ہے مردہ محاورات و الفاظ کو زندگی کا بھاری جامہ پہنا کے میدان سخن میں گلگشت کا موقع دیا گیا ہے۔ لیکن یہ حیات مستعار فردوسی کی زندگانی سے وابستہ ہے۔ خدائے سخن کے بعد ان کا عالم کون و فساد میں باقی رہنا محال ہوگیا۔ نہ اسم وصل کے بعد الف زائد دکھائی دینگے۔ نہ ہر جگہ الفاؤ

نون سے جمع بنے گی۔ نہ "چناں" کی جگہ "چوناں" نہ "بے" کی جگہ "ابے" یا "بر" کی جگہ "ابر" "ہیچ" بجاں "ایچ" تھا اور "ازیں رو" کو "ازیں را" کہتے تھے۔ چند الفاظ کی فہرست یہ ہے :۔

لفظ	معنی	لفظ	معنی
ویژہ	خاص	بسندہ	کافی
آخُر	اصطبل	شارسان	شہر
آزرگشسپ	برق	خشت	نیزہ کی چمک
پسیچ	قصد	ایدون	حالا
پازہر	تریاک	تخش	تیر
پدرام	آراستہ	آغاز	ارادہ
مر	شمار	بگماز	شراب
آزیں	آرائش	شخودن	خراشیدن
افسون	ظلم	ریمن	مکار[1]

(۷) مذاق حال کی تنقید کا فیصلہ ہے کہ اس رزمیہ نظم میں جن اشخاص کا ذکر ہوا ہے اُن کا کیریکٹر بدلنے نہیں پایا۔ رستم کی شجاعت۔ عالی ظرفی اور سلطنت ایران سے وفاداری وہاں بھی ظاہر ہے جہاں اسفندیار ولیعہد تاج ایران سے مقابلہ ہوا ہے۔ کہتا ہے کہ بارالٰہا

تو دانی کہ بیداد کوشد ہمی — ہمن جنگ و مردی فروشد ہمی

بہ بادافرہ این گناہم مگیر — توای آفرینندۂ ماہ و تیر

بڈھوں اور جوانوں کے مقابلے میں دونوں کے خصوصیات سن و سال کا

---

[1] تفصیل شعرالعجم حصہ اول میں ملیگی۔

لحاظ رکھتا ہے۔ ایک کے یہاں جوش جوانی دوسرے کے یہاں تجربہ کاری ہر
مقام سے مترشح ہے۔ بہرام گور اور منذر سے جو مکالمہ ہوا ہے اُس سے عرب
و عجم کے طرز معاشرت اور عنوان تخیل کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے۔ افراسیاب
زور و ظلم کا پیکر ہے ضحاک بد طینتی اور ظلم کا ہیرو ہے۔ کیکاؤس میں
عظمت و شجاعت کے ساتھ ساتھ ہٹ اور کسی قدر کینہ پروری موجود
ہے۔ کیخسرو میں اخلاق حمیدہ کا توفر ہے اور عظمت ایران کا کامل جلوہ۔

(۸) قوانین حکمت اخلاق کا مخزن وہ مواعظ ہیں جو دوران ذکر
میں آگئے ہیں۔ فلسفۂ مذہب پر آزادانہ نظر ہے۔ حق کا جلوہ سب میں ہے
منہم سے صمد تک تھوڑا راستہ ہے۔ یہیں وحشت کا سامان سے کہنا کہ

خداوند ما و شما خود یکیست — به یزدان ما هیچ پیکار نیست
گذشته از و نیک یا بت پرست — چه در چین و کابل چه در هند و بست [1]
اس کے علاوہ [2]
شمارا خود آتش بود فروغ — تو دانی که من در نگفتم دروغ
مناسب ہے — کہ اس بحث پر
پرستیدن مهر و ماه بد است — چه ما را همه آرزو ایزد است [3]

سیاسیات و اقتصادیات کے مسائل بھی الٰہیات سے کم نہیں پھر بلاغت
کی یہ حالت ہے کہ جس مسئلے کا ذکر کرتا ہے مقتضائے حال کو نظر انداز ہونے
نہیں دیتا۔ موبدوں کی طرز ادا اور ہے پہلوانوں کی اور مضامین عشقیہ

---

[1] جن ممالک کے نام لیئے ہیں وہ سب زمانۂ قدیم میں بت پرست تھے۔ محض
ضرورت شعر سے چند نام پیش کیے ایسے نظم نہیں کیئے ہیں۔

[2] معلوم ہوتا ہے کہ آتش پرستی کیا تھی جس سے بھی پیشتر کئی گستاسپ
کی حیثیت عہد مذہبی کی ہے۔

[3] فلسفیانہ نظر اور مذاق کلامی کا نمونہ۔

لیکن یہ التزام لے لینا آسان ہے کہ سوز و گداز نہیں مگر بلاغت کو پس پشت پھینک دینا ناممکن ہے۔ رستم کے باپ کی عاشقانہ کیفیت اور ہے اور محمد شاہ رنگیلے کا رنگ اور۔ اگر معیار تنقید یوں قائم ہو جائے تو فردوسی سے بہتر شاعر ملنا دشوار ہے۔ محققانہ بحث شعر العجم جلد چہارم میں بالاستیعاب موجود ہے۔ مولف کو اختصار مانع ہے اگرچہ

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم چنانکہ حرف عصا گفت موسی اندر طور

اسدی اسدی۔ ابو نصر علی بن احمد طوسی۔ بادشاہان عجم کی اولاد میں ہے۔ تحصیل علوم کے بعد آل بویہ کے دربار میں بار یاب ہوا۔ پھر آذربیجان میں ابودلف کرکری تک رسائی ہوئی۔ کہتے ہیں کہ اسکے وزیر کی فرمائش سے گرشاسپ نامہ نظم کیا جسے بعض لوگ شاہنامہ سے بہتر سمجھاتے[۱]۔ یہ دس ہزار شعر اب بھی ملتے ہیں جن کی تصحیح صاحب مجمع الفصحا نے کی ہے۔ دولت شاہ کا بیان ہے کہ یہ فردوسی کا استاد تھا۔ جب شاگرد کا آخر وقت آیا تو استاد کو وصیت کی کہ شاہنامہ ناتمام رہ گیا ہے اسے پورا کر دے چنانچہ اسدی نے استیلائے عرب سے لیکے آخر تک چار ہزار شعر کہدئے ہیں جو آخر شاہنامہ میں درج ہیں مگر محققین نے بالاتفاق اس روایت کو غلط سمجھا ہے۔ اسدی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ مناظرے نظم کئے ہیں جن سے اُس کی قوت تخیل کا

---

[۱] مجمع الفصحا۔ ص ۹۳ براؤن نے لکھا ہے کہ مناظرہ گو ابو نصر احمد بن منصور اسدی طوسی ہے اور مصنف گرشاسب نامہ و لغت عجم اُس کا بیٹا ابو نصر علی بن احمد طوسی ہے۔ یہ معاملہ تحقیق طلب ہے۔ افسوس ہے کہ مولانا شبلی کو اس طرف توجہ نہ ہوئی ورنہ یہ عقدہ بھی حل ہو جاتا۔ صاحب مجمع الفصحا بھی مولانا کی طرح دونوں کو ایک سمجھتے ہیں اور دوسرے تذکرہ نویس بھی انھیں کے ہم آہنگ ہیں۔ ۱۲

کافی اندازہ ہوتا ہے۔ چنانچہ مناظرہ شب و روز۔ مناظرہ زمین و آسمان۔ مناظرہ گبر و مسلم۔ مناظرہ قوس درج مجمع الفصحا میں درج ہیں۔ ان میں سے ایک منوچہر بن قابوس کی تعریف میں بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ زیاریوں کے دربار میں بھی گیا تھا۔ سلطان محمود کے سبعۂ سیارہ میں اس کا بھی شمار ہے اور براؤن کی روایت ہے کہ مناظرہ عرب و عجم میں شمس الدولہ اور مجد الدولہ سلاطین آل بویہ کی مدح کی وجہ سے محمود اس سے ناراض ہو گیا تھا۔ وفات سلطان مسعود بن محمود کے زمانے میں ہوئی ہے۔ علاوہ گرشاسپ نامہ اور مناظرات کے ایک اختیارات نجوم بھی اس کی یادگار ہے۔

مناظرات میں قوت تخییل کا زور ہے اور معلومات علمیہ کے اظہار کا ایک نیا راستہ نکالا گیا ہے۔ اگرچہ سوال و جواب کا طریقہ عنصری کی ایجاد ہے لیکن وہ گفتگوئے محض تھی اور یہ خصم کے مقابلے میں اپنی فضیلت ثابت کرنا ہے۔

گردست دیر است آنکہ ہستی خدائے ما / ہر سال شگفت بیہد از ارض تا سما
ہموار گشتہ مرد از نبی دو کہ فضل کدام بیش / کاندر شمار شان نتوان یافت انتہا
اندر حکایت است کہ ہر مہر و ہر اکہی / تیر در سخن عدل زر چو فخر کبریا

+ + + + + + + + + +

گفت آسمان فعال مرا چند حکمت است / وز حکمت است در حکما حکمت و ذکا
گفتش زمین کہ قحط و وبا ہم ز تو بود / چہ حکمت است قحط و برآوردن وبا
گفت آسمان مرا ز تو بلیہ ست فزون از ہلاک / بر تو مرہم اژدہا ست میان شہر یا بلا
گفتش زمین چہ بلیہ ست ترا اژدہا و شیر / بیش است صد ہزار مرا شیر و اژدہا
گفت آسمان ز قدرت بنا یمن مدام / گردندہ ام معلق و بے جائے و اتکا
گفتش زمین اگر تو بہ گردش معلقی / من نیز ہم معلقم استادہ در ہوا الخ

زبان پرانی ضرور ہے مگر تکلفاتِ عربیہ سے مملو۔ فردوسی کی طرح دامنِ دشت کی
تازی ہوائیں یہاں نہیں ملتیں۔ شہری آرائش ہے اور ویسی ہی نفاستیں۔
گردشِ فلکی کا واقعاتِ عالم پیدا کرنے میں موثر ہونا۔ ستاروں کی شکلیں۔
ہیئت و ہندسہ کی اطلاع۔ حرکتِ فلک۔ سکونِ زمین وغیرہ وغیرہ اکثر
اشعار میں موجود ہیں۔ پورے قصیدے میں اور بھی لطف ہے۔ مگر چاہو
اس شاعری پر جیسی رائے قائم کرو مگر زورِ طبیعت کی داد دینا ہو گی۔
گرشاسپ نامہ مثنوی ہے مگر زبان کا رنگ اور تخیل کا انداز وہی شہری
ہے۔ فردوسی کا استاد ہونا تو مشکل ہے البتہ بقول مولانا شبلی شاہنامہ اور
سکندر نامہ کے بیچ کی کڑی ہے۔ حکیمانہ رنگ میں بہترین اشعار گرشاسپ نامہ
کے حقیقتِ روح کے بیان میں ہیں:۔

چنان دان کہ جان برترین گوہر است — نہ زین گیتی از گیتی دیگر است
فرشتہ ہست از جائے پاک — فتادہ دریں تیرہ تارے مغاک
یکے نور بینائے تابندگی — پذیرائے بیداری و زندگی
نہ آرام جوی و نہ جنبش پذیر — نہ از جائے بیرون و نے جائے گیر
سپہر برین بستۂ بند اوست — جہان ایستادہ بہ پیوند اوست
نہان از نگارست لیک آشکار — ہمی ہر گرد گونہ گونہ نگار
ببیند تن و دیدہ ور آروے — کہ شد کوہ و ہمسنگ یک موے نیست
تن او را یکے جامہ است راست — کہ گر افگند ور بپوشد رواست
تنت خانہ شد جان بیاسخ درون — چراغش روان زندگانی ستون

(حاشیہ: ابو الفرج رونی ۔٣۔)

سب کچھ سہی مگر فردوسی کی بات کہاں؟

(حاشیہ: ابوالفرج سنجری)

ابوالفرج سنجری امیر ابو علی سیمجور کے دربار کا شاعر ہے۔ یہ امیر

دولت سامانیہ کے طرف سے حاکم خراسان تھا۔ آخر سلطان محمود نے اسے گرفتار کر لیا اور خود خراسان کا مالک ہو گیا۔ سنجور کے حکم سے آل سبکتگین کی ہجو کرتا تھا۔ محمود نے اسے بھی گرفتار کرایا مگر عنصری نے سفارش کی اور خطا معاف ہو گئی۔ کہتے ہیں کہ عنصری اس کا شاگرد بھی تھا اور اُستاد نے شاگرد کی تعریف میں قصائد کہے اور بہت سا مال حاصل کیا۔ سنہ ۴۰۰ھ کے بعد انتقال ہوا کلام کمیاب ہے۔

(پندار رازی)

پندار رازی ۔ خواجہ کمال الدین نام۔ امیر مجد الدولہ دیلمی اور اُس کے وزیر صاحب بن عباد کے دربار کا حاضر باش ہے اور زلہ ربا۔ انھیں امرا کی مدح گستری میں وقت صرف کیا۔ دیلمی۔ عربی۔ فارسی زبانوں میں شعر کہے ہیں۔ سنہ ۴۰۱ھ میں وفات پائی اور مجد الدولہ بھی اسی سال مقتول ہوا۔ کلام کمیاب ہے اور یہ قطعہ یادگار ہے۔

ازمرگ حذر کردن دو روز روا نیست
روزیکہ قضا باشد و روزیکہ قضا نیست
روزیکہ قضا باشد چیزے نکند سود
روزیکہ قضا نیست درو مرگ روا نیست

منوچہری

منوچہری ۔ حکیم ابوالنجم احمد دامغانی۔ علوم و آداب ختم کرنے کے بعد عنفوان شباب میں امیر منوچہر بن قابوس کی خدمت میں باریاب ہوا اور اُسی کے نام پر تخلص رکھا۔ اس زمانے میں قادر باللہ عباسی کی خلافت تھی مگر سلطان محمود کا اتنا جاہ و جلال تھا کہ امیر منوچہر کو پچاس ہزار دینار سلطان غزنین کو سالانہ پیشکش کرنا ہوتے تھے۔ منوچہر کو وفاداری کے صلے میں سلطان کی دامادی کا شرف حاصل ہوا۔ سنہ ۴۱۱ھ میں اس امیر

خوش تدبیر کا انتقال ہو گیا اور منوچہری یہاں سے مایوس ہو کے غزنین چلا گیا۔ اگرچہ اسدی کا شاگرد تھا مگر عنصری کا ایسا دور دورہ تھا کہ اُسکی شاگردی کرنی پڑی۔ بعض نقادان فن کی رائے ہے کہ قصیدہ اُستاد سے بھی اچھا کہتا تھا۔ سلاطین غزنویہ کی مدح سرائی میں زندگی ختم کر دی۔ مولانا شبلی کی تحقیق ہے کہ سلطان محمود کے بعد شعرائے آل غزنین میں آکے شامل ہوا تھا یہی وجہ ہے کہ محمود کی تعریف میں کوئی قصیدہ نہیں کہا۔ محمد بن محمود غزنوی نے اسے ترخانی کا منصب دیا یعنی دربار میں بغیر روک ٹوک کے چلا جاتا تھا۔ مسعود بن محمد نے بھی اتنی قدردانی کی کہ اور شاعروں کو رشک ہونے لگا اور رفتہ رفتہ اس کا لقب شصت کلہ[1] ہو گیا کوئی کہتا ہے کہ ساٹھ چھپے تھے کوئی شصت گلہ پڑھتا ہے اور ساٹھ گلوں کا مالک سمجھتا ہے۔ سنہ ۴۳۲ھ میں فوت ہوا۔ اس کا کلام اس وقت صاحب مجمع الفصحا کا مرتب کیا ہوا موجود ہے جس میں تین ہزار اشعار ہیں۔ فرانس میں بھی اس کا دیوان نہایت آب و تاب سے شائع ہوا۔ مولانا شبلی نے اسے دیکھا ہے اور کہتے ہیں کہ "میں نے اس سے فائدہ اُٹھایا ہے"۔

کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ شعرائے عرب کا اتنا دلدادہ ہے کہ اُن کے قصیدوں پر قصیدے فارسی میں نظم کرتا ہے اور بے تکلف اُن کا ذکر کرتا ہے۔ کہتا ہے :۔

من بسے دیوان شعر تازیاں دارم زبر
تو ندانی خواند الا ھبی بصحنک فاصبحین

---

[1] عمرو بن کلثوم کا قصیدہ جس کا مطلع ہے :۔

الا ھبی بصحنک فاصبحینا   ولا تبقی خمور الاندرینا

ولہ

امرؤ القیس[51] و لبید و اخطل و اعشیٰ و قیس
بر طلل ہا نوحہ کردندے و بر رسم تلیٰ
آنکہ گفتست آذنتنا[52] آنکہ گفت الاّ ھبّی[53]
آنکہ گفت السیف[54] اصدق آنکہ گفت ابلی الہوی[55]

کلام عرب کے تلمیحات وغیرہ بھی اسی وجہ سے اسکے کلام میں بکثرت آگئے ہیں بلکہ بعض قصیدوں کی تشبیبیں بالکل عربی مذاق کی ہیں اور تخییل تک عرب کی ہے ساتھ ہی ساتھ زبان کی شیرینی اور فصاحت و لطافت نے اور بھی دل آویزی پیدا کر دی ہے :—

اے ترک من امروز نگوئی کہ کجائی ۔۔۔ تا کس بفرستیم و بخوانیم و بیائی
آنکس کہ نباید بر ما زود تر آید ۔۔۔ تو دیر تر آئی بہ بر ما کہ بیائی
و امروز کہ من شیفتہ تر باشم بر تو ۔۔۔ عذرے بنہی بر خود و نازے بفزائی
گوئی بہ رخ کس منگر جز برخ من ۔۔۔ اے ترک چنین شیفتہ خویش چرائی
من در دگران زاں نگرم تا بحقیقت ۔۔۔ قدر تو بدانم کہ ز خوبی بچہ جائی

مناظر قدرت کا مرقع بھی خوب کھینچتا ہے۔ خزانیہ مسمط سلطان مسعود غزنوی کی مدح میں نظم کرتا ہے :—

(۱)

خیزید و خز آرید کہ ایام خزانست
باد خنک از جانب خوارزم وزانست

---

[51] شعرائے عرب کے نام۔ [52] حارث بن حلزہ [53] عمرو بن کلثوم۔
[54] ابو تمام۔ [55] متنبی

آں برگ رزانست کہ بر شاخ رزانست
گوئی بمثل پیرہن رنگ رزانست
دہقاں بہ تعجب سرانگشت گرانست
کاندر چمن باغ نہ گل ماند ونہ گلنار

(۳)

طاؤس بہارے رادنبال بکندند | پرش ہبریدند و بہ کنجے بفگندند
خستہ بمیاں باغ بزاریش پسندند | با او نہ نشینند و نگویند و نخندند
واں پر نگارینش بدو باز نہ بندند | تا آذر مہ نگذرد و ناید آزار الخ

دیکھو کس قدر کلام میں حلاوت ہے بعض مقام پر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیچرل شاعری کا بادشاہ ہے۔ سراپا لکھنے کا شاید موجد یہی ہے خیالی تصویروں پر حقیقی تصویر کو فوقیت دیتا ہے اور تنسیق الصفات کی صنعت سے کام لیکے جوش طبیعت کا نقشا دکھاتا ہے۔ ایک عربی گھوڑے کا سراپا دیکھو:-

حبذا اسپے محجّل مرکبے تازی نژاد
نعل او پروین نشان و سُمّ او خارا شکن
رام زین وکش خرام وخوش عنان وتیز گام
شخ نوردو راہ جوے وسیل برّد و کوہکن الخ

تشبیہات و استعارات میں جدت کا شوق ہے۔ مبتذل قسموں کو چھوڑ کے غریب صنعتوں کیطرف اس کا دل کھنچتا ہے۔ آفتاب طلوع ہونے کا حال نظم کرتا ہے تو یہ خیال آتا ہے کہ روشنی بہ تدریج بڑھتی ہے جیسے جھلملاتا ہوا چراغ کہ جتنا تیل ڈالتے جاؤ گے۔ روشنی بڑھتی جائے گی۔

کہتا ہے :-

بگردار چراغ نیم مردہ   کہ ہر ساعت فزوں گردد ش روغن

ہلال دیکھ کے خیال آتا ہے کہ کسی معشوق نے اپنے سونے کے کڑے کا منہ کھول دیا ہے :-

چناں چوں دو سر از ہم باز کردہ   ز زرِ سرخ یک دست آورنجن

لغزیات بھی یادگار ہیں - شمع کے متعلق کہتا ہے :-

چیست آں شخصے چو زرّیں سرو چوں سیمیں چمن
خویشتن سوزاں و گریاں و گدازاں ہمچو من
باغ او بزمِ سلاطیں جائے او صدرِ شہاں
بارِ او زرّیں سلاسل بیخ او سیمیں لگن
خیزراں رنگست اگر نوراست رنگِ خیزراں
نارون باراست اگر نار است بارِ نارون
ہر کسے دارد دہن بر روی و او دارد بفرق
واندرو نجمِ فروزاں چوں سہیل اندر یمن الخ

خاتمہ

دورۂ غزنویہ کو یہاں پر ختم کر دینا مناسب ہے اگرچہ ابھی بہت سے شعراء و مصنفین کا ذکر باقی رہ گیا ہے - مثلاً بہرامی سرخسی مصنف خجستہ نامہ و غایت العروضیین و کنز القافیہ یا لبیبی - امینی - ابوالفضل طالقانی - منشوری - عطاردی - زینتی علوی محمودی وغیرہ اور خصوصاً کسائی مروزی جس کا نشو و نما آل سامان کے زمانے میں ہو چکا تھا بلکہ نوح بن منصور سامانی کا مرثیہ بھی کہا ہے :-

جنازۂ تو ندانم کدام حادثہ بود   کہ دیدہا ہمہ معقول ماند و مجروح

زآب دیدہ چو طوفانِ نوح شد ہمہ مرو　　جنازۂ تو وراں آب ہمچو کشتیِ نوح

سلطان محمود کی مدح سرائی بھی کی اور آل غزنین کا عروج وزوال سب کچھ دیکھا۔ عروج سلاجقہ جب ہو گیا تو دنیا سے رحلت کی۔ امیر ناصر خسرو کو اس کی تعظیم ملحوظ رہتی تھی اور اکثر اس کے قصیدوں پر قصیدے کہے ہیں۔ ایک مقام پر ناصر خسرو نے کہا ہے :۔

من چاکر و غلام کسائی کہ او بگفت　　جان و خرد روند بریں چرخ اخضر اند

امیر سعید ابوالخیر کا نشوونما بھی اسی دور میں ہو گیا تھا مگر ان کا ذکر آل سلجوق کے سلسلے میں آئے گا۔

——•>*<•——

باب ہفتم

سلجوقیہ

سلجوق
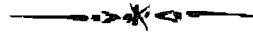
اس خاندان کا عروج دنیائے اسلام میں غزنویوں سے جلد تر ہوا۔ ابن اثیر نے مورث اعلیٰ کا نام تقاق بتایا ہے جس کا بیٹا سلجوق مسلمان ہو گیا۔ گرمیوں کے موسم میں سمرقند ان کا مستقر تھا اور جاڑوں میں بخارا۔ غالباً حافظ شیرازی اپنے معشوق کو ہر موسم میں بہترین مقام دینا چاہتے ہیں بلکہ ہر فصل کی دارالسلطنت ترکوں کی دئے دیتے ہیں تاکہ ہمیشہ معشوق ہی کی حکومت رہے[1]:۔

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا　　بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

اس خاندان کا شجرہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے:۔

سلجوق

- اسرائیل (ساری عمر سلطان محمود کے قید خانہ میں رہا)
  - قتلمش (قید خانہ سے فرار کر کے بخارا آیا)
- میکائیل
  - طغرل سلطان اول
  - چغری داؤد (حاکم مرو)
    - قاورت (سلاجقہ کرمان کا مورث اور حاکم کرمان)
    - یاقوتی (حاکم آذربائیجان و ارزنجان)
    - الپ ارسلان سلطان دوم (دارالسلطنت مرو)
      - تتش
      - ایاز
      - تکش
      - ارسلان ارغون
      - ملک شاہ
        - برکیارق
        - محمد
        - سنجر
        - محمود
      - زوجۂ مقتدی عباسی
    - ارسلان خاتون خدیجہ زوجہ قائم بامر اللہ عباسی
- یونس
- موسیٰ ارسلان عرف بیغو کلا (حاکم سیستان و ہرات و قہستان)
  - قتلمش (سلاجقہ روم کا مورث اعلیٰ اور حاکم گرگان و دامغان)

محمود غزنوی کی طلب پر یہ لوگ بخارا میں آباد ہوئے تھے مگر ان کی روز افزوں قوت

---

[1] ایشیائے کوچک مراد ہے۔ ۱۲

دیکھ کے محمود کو کھٹکا پیدا ہو گیا اور اسرائیل کو قلعہ کالنجر میں قید کر دیا جہاں وہ سات برس میں تڑپ تڑپ کے مرگیا۔ آل سلجوق کو اس خون ناحق کے انتقام کا جوش ہوا اور موقع کے منتظر رہے۔ اُدھر محمود کی وفات کے بعد خانہ جنگیاں شروع ہو گئیں اِدھر **طغرل** نے اس کمزوری کا فائدہ اُٹھایا اور محرم ۴۲۹ھ میں مستقل بادشاہ بنکے مرو اور **نیشاپور** میں اپنا نام خطبہ میں پڑھوا دیا۔ اور رفتہ رفتہ طبرستان و سیستان۔ ہرات۔ زنجان۔ کرمان وغیرہ فتح کر کے ایک وسیع سلطنت قائم کر لی بلکہ مودود غزنوی کو بھی خراسان میں شکست فاش دیدی۔ پھر یہ تمام مفتوحات اہل خاندان پر تقسیم کر کے خود پہلا سلطان آل سلجوق کا بنا اور خلیفہ قائم عباسی سے اجازت سلطنت حاصل کرنے کے لئے بغداد میں بڑے شان و شوکت سے داخل ہوا جہاں دربار خلافت سے **سلطان المشرق والمغرب** کا خطاب پایا اور تقریباً ۲۴ سال حکومت کر کے ۴۵۵ھ میں انتقال کیا۔

طغرل

طغرل کے بعد اس کا بھتیجا **الپ ارسلان** وارث سلطنت ہوا اگرچہ **عمید الملک** وزیر نے چاہا کہ **سلیمان** کو تخت پر بٹھائے مگر یہ حوصلہ عمید کے حق میں مہلک ثابت ہوا اور نہایت بری طرح قتل کیا گیا۔ الپ ارسلان کا وزیر **نظام الملک** طوسی اپنی قابلیت خداداد سے انتظام سلطنت میں کامیاب ہوا اور ترویج علوم میں بڑی کوشش کی۔ مدرسہ نظامیہ بغداد اسی کی یادگار رہے اور **سیاست نامہ** سی نادر کتاب اسی کے دماغ کا نتیجہ ہے۔ متعصب شافعی ہونیکی وجہ سے اشاعرہ اور شیعوں سے متنفر تھا خصوصاً فرقہ باطنیہ کا دشمن جانی ہو گیا تھا اگرچہ قصوں میں مشہور ہے کہ حسن بن صباح سرگروہ باطنیہ اس کا ہمدرس رہ چکا تھا۔ مگر ہمدرسی اور ہمدردی امور سلطنت میں لازم و ملزوم نہیں ہوسکتے۔ امام غزالی کا عروج اسی کے عصر میں ہوا اور معقولات کی تعلیم کا خصوصیت کے ساتھ

الپ ارسلان

چرچا ہوگیا۔ الپ ارسلان کی سلطنت کا زمانہ صرف نو برس ہے مگر اس عرصے میں بہت سے کارنامے ظاہر ہوئے۔ خلفائے بنی فاطمہ کا اقتدار افریقہ میں جبل الطارق کے حدود سے لیکے مصر تک تھا اور ایشیائے کوچک سے مکہ معظمہ و مدینہ منورہ تک انکا اثر حرمین شریفین اور حلب سے اس نے مٹا دیا اور دیو جانس قیصر روم کو بھی ایک جنگ میں قید کر لیا مگر آخر میں اپنا باجگذار بناکے جان بخشی کر دی۔ ۴۶۵ھ میں دریائے سیحون کے اُس پار ترکوں سے ایک جنگ عظیم میں مصروف ہوا۔ وہاں ایک شخص نے بھرے دربار میں سلطان کو زخمی کیا یہ زخم مہلک ثابت ہوا اور چند روز کے بعد انتقال کر گیا اور مرو میں دفن کیا گیا۔ ایک شاعر نے کہا ہے :-

سر الپ ارسلاں دیدی ز رفعت رفتہ بر گردوں　　بہ مرو آتا بخاک اندر سر الپ ارسلاں بینی

ملک شاہ و نظام الملک

بعد ازاں **ملک شاہ** اُس کا بھتیجا سترہ برس کی عمر میں وارث سلطنت ہوا۔ اس کا ابتدائی زمانہ نہایت نازک تھا۔ علاوہ امرائے غزنین و سمرقند کے خود قاورت اسکے چچا نے بغاوت کی مگر نظام الملک کی حکمت عملی سے سب کے سب زیر ہوگئے عمر خیام نے اسی عہد میں عروج حاصل کیا اور رصد خانہ ملک شاہی اور زیچ ملک شاہی تیار کی جو علم ہندسہ کے بہترین کارنامے ہیں۔ **ابو طاہر خاتونی** نے مناقب الشعرا اسی عہد میں لکھی جو اب نایاب ہے۔ ملک شاہ دو مرتبہ اپنی عہد حکومت میں بغداد گیا اور خلیفۂ وقت نے بیحد عزت کی۔ سرحد چین سے عدن تک اور کاشغر و ماوراءالنہر سے بلاد روم تک اس کی حکومت کا ڈنکا بجتا تھا اور حق یہی ہے کہ اتنی وسیع سلطنت آل سلجوق کو کبھی نصیب نہ ہوئی۔ آخر عہد میں ترکان خاتون کے بھڑکانے سے ملک شاہ کو نظام الملک سے عداوت ہوگئی اور اُسے معزول کرکے ابو الغنائم تاج الملک کو وزیر کیا۔ نظام الملک کو اس ناقدری پر افسردہ خاطری پیدا ہوگئی اور تھوڑے ہی عرصے کے بعد رمضان ۴۸۵ھ میں بمقام نہاوند مقتول ہوا اور چالیس روز کے بعد

ملک شاہ نے بھی انتقال کیا۔ نظام الملک کی معزولی پر امیر معزی نے کہا ہے:۔

نشناخت ملک سعادت افسر خویش — درنقیب وزیر غدیست گر خویش
بگماشت برائے تاج بر لشکر خویش — تا در سر تاج کرد تاج سر خویش

ملک شاہ کے انتقال کے بعد آل سلجوق کی عظمت پر انقلاب آگیا۔ بڑا بیٹا برکیارق تیرہ سال کی عمر میں بمقام رَے تخت نشین کیا گیا اور سب سے چھوٹے لڑکے محمود کو چار سال کی عمر میں اُس کی ماں ترکان خاتون نے خلیفہ مقتدی باللہ عباسی کے استصواب سے اور ابوالغنائم تاج الملک وغیرہ کی مدد سے اصفہان میں بادشاہ بنایا اور برکیارق سے بغاوت کی مگر انجام کار میں شکست نصیب ہوئی لیکن تتش اُس کا چچا بطائف الحیل برکیارق کو لے آیا اور اُسے کوشنک میدان میں قید کرکے آنکھیں نکلوا لینے کا ارادہ کیا۔ قضائے کار محمود کے چیچک نکل آئی اور ہلاک ہو گیا اور برکیارق کی شاہی تسلیم کرلی پڑی جب برکیارق کا پورا تسلط ہو گیا تو اُس نے اپنے بھائی سنجر کو حاکم خراسان مقرر کیا اور خود عراق واپس آیا۔ یہاں اُسے اپنے دوسرے بھائی محمد سے مقابلہ کرنا پڑا اور چند لڑائیوں کے بعد دونوں میں صلح ہو گئی۔ بالآخر برکیارق نے اپنے شیر خوار فرزند ملک شاہ ثانی کو ولیعہد مقرر کرکے انتقال کیا۔

غیاث الدین محمد بن ملک شاہ

اب محمد بن ملک شاہ کی بن آئی اور بچے کو معزول کرکے آنکھیں نکلوا لیں اور خود مستقل بادشاہ ہو گیا۔ اسکی عہد سلطنت کا کوئی واقعہ سوائے استیصال ملاحدہ[۱۵] کے نہیں اور تیرہ سال کی سلطنت یوں ہی ختم ہو گئی پھر اُس کا بیٹا محمد

---

[۱۵] فرقہ اسمٰعیلیہ کا نام تعصب سے رکھا گیا تھا حسن بن صباح و عبدالملک عطاش و محمد عطاش اسکے سرگروہوں میں مشہور رہیں۔ دو سو برس تک ایران کے بڑے بڑے مضبوط قلعے انکے قبضے میں رہے جو تاریخ میں قلاع ملاحدہ کہلاتے ہیں اور سلاطین وقت کو انہیں زحمتیں دیں۔

چودہ برس کی عمر میں تخت نشین ہوا مگر حماقت میں آکے اپنے چچا سنجر سے لڑ گیا نتیجہ اس جنگ کا بجز شکست کے اور کیا ہو سکتا تھا مگر سنجر نے اسکی خطا معاف کر دی اور عراق کا حاکم کر دیا جہاں چودہ برس اُس نے حکومت کی اور آخر میں سلطان سنجر کا داماد بھی ہو گیا۔

سنجر

۵۱۱ھ میں سلطان سنجر کی سلطنت کا اعلان بغداد میں ہو گیا اور باوجود زحمت اور کوفت کے اکتالیس سال سلطنت کی علوم و فنون کی ترویج کے لئے یہ عہد تاریخ عجم میں یادگار رہے۔ امیر معزی۔ ارزقی۔ انوری۔ سوزنی وغیرہ شعرائے جلیل القدر اس دور کی یادگار ہیں۔ طوسی و طبری۔ نسفی و شہرستانی وغیرہ کے مصنفات عربی میں اسی عہد میں شائع ہوئے۔ مقامات حمیدی۔ تاریخ بیہقی وغیرہ اسی عہد میں تصنیف ہوئیں غرضکہ فارسی لٹریچر میں اس کثرت سے کتابیں شائع ہوئیں اور زبان فارسی بھی ایسی سلیس و شستہ ہو گئی کہ شاید و باید۔ خاص وجہ اس ترقی کی یہ بھی تھی کہ آل سلجوق کا پائے تخت ایران میں تھا اور غزنویہ و سامانیہ سلاطین کا مستقر دولت ایران سے باہر رہا لہذا اس عہد میں خاص ایرانی نژاد لوگوں کو ترقی کا موقع ملا اور زبان کی اچھی خاصی اصلاح ہو گئی۔ سلطان سنجر نے غزنویوں کو عروج دیا اور بہرام شاہ کو شاہ غزنین بنایا جسکی علم دوستی کی تاریخ فرشتہ میں تعریف ہے اور تصوف کی شاعری کی بنیاد اسی کے عہد میں پڑی۔ خوارزم شاہیوں میں سلطان اتسز اسی عہد میں خود مختار ہو گیا اور سنجر کو بار بار مقابلہ کرنا پڑا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت سلجوقیہ میں کمزوری پیدا ہو گئی۔ پھر ترکوں نے سنجر کو اس طرح گھیرا کہ برائے نام بادشاہ رہ گیا اور مرو۔ سرخس۔ بیہق اور نیشاپور قبضے سے بالکل نکل گئے۔ آخر ۵۵۲ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔

سنجر کے بعد سے تاریخ عجم کا خاکہ بدل گیا اور مختلف شہروں میں چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم ہو گئیں اور آل سلجوق کی عظمت برائے نام رہ گئی۔

اسی عہد میں سلاجقہ کرمان کی خود مختار سلطنت قائم ہوئی اور توران شاہ و ایران شاہ و ارسلان شاہ و مغیث الدین محمد شاہ علی الترتیب بادشاہ ہوئے۔

معاصرین

خلافت عباسیہ میں بھی کمزوری پیدا ہو گئی مقتدی باللہ کا انتقال ہوا بعد ازاں مستظہر باللہ کا ۲۳ سال خلافت کرنے کے بعد خاتمہ ہوا۔ پھر مسترشد اور راشد اسمٰعیلیوں کے ہاتھ سے اور بعض کہتے ہیں کہ سنجر کے اشارے سے قتل ہوئے کیونکہ آل سلجوق اس زمانے میں خلیفہ گری کا کام کر رہے تھے۔ سلاطین غزنویہ کا خاتمہ علاء الدین حسن غوری کے ہاتھوں ہو گیا اور بہرام شاہ ان کے ہاتھوں بُری طرح مارا گیا۔ خوارزم شاہی جو ملک شاہ کے ساقی انوشتگین کی اولاد میں تھے اور اس گھر سے سلطنت پائے ہوئے تھے اب بالکل خود مختار ہو گئے۔ اتسز کے واقعات لکھے جا چکے۔ شروان میں بھی ایک مستقل سلطنت تھی۔ یہ سب کچھ سہی مگر ہر بادشاہ علوم و فنون کی ترویج میں کوشاں تھا اور بکثرت شعرا و مصنفین کی تربیت اس عہد میں ہوئی اب ہم بعض مصنفین و شعرا کے حالات لکھتے ہیں:۔

سیاست نامہ نظام الملک

اس زمانے کے لٹریچر میں سیاست نامہ نظام الملک کا ذکر سب سے پہلے آنا چاہئے جس کا دوسرا نام سیر الملوک ہے پچاس بابوں میں ہر قسم کے نظم و نسق کے سلطنت کا بیان آگیا ہے اور حسن و قبح ہر شعبہ کا نہایت خوش اسلوبی سے مبرہن کیا گیا ہے اور اکثر روایات تاریخیہ بھی مذکور ہیں جو مورخین کے لئے خاص طور سے قابل وقعت ہیں۔ عبارت سلیس نثر میں ہے اور بیفائدہ صنائع و بدائع میں جکڑی نہیں گئی ہے سنہ ۴۸۴ھ کی نثر کا بہترین نمونہ اور اس زمانے کے مذہبی اور سیاسی خیالات کا عمدہ مرقع ہے۔

ناصر خسرو

امیر ناصر خسرو علوی بھی اسی عہد کے گل سر سبد ہیں۔ سال ولادت سنہ ۳۹۴ھ ہے۔ ۹ برس کی عمر میں قرآن اور احادیث کثیرہ کو حفظ کر لیا اور ۲۲ برس کی عمر تک طلب علم میں وقت صرف کر کے ریاضیات و الہیات میں کمال حاصل کیا اور فقہ و تفسیر وغیرہ میں بھی اچھی خاصی مہارت پیدا کر لی بلکہ تورات و انجیل کا درس بھی ختم کیا۔ پھر چھ سال ریاضت میں صرف کیے اور چالیس برس کی عمر میں تسخیرات و نیرنجات وغیرہ میں دسترس پیدا کیا۔ تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ بکثرت امصار و بلاد کے سفر کیے اور حرمین شریفین اور بیت المقدس کی زیارت سے بھی مشرف ہوئے۔ مستنصر باللہ فاطمی کے یہاں مصر میں تقریباً تین سال قیام کیا اور وہاں سے واپس آ کے اسمٰعیلیت کی ترویج میں مصروف ہو گئے[۱] بلکہ ایک تفسیر قرآن ملاحدہ کے رنگ میں لکھی جس سے بہت بدنام ہوئے۔ آخر سنہ ۵۳۴ھ میں ۱۴۰ برس کی عمر پا کر انتقال کیا۔ انکے مصنفات میں سفرنامہ خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ عبارت میں وہی سادگی اور روانی ہے جو قدما میں رائج تھی مثلاً لکھتے ہیں:۔

بر سر آں چاہیست کہ نوشادر ازاں حاصل شود و گویند
کہ بہت نیز۔ مردم پوست گاؤمی برند و پر نوشادر می کنند و
از سر گرہ بغلطانند کہ براہ نتواں فرود آوردن۔

یہ نمونہ سنہ ۴۴۵ھ کی نثر کا ہے۔ امیر موصوف نے ایک کتاب کنز الحقائق بھی نثر میں لکھی ہے۔ سوا نظم میں روشنائی نامہ اور سعادت نامہ ہے اور ایک دیوان تقریباً بارہ ہزار بیت کا۔ دولت شاہ وغیرہ نے قانون اعظم و

---

[۱] صاحب مجمع الفصحا انھیں اثنا عشری سمجھتے ہیں۔

دستورِ اعظم وغیرہ کو بھی فہرست مصنفات میں ذکر کیا ہے۔ قصیدہ گوئی میں وہی انداز ہے جو قدما کا تھا۔ واقعہ نگاری کا رنگ زیادہ ہے اور تخییل بقدر مناسب۔ ان اشعار میں اپنے اقوال فلسفیہ بھی درج کئے ہیں مثلاً انسان کا فاعل مختار ہونا۔ تاویل کی طرف توجہ ظواہر سے قطع نظر۔ زہد کو بغیر علم و عقل کے بیکار سمجھنا۔ خدا کو حدوث و قدم سے بلند تر ماننا۔ انسان کا عالم صغیر ہونا۔ دنیا کا باوجود عدم انتہائے زمانہ و مکان حادث ہونا۔ اجرام سماوی کا حوادث عالم کے لئے موثر ہونا وغیرہ وغیرہ۔ خلفائے فاطمیین کی مدح اور اہل بیت رسول کی حمایت اکثر کی ہے اور خلفائے بنی عباس سے اختلاف ظاہر کیا ہے۔ مثلاً کہا ہے:۔

چوں شب ادین سیہ و تیرہ شود فاطمیان صبح مشہور و مہ و زہرہ و شمس و قمر اند

اسی قصیدے کے ابتدائی اشعار فلسفیانہ رنگ میں ہیں:۔

ایں رفیقاں کہ بریں گنبد پیروزہ درند	گرچہ زیرند گہی جملہ بمعنی زبرند
نامشاں زی تو ستارہ است ولیکن سوئے عقل	پیشکاران و رقیبانِ قضا و قدرند
سوئے مازاں نگرند آری کز جوہر شاں	خرد و جان سخنگوی بما در اثرند
اندریں جائے گیاہان زبانکار بسے است	زیں چراگاہ از برا حکما بر حذرند

ازیں روئے ۱۲ ؎ نگہبانان ۱۲

غالباً امیر صاحب پہلے شخص ہیں جنھوں نے فلسفہ کو شعر میں داخل کیا مگر کسیقدر روکھا سوکھا کیونکہ محض حکایت اقوال سے لطف نہیں آتا تاوقتیکہ تخییل اپنا رنگ نہ چڑھا وے۔ موعظت کے میدان میں یہ سادگی البتہ موثر ہوتی ہے مثلاً:۔

زاد برگیر و سبک باش مکن جائے قرار خانہ را کہ مقیمانش ہمہ در سفر اند

سلہ ہائے مختفی کا ساقط کرنا متقدمین میں رائج تھا۔

فلسفہ کی تعریف :۔

حکمت آبیست کجا مردہ بدو زندہ شود ۔ حکما بر لب این آب مبارک شجر اند

تخلیص نہایت خوب ہے :۔

شجر حکمت پیغمبرِ ما بود ہمی ۔ ہر یک از حکمت او نیز درختی ببر اند

پسرانِ علیؑ امروز مر آن را بیبرا ۔ پسرانند چو مر دختر او را پسر اند

پسرانِ علیؑ آنہا کہ امامان حق اند ۔ بجلالت بجہان در چو پدر مشتہر اند الخ

دیکھو! پرانی زبان کا اثر باقی ہے ۔ زی ۔ ازیرا ۔ مر ۔ ہمی ۔ کجا وغیرہ بے تکلف مستعمل ہیں اور ترکیبوں میں بھی تراش خراش نہیں ہوئی ہے ۔

شب تاریک کا ہول اور اپنے جاگنے کا حال نہایت زور میں نظم کرتا ہے :۔

شبے تارے چو بے ساحل وماں پر قیر دریائے

(پُرجوش ۱۲)

فلک چون پر ز نسرین برگ ۔ قیر اندودہ صحرائے

(مراد از ستارگان) (از جہتہ تاریکی)

زیانہ ترخ پہ قطران شستہ واز رفتن برآسودہ

(زیرا کہ سیاہ است ۱۲) (حرکت سے رکا ہوا)

کہ گوئی نا فریدستش خدائے فرد فردائے

(اس وجہ سے رات بہت طولانی ہوگئی ۱۲)

ندیدار صعبت تاریکی و تنگی اندر ریں جہان

(شدت ۱۲)

نہ چشم تا بمن شخصے نہ جان خفتہ ردیائے (فضائے عالم ۱۲) (مبالغہ مقبول ۱۲)

مرا چون چشم دل زین خلق چشم من ببوسے شب

چو اندر لشکرے خفتہ یکے بیدار دانائے

اگر شرّ اتو ضرّ ا در تدبرستی ۔ نکو بنگر

(راحت ۱۲ مصیبت ۱۲)

ستارہ ندیر ابر اند ۔ چو شرّ ا زیر ضرّ ائے

---

[1] مشہور ہے کہ تصنیف کو نا الہر میں فصاحت شروع ہو گیا۔

دیکھو بالکل قاآنی کا رنگ ہے۔ تشبیہات کا زور اور بڑھتا جاتا ہے:۔

چو در تاریکی چہ یوسف منور مشتری در شب ۔۔۔ درو زہرہ بماند دیدہ حیران چون زلیخائے
کنیسہ مریم استی چرخ گفتی پُرز گوہر ہا ۔۔۔ نجوم ایدون چو رہبانان ثریا چون چلیپائے

پورا قصیدہ جلالت اور شان میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہی رنگ بہار وغیرہ کے نظم کرنے میں ہے اور یہی مداحی میں بھی غالب ہے۔ ایک قصیدے میں غزنویہ زیاریہ اور سلجوقیہ وغیرہ کے عروج و زوال کو بھی نہایت پُراثر موعظہ کے پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ ان کا کلام بیجا خوشامد سے پاک ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ پہلے قادر الکلام شاعر ہیں جنھوں نے اپنی شاعری کو اظہار عقائد و خیالات کے لئے محدود کر دیا۔ انکا تخلص کہیں حجت ہے کہیں ناصر۔

امیر ابو سعید ابو الخیر

امیر ابو سعید بن ابو الخیر۔ وطن مہنہ۔ چودہ برس جذب کے عالم میں رہ کے سلوک اختیار کیا اور پھر ہمیشہ سالک رہے۔ سال وفات ۴۴۰ھ۔ شیخ الرئیس بو علی سینا کے ہمعصر ہیں۔ امیر صاحب نے ابن سینا کے بارے میں کہا تھا "جو میں دیکھتا ہوں وہ جانتا ہے" اور شیخ نے امیر صاحب کے متعلق کہا "جو میں جانتا ہوں وہ دیکھتا ہے" یعنے شیخ کے لئے مرتبہ علم الیقین کا تھا اور امیر صاحب کے لئے عین الیقین کا کیونکہ فلسفہ بھی حقائق اشیا کو جاننا چاہتا ہے اور تصوف بھی مگر فلسفہ حواس خمسہ ظاہری سے بیشتر کام لیتا ہے اور تصوف اس سے بالاتر جا کے روحانی ترقی کرتا ہے اور برای العین حقائق کا مشاہدہ کرتا ہے۔ یہی فرق علم استدلالی اور علم شہودی میں ہے۔ غرض امیر ابو سعید پہلے شخص ہیں جنھوں نے مقامات تصوف رباعیوں میں نظم کئے ہیں مگر رنگ وہی ناصر خسرو کا ہے یعنے مسائل علمیہ کو بغیر رنگ آمیزی کے بیان کر دینا۔ اختلاف مذاہب کی گتھی سلجھاتے ہیں اور معشوق حقیقی کو

مخاطب کرتے ہیں :-

راہِ تو بہر قدم کہ پویند خوش است　　وصلِ تو بہر سبب کہ جویند خوش است
روے تو بہر دیدہ کہ بینند نکوست　　نامِ تو بہر زبان کہ گویند خوش است

عشقِ الٰہی کا مرتبہ یوں ظاہر کرتے ہیں :-

غازی بہ رہِ شہادت اندر تگ و پوست
غافل کہ شہیدِ عشق فاضل تر ازوست
در روزِ قیامت ایں بداں کے ماند
کیں کشتۂ دشمن است و آں کشتۂ دوست

بابا طاہر عریان

بابا طاہر عریان (غالباً ۴۱۰ھ میں انتقال ہوا) سلطان طغرل جب ہمدان میں داخل ہوا تو ایک مقام پر ان سے ملاقات ہوئی۔ بابا طاہر نے کہا "اے ترک! خلقِ خدا کے ساتھ کیا کریگا؟" جواب دیا "جو آپ کا حکم ہو" کہا "نہیں وہ کر جو خدا کا حکم ہے۔ ان اللہ یامر بالعدل والاحسان۔ احسان کر اور عدل کر" سلطان رو دیا اور کہا کہ ایسا ہی کرونگا۔ ان کی زندگی حالتِ جذب میں گذری۔ کلام اپنے وطن کی زبان میں ہے۔ جو عروض کے اعتبار سے قطعات میں داخل ہے۔ مقاماتِ صوفیہ کا حال اور حالتِ جذب میں جوش و خروش قلب کی تصویر ہے :-

مگر شیر و پلنگی اے دل اے دل　　بما دائم بجنگی اے دل اے دل
اگر دستم فتی (افتی ۱۲) خونت بریزم　　دِوِینم (ببینم ۱۲) تا چہ رنگی اے دل اے دل

ولہ

دلم - واشم (بشوم ای بروم ۱۲) ازیں عالم بدر شم (باشم ۱۲، بشوم ۱۲)　　دلم از چین و ما چین دیر تر شم
دلم از حاجیان حج بپرسم　　کہ اے دیری (است ۱۲) بسے یا دیر تر شم (فرصت ۱۲)

حکیم سنائی

حکیم سنائی۔ ابو المجد مجد آدم غزنوی (بعضے بلخی کہتے ہیں) ابتدا میں قصیدہ گو تھے اور بہرام شاہ غزنوی کے مداح۔ ایک دن شراب خانہ کیطرف تو دیکھا کہ ایک دیوانہ لائے خوار نام شراب مانگتا ہے اور یہ کہتا ہے "بہرام شاہ کے اندھے پن کا صدقہ! میرا پیالہ بھر دے" ساقی نے کہا کہ "یہ کیا؟ وہ تو بڑا عقلمند بادشاہ ہے" کہا کہ "کمبخت اپنے ملک کا انتظام کر نہیں سکتا اور ہندوستان فتح کرنے چلا ہے" پھر کہا "اچھا! سنائی شاعر کے اندھے پن کا صدقہ میرا جام بھر دے" ساقی نے پھر کہا "ارے وہ بڑا عمدہ آدمی ہے اور خوشگو شاعر" کہا کہ "واہ! وہ تو پکا احمق ہے۔ چند بے سر و پا باتیں طمع زر میں نظم کرتا ہے اور ایک بیوقوف کے سامنے کھڑے ہو کے پڑھ دیتا ہے۔ اگر قیامت کے دن سوال کیا گیا کہ کیا تجھے اسی ہرزہ گوئی کے لئے پیدا کیا تھا تو خدا جانے کیا جواب دیگا" یہ سن کر سنائی پر رقت طاری ہوئی اور جذب کی حالت میں دنیا کو چھوڑ دیا۔ حج کرنے سر و پا برہنہ گئے۔ پھر غزنین واپس آئے اور گوشہ نشین ہو گئے۔ سنہ ۵۲۵ھ[1] میں انتقال کیا۔ تصانیف میں ایک دیوان قصائد اور سات مثنویاں ہیں۔ حدیقہ۔ سیر العباد۔ طریق التحقیق۔ عشق نامہ۔ عقل نامہ۔ بہروز بہرام۔ کارنامۂ بلخ۔

قصائد میں پختگی اور برجستگی اور صفائی ویسی ہی ہے جیسے قدما کے کلام کے لئے مخصوص ہے۔ اپنے معاصرین میں پایۂ امتیاز ان کا بھی بلند ہے۔ ایک معمولی واقعہ کے لئے منطقیانہ استدلال پیدا کرنا یا قوت تخیل سے اس میں رنگ بھر دینا انکے کلام میں خاص طور سے نمایاں ہے۔ اخلاقی شاعری اور صوفیانہ شاعری دونوں کو اسی وجہ سے انھوں نے خوش مزہ کر دیا ہے۔

---

[1] بعض سال وفات ۵۴۵ھ کہتے ہیں اور بعض سنہ ۵۲۹ھ۔

مثلاً شراب نوشی کو منع کرتے ہیں :۔

نکند عاقل مستی۔ نخورد دانا مَے　　　ننہد مردم ہشیار سوئے مستی پَے
گر کنی بخشش۔ گویند کہ مَے کرد نہ او　　　ور کنی عربدہ گویند کہ او کرد نہ مَے

دیکھو کس خوبی سے سمجھایا ہے کہ مستی کے عالم میں اگر اچھائی کرو تو مست کی بات کا اعتبار کیا۔ وہ تو جو کچھ کیا شراب نے کیا اور اگر بُرائی کرو تو خمیازہ بھگتو۔ گناہ کی معذرت سنو :۔

بحرص ار شربتے خوردم۔ مگیر از من کہ بد کردم
بیاباں بود و تابستان و آب سرد و استسقا

ہائے اُستاد مرحوم نے کیا خوب اسی مطلب کو ادا کیا ہے :۔

فرشتو! رحمت حق سے گنہ میرے بتا دینا
مگر اتنا بھی کہہ دینا یہ باتیں تھیں جوانی کی

جوش و سرمستی اتنی ہے کہ مولانا روم اور حافظ شیراز کی ایسے مست شعرا اسی میخانے کے بادہ خوار نظر آتے ہیں۔ مولانا نے فرمایا ہے :۔

نیم جوشے کردہ ام من نیم خام　　　از حکیم غزنوی بشنو تمام

ثبوت میں چند اشعار ایک قصیدے کے نقل کئے جاتے ہیں :۔

برگ بے برگے نداری لاف درویشی مزن
رُخ چو عیاراں میارا جاں چو نامرداں مکن
یا برو ہمچوں زنان رنگے و بوئے پیش گیر
یا چو مرداں اندر آؤ گوے در میداں فگن
سر برآر از گلشن تحقیق تا در کوے دین
کشتگان زندہ بینی انجمن در انجمن

در یکے صف کشتگاں بینی بہ تیغے ہچوں حسینؑ

در دگر صف خستگاں بینی بزہرے چوں حسنؑ

راہ خدا میں مصائب و آلام کی شدت جتنی بڑھتی جاتی ہے اُتنی ہی روحانی قوت ترقی کرتی ہے۔ قوت تخییل نے موجودات خارجی میں تمثیل ڈھونڈھ لی ہے:۔

درد دیں خود بوالعجب دردا ست کاندر وے چو شمع

چوں شوی بیمار بہتر گردی از گردن زدن

ریاضت کی ضرورت بیان کرتے ہیں:۔

سالہا باید کہ تا یک سنگ اصلی ز آفتاب   لعل گردد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن

دیکھو کس رنگ میں فیض الٰہی کو آفتاب سے تشبیہ دی ہے اور قلب انسان کو سنگ سے اور کیا نتیجہ نکالا ہے۔ غرض اختصار مانع ہے ورنہ حکیم سنائی کا کلام معرفت اور معنویت سے لبریز ہے۔ حُبّ آل محمدؐ اس قدر دل میں ہے کہ دوسروں کو ان کے برابر دیکھنا ہی نہیں چاہتے۔ حدیقہ اور اکسیر العباد ایسی نایاب کتابوں سے لوگ ناراض ہوگئے کیونکہ ان میں بنی امیہ پر طعن کئے گئے تھے اور علمائے ریاکار کی قلعی کھول دی گئی تھی:۔

تن شاں زیرو دل زبر دیدم   قبلہ شاں روی بکد گر دیدم

مردماں دیدم اندرو جمعے   روشن و تیرہ ذات چوں شمعے

یعنے دوسرے کے لئے باعث ہدایت اور خود سیاہ قلب۔

اصل خود را فدائے خود کردہ   خویشتن را غذائے خود کردہ

باد و معشوقہ تا زمی کردند   بدو قبلہ نماز می کردند

یعنے دنیا و دین دونوں کو پوجتے ہیں۔ اہل رضا و توحید کا حال لکھا ہے:۔

صفِ دیگر کہ خاص تر بودند   بے دل و دست و پا و سر بودند

خوردہ یک بادہ بر رخِ ساقی — ہرچہ باقی است کردہ درباقی
فارغ از صورتِ مراد ہمہ — برترہ از کثرتِ تضاد ہمہ

حقیقت یہ ہے کہ حکیم غزنوی اِس اساس کے موسس ہیں۔ خود کو بھی احساس ہے:۔

"کس نگفت اینچنیں سخن بجہاں — ور کسی گفت۔ گو بیار و بخواں!"
زیں نمط ہرچہ درجہاں سخن است — گر یکے ور ہزار آنِ من است

عمر خیام

عمر خیام بن ابراہیم نیشاپوری۔ مشہور ہے کہ طلب علم کے زمانے میں اسکے ہمدرس نظام الملک[1] اور حسن بن صباح تھے۔ تینوں میں صلاح ہوئی کہ جو کوئی ہم میں سے بڑے منصب پر پہونچے اپنے ساتھیوں کو بھی بڑے مرتبے عطا کرے۔ اتفاق روزگار کہ نظام الملک کو وزارت نصیب ہوئی اور حسب معاہدہ دونوں ساتھیوں کے ساتھ سلوک کرنا چاہا مگر حسن بن صباح کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے البتہ عمر خیام کو (حسب روایت آتشکدہ) نیشاپور میں جاگیر عطا کی۔ خیام کی حیثیت اگرچہ معمولی جاگیردار کی تھی مگر علم و فضل کی بدولت نہایت محترم تھا۔ سلاطین وقت اسے اپنے برابر بٹھاتے تھے اور علماے اسلام فلسفہ وحکمت میں ابن سینا کا ہمسر اور فقہ و حدیث میں "امام خراسان" اور "علامہ زمان"[2] سمجھتے تھے۔ ریاضیات میں رصدخانہ ملک شاہی (۴۶۷ھ) کی بنا اور زیچ ملک شاہی یادگار ہیں۔ تفسیر و قرات میں بھی بلند پایگی کے ثبوت تاریخ الحکما شہرزوری وغیرہ میں ملتے ہیں۔ فلسفیانہ مذاق کیوجہ سے علماے عصر کے قلوب

---

[1] پروفیسر براؤن کا خیال ہے کہ نوشیرواں بن خالد وزیر آل سلجوق ان کا ہمدرس ہوگا کیونکہ نظام الملک اور ان دونوں کی عمر میں بہت تفاوت ہے ۱۲۔

[2] تاریخ الحکماے قفطی۔

خیام سے صاف نہ تھے اور طبیعیات اور حقیقت وجود اور مسئلہ کون و فساد پر رسائل تصنیف کرنے سے اور بھی اس کا رنگ مذہبی عام عقائد سے جدا نظر آتا تھا۔ وفات کا واقعہ بھی عجیب ہے۔ ایک شب کو ابن سینا کی کتاب الشفا میں وحدت و کثرت کی بحث دیکھتے دیکھتے اُٹھا اور عشا کی نماز پڑھی۔ سجدے میں جا کے کہا کہ "خداوندا۔ جتنا ممکن تھا تجھے پہچانا۔ اب میری مغفرت کر دے!" یہی الفاظ زبان پر جاری تھے کہ دم نکل گیا۔ سال وفات سنہ ۵۱۷ھ[1] ہے۔ قبر بھی ایسی جگہ اتفاقاً بنی کہ سرہانے زرد آلو اور امرود کے درخت تھے اور ہر سال اُس پر پھول برسا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ خیام اسکی بھی پیشین گوئی کر گیا تھا۔

تعجب ہے کہ باوجود اس فضل و کمال کے عمر خیام کا نام اگر روشن ہوا تو رباعیوں کی وجہ سے۔ یہ رباعیاں بیشتر یورپ کی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں خصوصاً فٹز جرلڈ کا انگریزی میں منظوم ترجمہ یادگار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ چار مصرعوں میں جس لطف سے اپنے خیالات ادا کر دئے ہیں اُس کی نظیر ملنا دشوار ہے۔ اگرچہ متداول مجموعۂ رباعیات میں انوری۔ عنصری۔ ابن سینا۔ عطار۔ محقق طوسی وغیرہ تقریباً ڈیڑھ سو سال کے مختلف شعرا کے کلام اسطرح داخل ہو گئے ہیں کہ امتیاز کرنا دشوار ہے۔ پھر بھی جو کچھ عمر خیام کا خالص کلام سمجھا گیا ہے حسن اسلوب و عنوان ادا میں دنیائے شاعری کا ایک روشن چراغ ہے جو بجھائے نہ بجھے گا۔ تقریباً آدھی رباعیاں عیش پسندی کیطرف مائل کرتی ہیں اور اسی عالم فانی کے لذات سے بہرہ اندوز ہونے کو غنیمت جانتے ہیں جنکی وجہ سے عمر خیام کو ایشیا کا ایپکورس سمجھا گیا ہے حالانکہ نہ ایپکورس کا فلسفہ اسی قدر رکھتا نہ عمر خیام کا۔ ہاں اُن دونوں کے مختلف فلسفوں کا مختلف اعتبارات اور وجوہ سے ایک جزو عیش پسندی کو بھی

[1] چہار مقالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۵۳۰ھ سے پیشتر وفات ہو چکی ہوگی۔

، زمانے میں خود مختار سلطنتوں کا زور تھا اور لوگوں کی خوشحالی
لیکن وقت کے اشاروں پر تھی۔ حکیمانہ مذاق کا آدمی ایسے
یحوں کی قدر کریگا اور جو اچھائی اپنے یا دوسروں کے لئے
ے۔ اسی امر کی طرف خیام کی ترغیب ہے اور چونکہ واقعی
سے اخلاقی قوت یا صوفیانہ روحانیت کے رنگ و بو سے
ب کو خالی سمجھا جاتا ہے ورنہ نظرِ انصاف حافظ وغیرہ کو اسی
ئی کرتے ہوئے دیکھتی ہے۔

خیام چاہتا ہے کہ آئندہ کی زندگی پر بھروسا نہ کیا جائے چاہے کتنی ہی
دلچسپ نظر آتی ہو۔ حور و قصور کو بھی موجودہ عیش کے مقابلہ میں بے اعتبار
سمجھتا ہے۔ بہشت و دوزخ کسی چیز کی پروا نہیں۔ دیکھو کس مستی کے
عالم میں اپنا خیال ادا کرتا ہے :-

مائیم خریدارِ مئے کہنہ و نو[۱] | وانگاہ فروشندۂ عالم بہ دو جو
گفتی کہ "پس از مرگ کجا خواہی رفت؟" | "مے پیش من آر و ہر کجا خواہی رو"

بے خودی کا عالم اور سیہ مستی کی حد دیکھو :-

من بے مئے ناب[۲] زیستن نتوانم | بے جام کشیدہ۔ بارِ تن نتوانم
من بندۂ آں دمم کہ ساقی گوید | "یک جامِ دگر بگیر و من نتوانم"

شوخی و ظرافت کا انداز بھی عجیب دلکش ہے۔ ایران میں رمضان مبارک کے
زمانے میں شراب فروشی کی بالکل ممانعت ہے اور رسمِ ملک یہ ہے کہ شرابخوار
اس ماہ میں شراب خواری ترک کر دیتے ہیں۔ خیام کہتا ہے :-

گویند کہ ماہ روزہ نزدیک رسید | من بعد بگردِ بادہ نتواں گردید[۳]
در آخرِ شعبان بخورم چنداں مے | کاندر رمضان مست بخفتم تا عید[۴]

---

[۱] [illegible]
[۲] خالص
[۳] بعد ازاں شراب کے قریب بھی آنا ممکن نہیں ۱۲
[۴] بخوابم ۱۲

جوا [illegible] سے اور رحم مل رہی ہے -

بے ثباتی دنیا کا جب نقشہ کھینچتا ہے تو عبرت ہوتی ہے۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ایک رند بلانوش[1] موجودات عالم پر ایسی معرفت کی نظر رکھتا ہے:۔

ایں کوزہ چو من عاشق زارے بودست — واندر طلب روئے نگارے بودست
ایں دستہ[2] کہ برگردن او می بینی — دستے است کہ برگردن یارے بودست

مغفرت طلبی کا انداز بھی نرالا ہے۔ اپنے گناہوں کا اقرار اور آمرزش پر باوجود اسکے اصرار کچھ عجب مزہ دیتا ہے۔ ہر رباعی میں ایک نئی دلیل پیش کر کے اپنے کو مستحق عفو ثابت کرتا ہے مثلاً:۔

ناکردہ گناہ درجہاں کیست بگو — واں کس کہ گنہ نکرد چوں زیست بگو
من بد کنم و تو بد مکافات دہی — پس فرق میان من و تو چیست بگو

اس سے زیادہ مضبوط دلیل اور پیش کرتا ہے:۔

من بندۂ عاصیم رضائے تو کجاست — تاریک دلم۔ نور صفائے تو کجاست
ما را تو بہشت اگر بہ طاعت بخشی — آں بیع بود لطف و عطائے تو کجاست

خیام جبر کا قائل ہے اور سمجھتا ہے کہ اپنے افعال ارادی میں بھی انسان فاعل مختار نہیں ہے:۔

سازندۂ کار مردہ و زندہ توئی — دارندۂ ایں چرخ پراگندہ توئی
من گرچہ بدم صاحب ایں بندہ توئی — کس را چہ گنہ چو آفرینندہ توئی

ہم کہہ آئے ہیں کہ فلسفہ کو حقائق اشیا دریافت کرنے کی کوشش ہے اور کامیاب انسانی زندگی وہی ہے جس میں انسانی آغاز و انجام پر نظر رکھ کے افعال و اعمال کئے جائیں۔ مسرت پرست عیش و عشرت دنیوی سے لذت

---

[1] شعر کے اعتبار سے لکھا ورنہ حقیقت میں وہ اس رنگ کا آدمی نہ تھا۔ بلکہ حکیمانہ رنگ کی جھلک اس کے ہر رنگ میں تھی [2] ستھا جو صراحیوں میں لگا ہوتا ہے۔

حاصل کرتے ہیں اور سعادت کے تلاش کرنے والے اُن حقائق سے اپنی زندگی کو مرتبط کرنا چاہتے ہیں جن سے ترقی کائنات وابستہ ہے۔ یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ خیام کا فلسفہ مسرت پرستی کا نہیں۔ وہ ہوا و ہوس سے دور بھاگتا ہے:-

گر از پے شہوت و ہوا خواہی رفت　　از من خبرت کہ بے نوا خواہی رفت
میں تجھے بتائے دیتا ہوں کہ انجام بخیر نہیں ۱۲-

بنگر چہ کسی و از کجا آمدۂ؟　　می داں کہ چہ میکنی؟ کجا خواہی رفت؟

لیکن فلسفیانہ جد و جہد کا سرحد حقیقت تک پہونچنا دشوار ہے کیونکہ حق الحقائق کا مقام عالم روحانیت ہے بلکہ شاید اس سے بھی بالاتر۔ آج ایک چیز کو علت العلل سمجھتے ہیں۔ کل اُسکے مافوق دوسری طاقت نظر آتی ہے۔ اِس وقت ایک مسئلہ ایک عنوان سے حل ہوتا ہے۔ دوسرے وقت وہی عنوان باطل نظر آتا ہے اور مسئلہ اُسی حالت ابہام میں آجاتا ہے۔ اسی وجہ سے لاعلمیت کا مسلک کامل فلسفیوں کے لئے منتہا ئے کمال ہے اور مایوسی کا پیش خیمہ۔ اہل مذہب اور ارباب معرفت کے یہاں لاعلمی کا مرتبہ اعلیٰ اور اتم ضرور ہے مگر وہاں اطمینان قلب ساتھ ساتھ ہے اور انکشافات عالیہ کی امید سے وابستہ ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے:-

فلسفی را ز حقیقت نتوانست کشود　　گشت راز دگر آں راز کہ افشا میکرد

خیام کا کلام کبھی فلسفیانہ رنگ کا ہے۔ کبھی اہل مذہب کے رنگ کا۔ خدا جانے حقیقت کیا تھی:-

آنہا کہ محیط فضل و آداب شدند　　در کشف وقیقہ شمع اصحاب شدند
رہ زیں شب تاریک نبردند بروں　　گفتند فسانۂ و در خواب شدند

[illegible] بیان کا اشتباہ [illegible] عقائد مسطورہ علیہ عبد آگیا گیا۔

اخلاقی رباعیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قناعت و توکل کی طرف بہت رغبت ہے اور ریاکاری سے بیحد نفرت۔ خیام نہیں چاہتا کہ کوئی ایسا منصب خالصاً لوجہ اللہ بھی قبول کیا جائے جو ریاکاروں کے ہاتھ سے خراب ہو چکا۔ اس سے گمنامی کی موت بہتر:۔

دررراہ چناں رو کہ سلامت نکنند　　　با خلق چناں زی کہ قیامت نکنند
درمسجد اگر روی چناں رو کہ ترا　　　در پیش نخوانند و امامت نکنند

شیخ ابو اسمٰعیل عبداللہ انصاری ہروی کا نام بھی اسی عہد کے کاملوں میں لیا جاتا ہے۔ منازل السائرین اور انوار التحقیق نثر میں اور چند رباعیاں نظم میں یادگار ہیں۔ انکے علاوہ کتاب النصیحت۔ الٰہی نامہ۔ زاد العارفین۔ کتاب الاسرار۔ طبقات صوفیہ اور شمس المجالس (یوسف و زلیخا نثر) بھی انھیں سے منسوب ہیں۔

ابو اسمٰعیل انصاری

حکیم قطران تبریزی کا شمار اس عہد کے نام برآوردہ شاعروں میں ہے بلکہ دولت شاہ کی راے ہے کہ امیر معزی اور انوری وغیرہ کے دلکش طرز کا موجد یہی ہے۔ آل بویہ اور آل زیار کا مداح ہے اور امیر عنصر المعالی کیکاؤس بن قابوس کے لئے داستان وامق و عذرا نظم کی ہے۔ صنائع و بدائع کا خاص شوق تھا اور اکثر ذوقافتین قصائد نظم کئے ہیں مثلاً کہتا ہے:۔

قطران

تا بہم گشت از صبا پرچین چو پرّ باز باز　　　باغ بفزود اندرو چون لعبت طنّاز ناز

لیکن جو اشعار ان تکلفات سے بری ہیں انکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سلاست و عذوبت میں کسی ہمعصر سے کم کا پایہ نہیں۔

فخر الدین اسعد جرجانی کا نام مصنف مثنوی ویس و رامین کی حیثیت سے لیا جاتا ہے اگرچہ دولت شاہ کے نزدیک نظامی سمرقندی اس کا مصنف تھا

فخر الدین اسعد

اور بعضے نظامی گنجوی سے منسوب کرتے ہیں۔ اسکی تصنیف کا زمانہ وہی ہے جب طغرل نے رومیوں پر فتح پائی تھی۔ سلطان محمد بن محمود سلجوقی کے زمانے میں مقرب بارگاہ رہا۔ آخر عمر میں دل شکستگی غالب آگئی۔ بعض اشعار مثنوی کے درج کئے جاتے ہیں۔ رامین ویسہ کے فراق میں بیقرار ہے اور دل کی الجھن الفاظ میں ادا کی گئی ہے:۔

ندانستم کہ آتش آب خیزد   ز شہد ناب زہر ناب خیزد

بگریہ گہ گہی دل را کنم خوش   ہمیخواہم کشم آتش بہ آتش

جہاں کردم ز آب دیدہ پُر گِل   نمیجوا از آب بنشنم آتش دل

منم بے یار و از دردم بے یار   منم بیکار و از عشقم بے کار

مرا مادر دعا کرد است گوئی   کہ از تو دور بادا ہر چہ جوئی

اگر خوانند آرش[1] را کماں گیر   کہ از آمل بمرو انداخت یک تیر

تو اندازے بجان من ز گوراب   ہمی ہر ساعتے صد تیر پرتاب

عنصر المعالی

امیر عنصر المعالی کیکاؤس بن قابوس نے ۶۳ برس کی عمر میں قابوس نامہ اپنے بیٹے گیلان شاہ کے لئے تصنیف کیا۔ دیکھو! اس عہد کے سلاطین بھی مصنفوں کے گروہ میں امتیاز پیدا کرتے تھے۔ یہ کتاب مفید مضامین کا مجموعہ ہے اور بیش بہا نصیحتوں کا خزانہ۔ عقوو مکافات۔ لطف زندگانی۔ حسن و عشق۔ تعلیم اطفال۔ آداب وزارت۔ خصائل ملوکانہ وغیرہ وغیرہ عنوانات پر اپنے

---

[1] برادر زادہ طہمورث۔ کہتے ہیں کہ چچا نے کہا کہ تم تیر مارو جہانتک پہونچے گا اتنی زمین تم کو دونگا۔ حکما نے تیر کے اندر جوف کرکے پارہ بھر دیا۔ آرش نے آفتاب کی طرف رُخ کرکے تیر پھینکا۔ حرارت آفتاب کی وجہ سے آمل سے مرو تک چلا گیا۔ دولت شاہ کہتا ہے کہ چالیس منزل تیر کا چلا جانا خلاف عقل ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ یہ نام دو قریوں کے ہوں جنکے درمیان فاصلہ کم ہو۔

خیالات کا اظہار کیا ہے اور قصص و روایات سے استدلال کر کے کتاب کو دلچسپ بنایا ہے۔ زبان ناصر خسرو وغیرہ سے ملتی جلتی ہے فصیحی اسی امیر کا مداح ہے جسکا کلام اب کمیاب ہو گیا ہے۔

امام غزالی

امام ابو حامد محمد الغزالی[1] کے عروج کا زمانہ بھی یہی ہے فلسفہ کی تعلیم نہایت کامیابی کے ساتھ انکی ذات سے جاری ہوئی اور معارف اسلامیہ کا انطباق مسائل حکمیہ سے نہایت خوبی سے ہوا۔ اسی وجہ سے دنیائے اسلام میں انکا لقب حجۃ الاسلام ہے مسقط الراس وہی مردم خیز خطہ طوس ہے جسے فردوسی ایسے شاعر۔ نظام الملک ایسے وزیر اور نصیر الدین طوسی ایسے محقق کے مولد ہونے کا شرف حاصل ہے اور سال ولادت ۴۵۰ھ۔ بچپن میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ بڑی زحمت اور محنت سے اپنے چھوٹے بھائی امام احمد غزالی کے ساتھ درسیات پڑھے۔ جب فارغ التحصیل ہوئے تو نظام الملک تک رسائی ہوئی (۴۸۴ھ) اور نظامیہ بغداد کے استاد مقرر ہوئے چار برس اس مدرسے میں کام کرنے کے بعد اپنے بھائی کو اپنی جگہ چھوڑ کے حج بیت اللہ کیا اور بیت المقدس کی بھی زیارت کی۔ کہتے ہیں کہ احیاء العلوم زبان عربی میں وہیں تصنیف ہوئی تھی جس نے حقائق و معارف کا عظیم الشان خزانہ ملک و ملت کو عطا کیا۔ فارسی میں کیمیائے سعادت مراجعت کے بعد بغداد میں لکھی۔ یہ بھی حقائق و معارف سے لبریز ہے اور ایسی شیریں اور سلیس زبان میں ہے کہ سمجھنے والے کو کوئی زحمت نہیں ہوتی۔ پھر نظامیہ نیشاپور میں گئے اور تدریس کا کام کرنے لگے۔ تقریباً نوسو کتابیں ۵۰۵ھ اور رسالے امام صاحب کے تصنیف کئے ہوئے ہیں جن میں سے بعض فلاسفہ اور باطنیہ کی تردید کے لئے مخصوص ہیں۔

---

[1] تفصیل کمالات کے لئے مولانا شبلی کی الغزالی قابل ملاحظہ ہے ۔۔۔ مجمع الفصحا۔

اشعار میں بھی کمالات صوری ومعنوی کا اثر موجود ہے :۔

گفتم دلا تو چندیں بر خویشتن چہ پیچی	با یک طبیب محرم ایں راز در میان نہ
گفتا کہ ہم طبیبے فرمودہ است با من	گر مہر یار داری صد مُہر بر زبان نہ

ولہ

کس را پسِ پردۂ قضا راہ نشد	وز سرِّ قدر ہیچکس آگاہ نشد
ہر کس ز سرِ قیاس چیزے گفتند	معلوم نگشت و قصہ کوتاہ نشد

امام احمد غزالی بھی صاحب تصانیف تھے۔ سوانح العشاق میں مراتب عشق بیان کئے ہیں اور کئی مصنفات یادگار چھوڑے ہیں ۵۱۷ھ میں انتقال ہوا شعر گوئی میں رنگ بالکل اپنے بھائی کا ہے۔

ازرقی

ازرقی حکیم زین الدین ابوبکر ہروی کا عروج سلطان طغانشاہ بن مؤید سلجوقی کے عہد میں ہوا پہلے بادشاہ کا ندیم ہوا پھر ملک الشعرائی کے مرتبے پر پہونچا۔ ۵۲۶ھ میں وفات پائی۔ کتاب سندباد اور دیوان قصائد وغیرہ یادگار ہیں۔ اکثر معانی نفیسہ اور مضامین عالیہ اسکے کلام میں ملتے ہیں مثلاً ایک قصیدے کی تشبیب میں نہایت لطف سے ابر کا حال نظم کیا ہے کہ ابتدا اس کی پانی کے بخارات سے ہے جو آسمان کی طرف صعود کرتے ہیں اور انتہا میں قطرات باراں کی صورت میں پھر زمین پر واپس آتے ہیں :۔

چہ جرم است اینکہ ہر ساعت ز موجِ نیلگوں دریا	زمیں را سائباں بندد بہ پیشِ گنبدِ خضرا
چو در بالا بود پاشد ز چشمش اشک در پستی	چو در پستی بود پاشد ز گامش دود بر بالا
گہے از دامنِ دریا رود بر گوشۂ گردوں	گہے از گوشۂ گردوں رود بر دامنِ دریا
سپاہش را برانگیزد بدریا بر زند غارت	مصافش را بہم بندد بگردوں بر کند غوغا
ازاں غارت ببخشاید ہوا را افسر لولو	ازاں غوغا بپوشاند زمیں را حلۂ دیبا

دیکھو گریز کیا مزے کی ہے :۔

گہے گوہر برافشاند چو دستِ شاہ در محفل گے آتش برافشاند چو تیغِ شاہ در ہیجے

ایک قصیدے میں طغانشاہ کی فتح سیستان کا حال لکھا ہے۔ میدان رزم کے بیان میں پرانا مبالغہ ہے کہ خون کے دریا بہا دئے۔ اسکی قوت تخیل نے اس مبالغہ میں اضافہ کیا۔ سوار اس خونیں میدان میں یوں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں جیسے دریا میں کشتی۔ پھر خیال آتا ہے جہاں لاشے ملے راستہ رُک گیا۔ سواروں کو آگے بڑھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لہذا یہ لاشے اس کشتی کے لئے لنگر کا کام کرتے ہیں ورنہ کشتی ناقص رہتی۔ اتنے بڑے خیال کو چند لفظوں ادا کرتا ہے :۔

زمیں دریائے موج افگن شد از خوں درو کشتی سوار و کشتہ لنگر

مسعود بن سعد سلمان

مسعود بن سعد بن سلمان

مسعود بن سعد بن سلمان گورگانی کا عروج و زوال ابراہیم شاہ غزنوی کی ذات سے وابستہ ہے۔ آغاز حال میں بڑی قدر تھی یہاں تک کہ حکومت پنجاب بھی مل گئی انجام میں بدگمانی پیدا ہو گئی کہ ملک شاہ سلجوقی سے مل گیا ہے اور غزنویوں کو خاتمہ کرانا چاہتا ہے۔ قہر سلطانی میں جہاں اور لوگ ماخوذ ہوئے۔ یہ بھی قید کر دیا گیا۔ معذرت میں قصیدے کہے مگر کچھ نہ ہوا آخر ابراہیم شاہ کا انتقال ہوا اور بارہ برس کے بعد رہائی ہوئی۔ مگر چند ہی روز کے بعد پھر سلطان وقت کو لوگوں نے بھڑکایا اور بیس برس قید میں کاٹنا پڑے۔ جب دوبارہ آزادی ملی تو سلاطین سے نفرت ہو گئی اور گوشۂ عبادت میں زندگی کے دن پورے کر کے سنہ ۵۱۵ھ میں انتقال کیا۔ شاعری میں عدیم النظیر تھا اور صاحب مجمع الفصحا کی رائے ہے کہ عنصری کے رنگ میں بے مثل قصائد نظم کئے ہیں۔ عربی، ہندی اور فارسی تینوں زبانوں میں دیوان مرتب کئے مگر اب محض فارسی کا کلام ملتا ہے۔ چند اشعار ایک قصیدہ کے درج کئے جاتے ہیں۔ مضمون وہی پانی کا برسنا ہے اور خیال بندی کا زور و شور یہ

اشعار گے اشعار سے مقابلہ کرو تو اندازہ ہو جائے گا کہ امیر مسعود کا کلام کتنا شستہ ہے:۔

سپاہ ابر نیساں زدریا رفت بر صحرا — نثارِ لولوے لالا بصحرا برد از دریا
ازیں پر مشک شد گیتی وزاں پر در ہمہ عالم — ازیں پر بوے شد بستاں وزاں پر نور شد صحرا
گہے چوں تختہ تختہ سادہ سیم اندر ہوا بر ہم — گہے چوں تودہ تودہ سودہ کافور ست بر بالا
فلک در سندس نیلی ہوا در چادر کحلی — زمیں در فرش زنگاری کہ اندر حلۂ حمرا
زمین خشک شد سیراب و باغ زرد شد خضر — ہواے تیرہ شد روشن جہان پیر شد برنا

امیر معزی — امیر معزی محمد بن عبد الملک نیشاپوری کو آل سلجوق کے دربار میں وہی بات حاصل تھی جو رودکی کو سامانیوں کے یہاں اور عنصری کو سلطان محمود کی بدولت نصیب ہوئی تھی۔ پہلا قدردان ملکشاہ سلجوقی تھا اور دوسرا معز الدین سنجر جس نے ملک الشعرائی کا خطاب دیا اور اپنے نام پر تخلص کو منسوب کرنے کی اجازت عطا کی۔ ایک دفعہ سنجر اور امراے دولت استہلال عید کے لئے باہر آئے۔ سب سے پہلے سنجر کی نظر چاند پر پڑی۔ خوشی سے اُچھل پڑا اور سب کو اُنگلی کے اشارے سے چاند دکھلایا۔ معزی کو حکم دیا کہ ماہِ نو کی تعریف کرو۔ فی البدیہہ یہ شعر نظم کئے:۔

اے ماہ چو ابروان یاری گوئی — یا ہمچو کمان شہریاری گوئی
نعلے زدہ از زر عیاری گوئی — در گوش سپہر گوشواری گوئی

آج یہ تشبیہیں پیش پا افتادہ معلوم ہوتی ہیں لیکن جن دماغوں نے پہلے پہل اِن کو پیدا کیا ہوگا اُن کے کمال میں کیا شک ہے۔ بادشاہ نے خاصہ کا گھوڑا اور پانچ ہزار درہم عطا کئے۔ قدردانی نے شاعر کے دل میں اور اُمنگ پیدا کی۔ شکر یہ ادا کیا تو صنعت تضاد کا لطف دکھایا اور عناصر اربعہ کو یکجا کرکے پیش کیا:۔

چوں آتشِ خاطرِ مرا شاہ بدید از خاک مرا بر زبرِ ماہ کشید
چوں آب یکے ترانہ از من بشنید چوں باد یکے مرکبِ خاصم بخشید

پھر انعام لیا اور رخصت ہوا۔ انھیں قدردانیوں نے اہلِ قلم کے دلوں کو بڑھا دیا تھا اور نظم و نثر کو معراج کمال تک پہونچا دیا تھا۔ ایک مرتبہ بادشاہ تیر اندازی کر رہا تھا اتفاقاً معزی نشانہ ہو گیا مگر اوچھا سا زخم لگا اور جان بچ گئی۔ شکریہ میں کہا:۔

منت خدائے راکہ بہ تیرِ خدائگاں من بندہ بے گنہ نشدم کشتہ رائگاں

آخر ۵۴۲ھ میں انتقال کیا اور حکیم سنائی نے اُس کا مرثیہ کہا۔ صاحب مجمع الفصحا کی رائے ہے کہ غزل میں فرخی کا رنگ ہے اور مدح میں عنصری کا۔ کلام کی پختگی اور تخییل کی رنگینی خصوصیت کے ساتھ اُسکے دیوان میں پائی جاتی ہے۔ ایک قصیدہ کی تشبیب میں بہار کا حال نظم کیا ہے اور ہجرِ معشوق میں اپنی سراسیمگی دکھائی ہے۔ تقابل بھی ہے اور وارفتگی بھی۔ تشبیہیں بھی ہیں اور نازک خیالیاں بھی۔

اگرچہ خرمیِ عالم از بہار بود ہمیشہ خرمیِ من ز روے یار بود
سرشک ابر گرا فزوں بود بوقت بہار سرشکِ من بدَلِ ہر یکے ہزار بود

فصل بہار نے اتنا جوش پیدا کر دیا کہ ایک طرف ابر زار زار رو رہا ہے ایک طرف میں۔ فرق اتنا ہے کہ اُس کے ایک ایک قطرۂ اشک کے مقابلے میں ہزار ہزار قطرات اشک میرے رخسار سے پر جاری ہیں۔ اور تقابل دیکھو:۔

بخارِ آب ہمہ دُرفشاں بود ز ہوا بخارِ عشق ز چشمم عقیق بار بود

اب معشوق کی یاد میں باغوں کی سیر ہے۔ لالہ زار دیکھا تو رو دیا۔ حالانکہ لالہ کوئی چیز نہیں معشوق کی لالہ رخی کی بدولت یہ رنگ نصیب ہوا۔ سرو کو

دیکھا تو دل بھر آیا حالانکہ معشوق اگر کھڑا ہوتا تو نہر کی واقعی زینت ہو جاتی۔
ان خیالات کی تصویر کھینچتا ہے اور سراسیمگی کا مرقع ساتھ ہی ساتھ دکھاتا ہے:۔

بہ لالہ زار شوم پیش لالہ نالہ کنم	اگرچہ رنگ رخش۔ رنگ لالہ زار بود
بجوئبار شوم پیش سرو سجدہ کنم	اگرچہ قامت او (چہرہ معشوق) سرو جوئبار بود

استعارات کا لطف دیکھو۔ ایجاد کرنے والے کی زبان سے کتنے (معشوق قد یعنے نہر کی واقعی زینت) اچھے معلوم ہوتے ہیں اور نقل کرنے والوں کے لئے کس قدر معمولی:۔

عاشق آنم کہ تقاضا لبش ہمی بارد شکر	فتنۂ آنم کہ سنجا لبش ہمی پوشد جگر
خستۂ آنم کہ از گل تودہ دارد بر سمن	بستۂ آنم کہ از شب حلقہ دارد بر قمر
از شرر ہرگز جدا آتش نخیزد پس چرا	بر رخ او آتش است و چشم من بارد شرر الخ

رشید وطواط

رشید وطواط۔ رشید الدین محمد بن عبد الجلیل الکاتب العمری بلخ میں پیدا ہوا اور خوارزم میں سلطان اتسز خوارزم شاہی کی بدولت عروج پایا۔ دولت شاہ کہتا ہے کہ تیز زبان اور کم جثہ شخص تھا اسی سے وطواط (چمگادڑ یا) کہلاتا ہے۔ اتسز نے جب ملکشاہ سے بغاوت کی اور ہزار اسپ (نام مقام) میں محصور ہوا انوری نے یہ رباعی سلجوقیوں کی طرف سے کہی:۔

ای شاہ ہمہ ملک جہاں حسب ترا ست	وز دولت واقبال جہاں کسب ترا ست
امروز بیک حملہ ہزار اسپ (تیرے لئے) بگیر	فردا خوارزم وصد ہزار اسپ ترا ست

رشید نے جواب دیا:۔

شاہا کہ بجامت مئے صافیست نہ دُرد	اعدائے ترا ز غصہ خوں باید خورد
گر خصم تو اے شاہ بود رستم گرد	یک خر ز ہزار اسپ نتواند برد

ملکشاہ کو غصہ آگیا اور قسم کھالی کہ جب قلعہ فتح کروں گا تو رشید کے سات ٹکڑے کر ڈالوں گا۔ آخر جب اتسز ہزیمت کھا کے بھاگا تو رشید پکڑ کے

بادشاہ کے سامنے لایا گیا مگر بدیع الزمان کاتب نے کہا کہ اے بادشاہ وطواط بہت چھوٹی چڑیا ہے۔ اس کے سات ٹکڑے نہ ہو سکیں گے دو ہی ٹکڑے کرائیے بادشاہ ہنس پڑا اور رشید کی خطا کو معاف کر دیا۔ جب زمانہ اتسز کے موافق ہوا تو رشید اُسی کے پاس چلا گیا اور وہیں رہا۔ اتسز کا ۵۵۱ھ میں انتقال ہوا تو رشید اُس کے تابوت کے سرہانے کھڑا ہو کے بہت رویا اور یہ شعر پڑھے:۔

شاہا فلک از سیاستت می لرزید   پیش تو بطوع بندگی می ورزید
صاحب نظرے کجاست تا در نگرد   تا آں ہمہ سلطنت بدیں می ارزید

اتسز کے بعد بھی رشید زندہ رہا اور ۹۷ برس کی عمر میں ۵۷۳ھ میں انتقال کیا۔ حدائق السحر صنائع و بدائع میں اور صد کلمہ علی علیہ السلام کا فارسی ترجمہ علاوہ دیوان شعر کے اس کی یادگار ہیں۔ اپنے زمانے میں مسلم الثبوت اُستاد تھا اور معاصرین کے رنگ میں نظم کرتا تھا۔ طبیعت کا اندازہ اس تمہید سے سے ہو جائیگا:۔

زہے فروختہ روئے تو در جہاں آتش   زدہ غم تو مرا در میان جان آتش
نماند ز آتش دل آب چشم و ترسم ازانکہ   بجائے آب ز چشمم شود رواں آتش

ایک قصیدہ لف و نشر میں نہایت اچھا ہے:۔

بہ بزم و عزم و حزم و رزم کوئی عاریت داری
کف از حاتم ہش از رستم تن از بیژن دل از حیدر
بخشش و حلم و عفو و طبع برداری اگر خواہی
رنگ از خاک و تنگ از باد و نم از آب و تف از آذر

ہجو بھی کہتا تھا مگر بیحد رکیک جنھیں نقل کرنا خلاف تہذیب ہے۔

انوری

انوری۔ حکیم اوحدالدین علی بن اسحٰق آبیوردی[1] خاوری کا عروج سلطان سنجر کے زمانے میں ہوا اور اسی دربار کا شاعر اور مداح ہے۔ اوائل زندگی میں منصور طوس وغیرہ میں درسیات ختم کئے اور فلسفہ و نجوم وغیرہ میں دستگاہ کامل پیدا کی کہتے ہیں کہ باوجود کمال نہایت عسرت میں بسر کرتا تھا۔ ایک روز ایک شخص کو بڑی شان و شوکت سے گھوڑے پر سوار جاتے ہوئے دیکھا۔ پوچھا کہ یہ کون ہے معلوم ہوا کہ "شاعر" کہنے لگا کہ افسوس! میں باوجود حکیم ہونے کے تنگدست ہوں اور یہ شخص باوجود اس کم حیثیت پیشہ[2] کے اس ثروت پر فائز ہے۔ خود بھی فن شعر کیطرف متوجہ ہوا اور رات بھر میں ایک قصیدہ کہہ کے سلطان سنجر کے دربار میں پڑھا اور تقرب سلطانی حاصل کیا۔ یہ قصیدہ نہایت زوردار ہے اور مشہور۔ ابتدا یوں ہے:۔

گر دل و دست بحر و کاں باشد دل و دست خدا اُیگاں باشد

پروفیسر براؤن اور مولانا شبلی دونوں نے تعجب کیا ہے کہ تذکرہ نویسوں نے کیوں ایسے قصیدۂ غرا کو ابتدائی شاعری بلکہ ایک رات کی مشق کا نتیجہ سمجھا حالانکہ انوری خود اسی قصیدے میں کہتا ہے:۔

خسروا! بندۂ تو دہ سال است کہ ہمی آرزوے آں باشد
کز ندیمانِ مجلس ار نشود از مقیمانِ آستاں باشد

---

[1] خراسان کے ایک علاقہ کا دشت خاوران ہے۔ آبیورد اسی کا ایک قریہ ہے جہاں انوری پیدا ہوا تھا اور عرفی کا خیال ہے کہ مہنہ میں پیدا ہوا تھا جو آبیورد سے قریب ہے (ممکن ہے کہ اس قریہ کے مضافات میں سے ہو) چنانچہ کہتا ہے "انوری گر بود از مہنہ منم از شیراز"۔ ابتدا میں خاوری تخلص تھا کیونکہ دشت خاوران میں اس کا وطن تھا۔

[2] اس زمانے میں شاعری نے پیشہ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ امرا کی جھوٹی تعریفیں کرکے انعام حاصل کئے جاتے تھے اور انہیں انعاموں پر معاش ہو گئی تھی۔

دس برس کا امید وار اور بغیر ایک مصرعہ نظم کئے بیٹھا رہے۔ یہ ہو نہیں سکتا۔ ہاں! اتنا ضرور ہے کہ شاعر کی حیثیت سے اہل دنیا کی نظر میں آنا اسی قصیدے سے شروع ہوتا ہے جس کا ہر مصرع پختگی اور برجستگی کی بہترین مثال ہے۔ حبیب السیر میں یہ بھی لکھا ہے کہ امیر معزی دربار سنجری کا ملک الشعرا تھا اور حکم سلطانی یہ تھا کہ کوئی قصیدہ بغیر اسکی سفارش کے پیش نہ ہو تاکہ نااہل لوگ اس تقریب سے ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ مگر معزی خود کوتاہ نظر تھا۔ حافظ غضب کا تھا۔ ایک دفعہ سنا اور پورا قصیدہ یاد ہو گیا۔ اس کا بیٹا دو مرتبہ سن کے یاد کر لیتا تھا اور غلام تین مرتبہ سن کے پورا قصیدہ پڑھ دیتا تھا۔ ادھر کوئی شاعر دربار میں گیا اور قصیدہ پڑھا معزی اٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ یہ میرا قصیدہ ہے اور پورا سنا دیا۔ بیٹے نے تائید کی کہ یہ تو والد کا ہے مجھے بھی یاد ہے اور سنا دیا۔ غلام نے تائید مزید کی اور سنا دیا۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ شاعر بیچارہ نکال دیا جاتا تھا۔ **انوری** نے جب تقرب چاہا تو معزی سے ملا اور بے معنی اور لچر اشعار سنائے۔ معزی سمجھا کہ کوئی مسخرہ ہے۔ اسکے پیش کرنے میں مضائقہ نہیں اور سنجر کے پاس لے گیا۔ انوری نے مہملات ترک کر کے یہ قصیدہ شروع کیا جسکے اشعار ابھی نقل ہوئے ہیں۔ دو شعر پڑھنے کے بعد معزی سے مخاطب ہو کے کہا کہ اگر یہ قصیدہ آپ کا ہو تو آگے کے اشعار سنا دیجئے۔ اب کیا کرے مجبوراً اعتراف کیا کہ یہ قصیدہ میرا نہیں **انوری** نے اطمینان سے پورا قصیدہ پڑھا اور کامیاب ہوا۔ سلطان سنجر کے عواطف شاہانہ کا ادنیٰ نمونہ یہ ہے کہ دو مرتبہ خود انوری کے مکان پر عزت افزائی کیلئے گیا مگر جب زوال آتا ہے تو اسکے اسباب بھی عجیب پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ (غالباً ۵۸۱ھ میں) سبعہ سیارہ کا برج میزان میں قران ہوا۔ انوری نے از روئے نجوم پیشین گوئی کی کہ آج رات کو شدید آندھی آئیگی اور مکانات وغیرہ گر جائینگے۔ تمام شہر میں

تلاطم ہوگیا اور حفاظت کے لئے کوئی تہ خانہ میں چھپا۔ کوئی شہر سے باہر بھاگا۔ اتفاق کی بات کہ اُس رات کو اتنی بھی ہوا نہ چلی کہ میناروں کے چراغ بجھ جاتے بلکہ سال بھر ہوا اتنی کم رہی کہ کھلیان کے کام میں زحمت ہوئی۔ بادشاہ بہت ناراض ہوا اور انوری وہاں سے بھاگ کر بلخ گیا۔ [۱] یہاں سوزنی یا ابوالفرج رونی نے ایک ہجو اہل بلخ کی بہت سخت کہہ کر اُسکے نام سے مشہور کردی۔ وہ لوگ بگڑ گئے اور بدنصیب انوری کو خوب پیٹا اور اوڑھنی اُڑھا کے شہر میں تشہیر کیا۔ قاضی حمید الدین [۲] وغیرہ نے حمایت کی تو جان بچی چنانچہ قاضی صاحب کی مدح میں کہتا ہے:۔

بمدح و ثنا گر کنم رائے نظمے ۔۔۔۔ نہ دشوار گویم نہ آسان فرستم
ولیکن بمدح جناب حمیدی ۔۔۔۔ اگر وحی باشد ہراسان فرستم

آخر گردش زمانہ سے تنگ آ کے گوشہ نشینی اختیار کرلی اور ۵۸۵ھ یا ۵۸۶ھ میں انتقال کیا۔

انوری کا شمار شریعت شاعری کے تین پیغمبروں میں سے ہے اور سعدی و فردوسی کا ہم مرتبہ سمجھا ہے اگرچہ یہ درجہ ٹھیک حد سے بڑھا دیا ہے کیونکہ (حسب تحقیق مولانا شبلی) اس کی ذات سے کوئی اضافہ قصیدہ گوئی میں نظر نہیں آتا یہ دوسری بات ہے کہ ادیب صابر۔ ارزقی۔ رشید وطواط وغیرہ سے عمدہ کہتا ہے البتہ اس کی شاعری میں معاصرین سے زائد علمی کمالات کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً وہ مشہور قصیدہ جو واقعۂ تاراجیِ بلخ کے متعلق نظم کیا ہے مطلع ہی سے ظاہر کرتا ہے کہ نظم کرنے والا نجوم و فلسفہ و منقولات سب میں کمال رکھتا ہے۔

---

[۱] شعر العجم میں بلخ سے پہلے خوارزم جانے کا حال لکھا ہے اور سلطان احمد قیروز شاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ نقل کیا ہے جس میں سفر کے صعوبات کا نہایت خوبی سے ذکر ہے۔ [۲] مصنف مقامات حمیدی۔

مطلع یہ ہے :-

اے مسلماناں فغاں از دورِ چرخِ چنبری
وز نفاقِ تیر و کید ماہ و قصدِ مشتری

اہل نجوم اجرام سماوی کی حرکت کو واقعات عالم کے لئے موثر سمجھتے ہیں اور انھیں افلاک میں جڑا ہوا خیال کرتے ہیں لہذا ہر سیارہ جب حرکت کرتا نظر آتا ہے تو درحقیقت وہ فلک حرکت کرتا ہے جس میں وہ سیارہ جڑا ہوا ہے۔ اسی وجہ سے گردشِ فلکی کی شکایتیں کی جاتی ہیں۔ نہ وہ حرکت کرتا نہ سیارہ ایسے مقام پر آتا جہاں آجانے سے انقلابات وحوادث پیدا ہوتے ہیں۔ پھر خواص سیاروں کا بیان کرتا ہے کہ عطارد منافق ہے یعنے سعد سیارے کے ساتھ جب ہوتا ہے تو خود بھی سعد ہے اور نحس کے ہمراہ نحس مشتری سعد سیارہ ہے لیکن بعض مقامات ایسے بھی آجاتے ہیں جہاں سے اُس کا رُخ بعض ستاروں کے خلاف پڑتا ہے اور جن کے طالع میں وہ ستارے ہوتے ہیں اُن کے لئے نحس ہو جاتا ہے۔ اسی طرح حرکت قمر میں بھی راہیں بعض ستاروں کے مضر ہو جاتی ہیں۔ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ عطارد دبیر فلک ہے اور اہل انشا کا طالع حیثیت شاعر یا نثر نگار ہونے کے اس سے متعلق ہے۔ چاند کا تعلق راحت و عیش سے ہے اور مشتری کا عدل و انصاف سے۔ انوری کو یہ ظاہر کرنا ہے کہ جب تک طالع کا ستارہ اچھے مقام پر تھا تو عطارد بھی فائدہ پہونچاتا تھا اور مشتری و قمر سے بھی منافع ہوتے تھے اور واقعہ بلخ کے زمانے میں طالع کا ستارہ ایسے مخالف مقام پر آگیا کہ مشتری کی نظر دشمنی کی ہو گئی۔ چاند کی حرکت کا راستہ بھی مخالف مراد واقع ہوا اور عطارد بھی اپنی خاصیت نفاق کی وجہ سے نحس ہو گیا۔ یعنے جب زمانہ موافق تھا تو میری شاعری (جس کا تعلق عطارد سے ہے) میرے لئے مفید تھی عدل و انصاف کی کچہریاں بھی (جو مشتری سے علاقہ رکھتی ہیں) میرے موافق تھیں اور عزت و راحت (جن کا تعلق چاند سے ہے)

میرے لئے خوشگوار تھے۔ اب میرا ستارہ گردش میں آگیا اور رنج کے واقعے میں وہی شاعری میری ذلت اور مصیبت کا باعث ہوئی (کیونکہ نہیں شاعر اور ہجو گو ہوتا نہ دوسروں کے اشعار مجھ سے منسوب کئے جا سکتے) اور عدل و انصاف کی کچہریوں سے میرے خلاف حکم سنا کے مجھے تشہیر کرایا اور عزت و راحت کے اسباب بھی میرے خلاف ہوگئے کسی کو میری عزت پر حسد ہوا۔ کسی کو میرے آرام پر۔ پھر مسلمانوں کو مخاطب کرتا ہے کبھی لطف سے خالی نہیں کبھی اخوت اسلامی سے اپیل ہے۔ کبھی اثر سے موثر کو ثابت کرکے اُس قوم کو مخاطب کرتا ہے جس کا نجوم پر اعتقاد نہیں۔

اسی طرح ایک قصیدہ میں اُن امور سیاسی اور نظم معاشرت کی طرف اشارہ کیا ہے جو افلاطون وغیرہ کے کتب معتبرہ میں درج ہیں جنھیں تقسیم عمل کا فلسفہ بیان کیا ہے کہ مدینۂ فاضلہ میں ہر پیشہ ور اور صاحب ہنر کی ایک ضرورت ہے اور ایک جگہ ہے کیونکہ بقائے نوع انسانی کے لئے وہ ایک کام کر رہا ہے۔ چمار ہو یا لوہار۔ نجار ہو کہ معمار۔ غرض بادشاہ و وزیر سے لیکے نان پز بلکہ کناس یعنے مہتر تک کی ضرورت انسان کو ہوتی ہے اور سب کے لئے مدینۂ فاضلہ میں امتیازی جگہ ہے مگر شاعر کہ اُسکی کوئی ضرورت نہیں[۵] لہذا وہ کسی جگہ اور کسی امتیاز کا مستحق نہیں۔ کہتا ہے :-

اے برادر بشنوی رمزے ز شعر و شاعری　　تا ز ما مشتے گدا کس را بمردم نشمری
(امر اسکے قصیدہ کو)
زانکہ از کناس ناکس در ممالک چارہ نیست　　حاش للہ تا ندانی این سخن را سرسری
(مہتر)

---

[۵] یہ حالت اُن شاعروں کی ہوسکتی ہے جو محض جھوٹی خوشامدیں اُمرا کی کرتے ہیں ورنہ سچے شاعروں نے جو ہیجان قوموں کے جذبات میں پیدا کر دیئے ہیں اور جس طرح ایک ایک شعر نے مردہ قوتوں کو زندہ کر دیا ہے اُن کے حالات سے یونان و عرب و عجم وغیرہ کی تاریخیں بھری ہوئی ہیں۔ ایسے شاعر کا وجود اخلاق فاضلہ کے قیام کے لئے نہایت ضروری ہے اور مدینہ فاضلہ میں اُس کی جگہ امتیاز کے ساتھ ہونی چاہیے

کارِ خالد کی بہ جعفر بیشود ہرگز تمام — آں یکے جولاہگی داند دگر برزیگری (کاشتکاری)

آدمی را چوں مؤونت (محنت) شرطِ کار (تقسیم عمل) شرکت است — نان زکنّاسی (حلال خوری) خوری بہ ازاں بود کز شاعری

آں شنیدستی کہ صد کس بباید پیشہ ور — تا تو نادانستہ و بے آگہی نانے خوری

درازائے (مقابل) آں اگر از تو نباشد یار سئے — آں نہ نان خوردن بود دانی چہ باشد بری

مرد را باید کہ حکمت نیز دامن گیر دش — تا شفائے (نام کتاب) بوعلی خواند نہ ژاژ (ہذیان مراد شاعری) بحتری

اس میں شک نہیں کہ اُس زمانے میں شاعری کو پیشہ بنا لیا گیا تھا۔ کسی امیر کے پاس گئے۔ اُس کی مدح کی پھر تقاضا کیا کہ انعام دلوائیے۔ اگر ملا تو شکریہ نہ ملا تو ہجو۔ انوری خود کسی امیر سے کہتا ہے:—

سہ بیت رسم بود شاعرانِ طامع را — یکے مدیح و دگر قطعۂ تقاضائی

اگر بداد سوم شکر ورنہ داد ہجا — ازیں سہ چیز دو گفتم دگر چہ فرمائی

یہ سب کچھ سہی مگر اس کا قصیدہ تاریخ نظم میں بہت بلند پایہ رکھتا ہے۔ زبان کو اضافتوں وغیرہ کے ذریعہ سے کسی قدر مختصر کرکے اور ثقیل الفاظ کو دور کرکے شیریں بنا دیا ہے اور یہ شیرینی ظہیر کے علاوہ اور معاصرین میں کم نظر آتی ہے۔ پھر صاحب علم ہونے کی وجہ سے قوتِ تخئیل کو نہایت زوردار کر دیا ہے جس سے بعض مضامین میں ایک خاص حلاوت کے ساتھ جدّت بھی پیدا ہو جاتی ہے مثلاً نوروز کے بعد سے دن بڑھنے لگتا ہے اور رات گھٹنے لگتی ہے یہانتک کہ ایران و ہندوستان میں دن چودہ گھنٹہ سے بھی زیادہ ہو جاتا ہے اور رات دس گھنٹے سے بھی کسی قدر کم ہو جاتی ہے۔ اس حالت کا نقشہ کھینچتا ہے:—

جرمِ خُرشید چو از حوت در آید بہ حمل (میناٹ) — اشہبِ روز کند ادہمِ شب را ارجل

اشہب سفید گھوڑا ہے۔ ادہم سیاہ اور ارجل وہ گھوڑا جسکے پاؤں کا نچلا حصہ

سفید ہوتا ہے۔ ادہم اور اشہب سے معلوم ہوا کہ رات اور دن برابر ہیں۔ ارجل سے معلوم ہوا کہ رات کا کسی قدر حصہ سفید ہو گیا اور "گیند" سے معلوم ہوا کہ رفتہ رفتہ یہ حصہ سفید ہوا ہے ایک دم سے نہیں۔ پھر اشہب روز کو قائل قرار دے کے اس سفیدی کو دن کا مال قرار دیدیا۔ عرفی ایسا نازک خیال اس پختگی سے قاصر ہے:—

چہرہ پرداز جہاں رخت کشد چوں بہ حمل (داخل ہوتا ہے)
شب شود نیم رخ و روز شود مستقبل

دن کو پورے چہرے کی تصویر کہا ہے اور رات کو آدھے چہرے کی جو بجز مبالغہ کے (اتفاق ہے) اور کسی صورت میں ہندوستان اور ایران کی حالت نہیں ہو سکتی۔ ورنہ اور اعتبارات سے مطلع نہایت نزہت بخش ہے۔ علاوہ بریں کلام عرب سے اقتباسات لفظی و معنوی سے کلام کو مزین کرتا ہے کہیں تلمیحات لطیفہ ملتی ہیں کہیں تلمیحات نادرہ مثلاً کہتا ہے:—

خصم تو و تا عدۂ ملک او
آں شدہ از بدو جہاں منتقیم
ابتدائے آفرینش

چوں دو بنا بود برافراشتہ
زاں دو یکے محدث و دیگر قدیم

زلزلۂ قہر تو شاں کرد پست
زلزلۃ الساعۃ شیٔ عظیم

واقعہ نگاری بھی خوب کرتا ہے خصوصاً ایک قصیدہ تو نہایت دردناک کہا ہے جس میں سلطان سنجر[۱] کی گرفتاری کے بعد ملک کی بدامنی اور پریشانی کی حالت دکھائی ہے:—

۱؎ یہ واقعہ نہایت عبرتناک ہے۔ تاتاریوں کا ایک قبیلہ غز نواحی ختلان میں مقیم تھا جس کا تعلق حکومت بلخ سے تھا اور جو بیس ہزار بھیڑیں سلطان سنجر کے باورچی خانہ کے لئے سالانہ بطور خراج دیتا تھا۔ داروغہ باورچی خانہ سے کچھ اُن بَن ہو گئی اور قماج والی بلخ نے اُنکی تادیب کے لئے حملہ کیا مگر خود شکست کھا گیا اور بیٹا بھی کام آ گیا۔ اس فتح کے بعد غزوں کو خوف سلطانی پیدا ہوا اور اس سر کشی کے ساتھ ایک لاکھ درہم اور ہزار غلامان ترکی نذر دینے کو تیار ہو گئے مگر امرائے دربار سلطانی نے انکے استیصال ہی کی رائے دی۔ غز لوگ عالم ہراس میں اس جوش و خروش سے لڑے کہ سنجر کی فوج نے شکست پائی اور خود گرفتار ہوا اور مرو و نیشاپور وغیرہ میں خون کی ندیاں بہ گئیں۔ جامع مسجد اور بہت سی عالی شان عمارتیں جلائی گئیں اور محمد اکاف اور محمد بن یحییٰ ایسے زاہد و عابد قتل ہوئے۔ عورتیں اور بچے ذبح کئے گئے۔ غرض ۵۴۸ھ سے ۵۵۱ھ تک تمام خراسان اسی تباہی میں رہا۔ آخر سنجر کسی طرح اُنکی قید سے بھاگ کے باہر آیا مگر موت نے مہلت نہ دی کہ حالت درست کرتا۔

برسمرقند اگر بگذری اے باد سحر — نامۂ اہل خراساں بہ بر خاقاں بر
نامۂ مطلع او رنج تن و آفت جاں — نامۂ مقطع او درد دل و سوز جگر
نامۂ بر رقمش آہ شہیداں پیدا — نامۂ در شکنش خون شہیداں مضمر

حاکم سمرقند محمد بن سلیمان کو مخاطب کر کے کہتا ہے:-

خبرت ہست کزیں زیر و زبر شوم غزاں — نیست یک تن ز خراساں کہ نشد زیر و زبر
بر بزرگان زمانہ شدہ خرداں سالار — بر کریمان جہاں گشتہ لئیماں مہتر
شاد الا بہ در مرگ نہ بینی مردم — بکر جز در شکم مام نیابی دختر (مادر)
رحم کن رحم بر آں قوم کہ جویند جوین (جو کی روٹی) — از پس آنکہ نخوردندے از ناز شکر
رحم کن رحم بر آنہا کہ نیابند نمد — از پس آنکہ از اطلس بُشاں بودے بستر

انوری کو جب غصہ آجاتا تھا تو قوت شعر گوئی بھی تیز ہو جاتی تھی اور کسی چیز کی بدی اگر کرتا تھا تو واقعی اس فن کا پیغمبر ہی معلوم ہوتا تھا۔ ہجو گوئی میں اس کا ہمسر شاید کوئی نہیں ہوا۔ فحش کے دھبے دامن نظم کو آلودہ کئے رہتے ہیں اسو جہ سے انتخاب دشوار ہے۔

خاقانی:- ملک الشعراء حسان العجم افضل الدین ابراہیم بن علی النجار مقام ولادت شروان ہے اور سال ولادت ۵۰۰ھ۔ باپ کا پیشہ نجاری تھا اور ماں نسطوری عیسائی تھی جس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ عالم طفولیت چچا کی تربیت میں گذرا جس کا نام مرزا کافی بن عثمان تھا اور طبابت کے ذریعے سے کسب معاش کرتا تھا۔ خاقانی نے معقولات و منقولات پہ تکمیل ختم کئے تھے کہ چچا کا انتقال ہوگیا اور پچیس سال کی عمر میں منوچہر شروان شاہ خاقان کے شعرا میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ یہاں ابو العلاء گنجوی کا دور دورہ تھا۔ خاقانی نے اسکی شاگردی اختیار کی اور پہلے کا تخلص حقائقی بدل کے خاقانی

خاقانی

اختیار کیا۔ ابوالعلا نے بہت مراعات کی اور اپنی بیٹی کے ساتھ عقد کر دیا۔ دوسرے شاگرد **فلکی** شروانی کو یہ مراعات ناگوار ہوئی۔ ابوالعلا نے اُسے بیس ہزار روپیہ یعنے پچاس خوبصورت کنیزوں کی قیمت دیکے راضی کیا۔ **خاقانی** کی رسائی دربارِ خاقان میں بھی ہوگئی اور حکم سلطانی ہوا کہ ہر قصیدہ پر ہزار اشرفیاں انعام دی جائیں۔ جب عروج و ثروت سے ترقی کی تو اُستاد کا مخالف ہوگیا۔ ابوالعلا کو یہ رفتار ناگوار ہوئی

تو ای افضل الدین اگر راست پرسی — بجانِ عزیزت کہ از تو نہ شادم
بخاقانیت من لقب بر نہادم — ترا دختر و مال و شہرت بدادم
چرا حرمت من نداری تو کز من — ترا ہم پدر خواندہ ہم اوستادم

خاقانی نے اسکے جواب میں ایک رکیک ہجو کہی جو قابل نقل نہیں ہے۔ پروفیسر **خانکاف** روسی نے اس ہجو کی معذرت میں کہا ہے کہ "بارھویں صدی (عیسوی) کے ایران کا قصہ ہے اور اُسی کی زبان اور یہ وہ زمانہ تھا جب کہ یورپ کی زبان میں ایسے ہی گندے الفاظ داخل تھے"۔ شروان شاہ کی نازک مزاجی کیوجہ سے خاقانی کو اپنے عروج پر اطمینان نہ تھا آخر اجازت لے کے حج بیت اللہ کو گیا۔ اس زمانے میں سلطان سنجر کی فیاضی کی شہرت سن کے جی چاہا[1] کہ وہاں رسائی پیدا کرے مگر کامیاب نہ ہوا۔ خوارزم شاہیوں سے بھی اسکے تعلقات بعض قصائد سے ظاہر ہوتے ہیں اور وہاں کے ملک الشعرا رشید وطواط کی تعریف میں اشعار بھی کہے ہیں۔ غرض فراغت حج کے بعد اصفہان آیا مگر یہاں اسکی قسمت کچھ

---

[1] یہ ارادہ کئی قصیدوں میں مذکور ہے مثلاً :—

بخراساں شوم انشاء اللہ — از رہ آساں شوم انشاء اللہ یا
رہ روم مقصد امکاں بخراساں یابم — تشنہ ام مشرب احساں بخراساں یابم

اسی میں اپنی ترقی کی امید ظاہر کرتا ہے :—

چوں ز من اہل خراساں ہمہ عنقا بینند — من سلیمانِ جہانباں بخراساں یابم

الوری کی سی ہوگئی۔ مجیر بیلقانی کی ہجوِ اصفہان اسکے نام پر شہرت پاگئی اور
جمال الدین عبدالرزّاق اصفہانی نے اُس کا جواب کہا۔ آخر خاقانی کو برات
ظاہر کرنی پڑی اور ایک قصیدہ تعریف اصفہان میں کہا:—

نکہتِ حور است یا ہوائے صفاہاں   جبہتِ حور است یا لقائے صفاہاں
دیدۂ خورشید چشم درد ہمیدا فتست   از حسدِ خاکِ سرمہ زائے صفاہاں [1]
لاجرم اینک برائے دیدۂ خورشید   دستِ صبح است سرمہ سائے صفاہاں

صدر خجند اور جمال الدین کی تعریف میں کہتا ہے:—

مدحِ دو فاروقِ دین چگونہ کنم من   صدر و جمال ائمہ مقتدائے صفاہاں

مصائب کا حال بھی لطف سے خالی نہیں:—

داد صفاہاں ز ابتدام کدورت   گرچہ صفا باشد ابتدائے صفاہاں
سیبِ [2] صفاہان الف فزود دو راول   تا خورم آسیبِ جانگزائے صفاہاں
گرچہ صفاہاں جزائے من بہ بدی کرد   ہم بہ نکوئی کنم جزائے صفاہاں الخ

آخر شروان واپس آیا مگر بدنصیبی بھی ساتھ آئی۔ خاقان منوچہر سے کسی نے کہدیا
کہ اب یہ دوسرا مربّی ڈھونڈھ رہا ہے۔ بادشاہ نے غصہ میں آکے قید [3] کردیا۔

---

[1] اصفہان کا سرمہ مشہور ہے جیسے ہمارے ممالک میں بریلی کا۔ [2] اصفہان کا سیب بھی مشہور ہے۔ [3] شعر العجم جلد پنجم میں اصلی وجہ بعد تحقیق یہ لکھی ہے کہ ملک الوزرا خواجہ جمیل الدین موصلی نے خاقانی کو ایک انگوٹھی دی تھی جس پر اسم اعظم کندہ تھا اور عہد لیا تھا کہ یہ انگوٹھی کسی کو نہ دینا چنانچہ خود خاقانی تحفۃ العراقین میں کہتا ہے:—

این مہر شناس نشرۂ ہوش   وقف ابدی است بر تو مفروش
ہر گوشۂ او بہ عمر اغیار   لا یُوھَبُ لا یُباعُ بنگار

شروانشاہ نے یہ انگوٹھی طلب کی مگر اس نے دینے سے انکار کیا اسی گستاخی اور نافرمانی کی پاداش میں قید ہوا۔ اور بعض تذکروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قید کا واقعہ حج بیت اللہ کے اثنائے سفر میں واقع ہوا کیونکہ خاقانی بادشاہ چھپ کے بھاگا تھا مگر بیلقان میں گرفتار کرلیا گیا اور واپس لایا گیا۔

کے بعد رہائی ہوئی تو دنیا کو ترک کرکے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ قصائد سے معلوم ہوتا ہے کہ منوچہر کے بعد بھی زندہ رہا اور زوجہ اور بیس ۲۰ سالہ رشید کا بھی سامنے ہی انتقال ہوا۔ غرض اسی زاویہ نشینی کی زندگی ختم کرکے سنہ ۵۹۰ھ (حبیب السیر) میں انتقال کیا اور مقبرۃ الشعراے سرخاب میں قبر بنی۔ ملا جامی نے خاقانی کو اولیاے کرام میں شمار کیا ہے جسکی وجہ یہی آخری زمانہ زندگی کا ہو سکتا ہے۔

شاعری میں صاحب آتشکدہ انھیں طرز خاص کا موجد سمجھتے ہیں اور بعض شعرا نے یوں مدح کی ہے:—

ز دیوان ازل منشور کاول در میاں آمد	اسیری جملہ را دادند و سلطانی بہ خاقانی
براے حجت معنی - براہیمے پدید آمد	ز نسبت آذری صنعت - علی نجار شروانی

کلیات خاقانی نہایت ضخیم ہے۔ بیشتر قصائد کہے ہیں مگر غزلیں اور قطعات وغیرہ بھی موجود ہیں اور ایک مثنوی تحفۃ العراقین ہے جسے زمانۂ قید میں نظم کیا ہے۔ قصیدہ کی زبان وہی معاصرین کی ہے۔ شیرینی میں انوری و ظہیر سے کم ہے اور جزالت الفاظ میں بہت بلند۔ مقامات صوفیہ و مصطلحات حکمیہ و تلمیحات تاریخیہ کا بیش بہا خزانہ چھوڑا ہے اگرچہ ان میں سے بعض غیر مانوس ہوتی ہیں اور لطف کلام پر اثر ڈالتی ہیں۔ تشبیہات بھی نادر ہیں مگر پرانے ڈھنگ کی۔ ایک قصیدہ قیصر روم کے پاس بھیجنا چاہا تھا کہ قید سے رہائی پائے۔ اُس کی تشبیب میں تمام مصطلحات عیسائی مذہب کے ہیں۔ نمونہ کے طور پر بعض اشعار نقل کئے جاتے ہیں:—

فلک کجرو تر است از خط ترسا	مرا دارد مسلسل راہب آسا
نہ روح اللہ درین دیر است چون شد	چنین دجال فعل این دیر مینا
تنم چون رشتۂ مریم دوتا است	دلم چون سوزن عیسی است یکتا
من اینجا پای بند رشتہ ماندم	چو عیسی پای بند سوزن آنجا

چو یوسف نیست کز تعظیم رہاند   چہ بن یامین مرا اوچہ یہودا

در آنجا زیاں اینک کشادہ   حریم رومیاں آنک مہیا

زرم ناقوس بوسم زیں تحکم   شوم زنار بندم زیں تعدا

دبیرستاں نہم در ہیکل روم   کنم آئین مطراں را مطرا

معلوم ہوتا ہے کہ عیسائی ہونے کو تیار ہے۔ مگر نہیں قیصر کی خدمت کا شوق ہے۔ آگے کہتا ہے:۔

دگر قیصر سگالد راز زردشت   کنم زندہ رسوم زند و استا

بگویم کاں چہ زند است وچہ آتش   کز و پا ژند و ژند آمد مسما

پھر توبہ کرتا ہے:۔

بس اے خاقانی از سودائے فاسد   کہ شیطاں میکند تلقین سودا

اسی قصیدے سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ خاقانی کا کمال زیادہ تر تلمیحات پر منحصر ہے۔ سارا کلیات دیکھ جاؤ۔ تشبیہ۔ استعارہ تخئیل بیشتر اسی رنگ کی تلمیحات میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ خاقانی کا معرکہ آرا قصیدہ حقائق تصوف میں بھی اسی رنگ کا ہے جب تک مصطلحات علمیہ و معارف صوفیہ وغیرہ کا علم نہ ہو سمجھنا مشکل ہے مثلاً کہتا ہے:۔

کے کیں خضر معنی راست دامنگیر چوں موسیٰ

کف موسیٰ و آب خضر بینی در گریبانش

ہمہ تلقینش آیاتے کہ خاموشیست تاویلش

ہمہ تعلیمش اشکالے کہ نادانیست برہانش

بعض مقامات خوب کہے ہیں:—

چناں در جوئے تلقین مرا بگداخت کاندر من
نہ شیطاں ماند و وسواسش نہ آدم ماند و عصیانش

\+ + + + +

\+ + + + +

زہے تحصیل دانائی کہ سوئے خود شدم ناداں
کرا استاد دانا بود چوں من کرد نادانش

چہ طوطی کائنہ بیند شناس خود نیفتد پے
ز خود در خود شود حیراں کند حیرت سخندانش

مشکل یہ ہے کہ خاقانی کے اشعار کی تشریح کی ضرورت ہے اور یہ کتاب مختصر ان تفاصیل کو برداشت نہیں کر سکتی ورنہ اس کا مبلغ علم ناظرین کو معلوم ہوتا۔ ہاں! اتنا ضرور یاد رکھنا چاہیئے کہ اس طرز کا خود ہی موجد تھا اور اپنے ہی اوپر ختم کر گیا۔ کسی سے اس کی تقلید بھی نہیں ہو سکی کیونکہ جن باتوں کا اس نے التزام کیا ہے یا کرتا ہے ان کو قائم رکھتے ہوئے ایک ہی زمین میں کئی کئی سو شعر کے قصیدے کہتا ہے اور نباہ لے جاتا ہے۔ خصوصاً مشکل ردیف اور قافئے پر اتنی حکومت ہے کہ اسکے آگے بالکل پانی ہو جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ سہی مگر شیرینی نہ ہونے کی وجہ سے ملائیت کا غلبہ اور شاعریت کا اضمحلال ہے۔ البتہ جہاں کہیں ان جھگڑوں سے پاک ہو کے کہتا ہے۔ بات ہی اور ہو جاتی ہے۔ شراب کی تعریف میں سنو:—

مے آفتابِ زرفشاں جامِ بلورش آسماں
مشرق کفِ ساقیش داں مغرب لبِ یار آمدہ

غزلوں میں بھی وہی علمی رنگ غالب ہے کیونکہ اس زمانے تک غزلوں کی

قصیدے کی تشبیب سے زیادہ حیثیت بھی ایسے صاف شعر شاذ و نادر ہیں :-

ہمسایہ شنید نالہ ام گفت خاقانی را دگر شب آمد

ہجو اور فخریات میں حد سے زیادہ تجاوز کر جاتا ہے اور بعض اشعار تو ایسے کہہ گئے ہیں جن کے نقل کرنے سے روحِ ایمانی کو اذیت ہوتی ہے۔

مثنوی کی حالت بھی قصائد سے ملتی جلتی ہے اور اُسی رنگ کا پورا اثر اس پر بھی موجود ہے۔ علیحدہ تنقید کی ضرورت نہیں۔

ظہیر

ظہیر فاریابی۔ ملک الکلام صدر الحکما ظہیر الدین محمد بن طاہر بن محمد رشیدی سمرقندی کا شاگرد ہے اور ترکستان کے ایک قریہ فاریاب کا رہنے والا۔ وطن چھوڑ کے بعدِ تکمیلِ علم نیشاپور آیا اور طغانشاہ بن مؤید کی مدح سرائی کی۔ پھر مازندران گیا اور حسام الدولہ اردشیر بن حسن اسپہبد مازندران کا مداح ہوا اصفہان میں قسمت آزمائی کے لئے گیا تو صدر خجند سے نہ بنی۔ آخر آذربائیجان میں آ کے جہاں پہلوان محمد بن یلدگز کے دربار کا شاعر ہوا اور اُس کی وفات کے بعد قزل ارسلان کی مداحی کرتا رہا پھر نصرۃ الدین ابوبکر بن محمد بن یلدگز کا مدح سرا ہوا۔ ایک قصیدہ سلجوقیوں کے آخری بادشاہ طغرل کی تعریف میں بھی نظم کیا ہے جس سے وہاں کا تعلق بھی معلوم ہوتا ہے۔ آخر میں تارک الدنیا ہو گیا یہانتک کہ ۵۹۸ھ میں وفات پائی اور تبریز کے مقبرۃ الشعراء سرخاب میں دفن ہوا۔ خاقانی کے برابر اسکی بھی قبر دیکھی گئی ہے۔

ظہیر کی شاعری پر نقادانِ سخن کی رائیں ہمیشہ معرضِ بحث میں رہیں۔ کوئی کہتا ہے :-

دیوانِ ظہیر فاریابی در مکہ بدزد اگر بیابی [۱]

---

[۱] مجمع الفصحا میں لکھا ہے کہ یہ شعر ظہیر کی تعریف میں نہیں کہا گیا بلکہ ملا جامی کی ہجو میں ایک شخص نے یہ اشعار کہے ہیں :-

اے بادِ صبا بگو بہ جامی ۔ آں دزدِ سخنوران نامی ۔ بُردی اشعار کہنہ و نو ۔ از سعدی و انوری و خسرو ۔ اکنوں کہ سرِ حجاز داری ۔ و آہنگ حجاز ساز داری ۔ دیوانِ ظہیر فاریابی ۔ در مکہ بدزد اگر بیابی ۔ مگر صاحبِ مجمع الفصحا کا یہ خیال درست نہیں۔ ممکن ہے کہ شاعر نے اس مشہور شعر کی تضمین کر دی ہو یا خود ہی کہا ہو۔ بہر حال ظہیر کی بزرگی کا اقرار ضرور ہے۔

مجد ہمگر[1] انوری کو ظہیر پر ترجیح دیتا ہے مگر ظہیر کی عظمت کا بھی معترف ہے:-

شعر یکے برآمدہ چوں دُرِ شاہوار — نظم دگر برآمدہ چوں سحر خاوری

شعر ظہیر اگرچہ برآمد جنسِ شعر — برتر ز انوری نہ زندلاف شاعری

امامی ہروی دونوں کو یوں سراہتا ہے (ضمیر قریب انوری کے لئے ہے اور بعید ظہیر فاریابی کے لئے):-

این معجز ست وآں سحر — آں شمع و این چراغ

این ماہ وآں ستارہ — این حور و آں پری

دولت شاہ کہتا ہے "افاضل واکابر متفق اند کہ سخن ظہیر نازک تر و با طراوت تر از سخن انوری ست" حقیقت یہ ہے کہ نقادانِ سخن نے اس معاملے میں بہت افراط و تفریط سے کام لیا ہے۔ نہ انوری پیغمبر سخن ہے نہ ظہیر بالکل بے حقیقت اگر انوری نے متانت و جزالت کے ساتھ ساتھ بلند مضامین پیش کئے تو ظہیر نے بھی شوخیِ بیان اور شیرینیِ ادا کو کمال پر پہونچا کے مضمون آفرینی کی۔ ان دونوں شاعروں کے پہلے قصیدہ گوئی میں الفاظ کی صنعت گری پر زیادہ زور دیا جاتا تھا یہانتک کہ امیر معزی اور عبدالواسع جبلی وغیرہ بھی انھیں جھگڑوں میں پھنسے رہتے تھے۔ کبھی ہم وزن الفاظ کا التزام تھا۔ کبھی مرادف الفاظ کی بھرمار تھی۔ ان دونوں نے معنویت نظم کو ان بیہودہ التزامات پاک کیا اور آورد سے بچا کے زبان شعر میں روانی اور آمد پیدا کی بلکہ ظہیر اس معاملہ خاص میں انوری سے بھی بہتر ہے۔ اگر مضمون کی بلندی یہ چاہتی ہے کہ زبان میں بھی دقت پیدا ہو جائے تو وہ غالب آجاتا ہے۔ مضمون کے بعض اجزا

---

[1] مجد ہمگر کی تقسیم کی نظر نے امامی کو سعدی سے بڑھا دیا ہے چنانچہ شیخ صاحب نے ناراض ہو کے کہا:-

ہمگر کہ بعمر خود نکردست نماز — لایق نیست کہ ہرگز بہ امامی نرسد

ترک کرکے اتنا ہی نظم کرتا ہے جتنا سلاست زبان کو باقی رکھ سکے۔ یہ امر ذرا نازک ہے۔ مزید توضیح کے لئے ہم ایک مثال دیتے ہیں۔ ارباب حال کا اعتقاد ہے کہ فنا ہونے سے بقا ملتی ہے۔ اسی مسئلہ کو ایک شاعر (وحدت تخلص) دو طرح حل کرتا ہے۔ ایک ریاضی کے قاعدے سے جس میں یہ مانا گیا ہے کہ منفی کو اگر منفی سے ضرب دیں تو مثبت ہو جاتا ہے اور علم معانی نے بھی زبان میں یہی کلیہ جاری کیا ہے کہ نفی پر اگر نفی لگائی جائے تو اثبات ہے۔ لہذا چونکہ یہ دنیا فانی ہے اور ہم بھی فانی ہیں اگر فانی پر فنا طاری ہوگی تو نتیجہ بقا ہو جائے گا۔ دوسری شاعرانہ تمثیل پر نظر ہے یعنے موجودات خارجیہ سے بذریعہ حسن تعلیل اپنا مدعا ثابت کرنا مثلاً شمع کی حالت ہے کہ جب تک اس بزم فانی میں روشن یعنے زندہ ہے فنا ہو رہی ہے اور جب وہ مردہ ہو جاتی ہے یعنے بجھا دی جاتی ہے تو باقی رہتی ہے۔ شاعر حقیقت و مجاز دونوں نظر رکھ کے کہتا ہے:—

چو نفیِ نفی اثبات است از مردن نمی ترسم　　بقاے من چو شمع کشتہ باشد در فنائے من

انیس کا مذاق سلیم اس کلیہ کو جانتا ہے مگر اتنا وزنی سمجھتا ہے کہ اردو زبان کی نزاکت اس کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی لہذا شاعرانہ تمثیل مصرعہ دوم میں باقی رکھتا ہے اور حقیقت کا صرف نتیجہ خوشگوار الفاظ میں ادا کرتا ہے تاکہ اہل علم کی نظر اُن مسائل پر پہونچ جائے اور معمولی استعداد کے لوگ بھی گھبرا نہ جائیں کہتا ہے:—

خود تو پیدا زندگی لائی قضا میرے لئے　　شمع کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لئے

ظہیر کا مذاق انیس سے ملتا جلتا ہے۔ چاہتا ہے کہ ممدوح کو یوسف علیہ السلام پر ترجیح دے اور اُن کی پوری لائف پر نظر ڈالتا ہے۔ ابتدا میں شمس و قمر اور گیارہ ستاروں کا خواب میں سجدہ کرتے ہوئے دیکھنا۔ پھر مصائب شدیدہ مدت تک برداشت کرکے سلطنت پانا اور مصر کا مسخر ہونا فرق یہ نکالتا ہے

کہ ممدوح کی حکومت زمانہ پر ہے (یعنے واقعات عالم کو اپنی مرضی کے موافق چلاتا ہے) اور زمانہ گردش فلک کا نام ہے جس میں ستارے بڑے ہوئے ہیں۔ لہذا یہ سب مطیع ممدوح ہیں دیکھو کتنے شیریں الفاظ میں کہتا ہے:۔

ستارہ سجدہ کند طلعتِ منیر ترا   زمانہ بوسہ دہد پایۂ سریر ترا

وہاں خواب تھا یہاں "دعا" حقیقت ہے۔ پھر طلعت منیر کہکے حسن کی طرف اشارہ کر دیا جسکے ساتھ "یوسف" کا خیال آجانا لازم ہے جیسے سخاوت کے ساتھ حاتم کا خیال آجاتا ہے۔ اور "منیر" کے معنے ہیں روشن کرنے والا۔ ابہام یہ ہے کہ شاید ستارہ اس وجہ سے سجدہ کر رہا ہے کہ ممدوح کا حسن روشنی بخشنے والا ہے۔ غرض عجیب لطف ہے جو بیان سے باہر ہے۔ مشکل ردیفیں ہوں یا آسان۔ زبان کا بادشاہ سب کو پانی کر دیتا ہے۔ ذرا چند شعر دیکھو:۔

تراست لعل شکر بار در میاں گوہر   میان لعل چرا کردۂ نہاں گوہر
بخندہ چوں لب یاقوت رنگ بکشائی   ز شرم زرد شود ہمچو زعفراں گوہر
اگرچہ سیم و زرم نیست ہست گوہر نفس   کہ نزد عقل بہ از صد ہزار کاں گوہر
سزد کہ سنگ نیاید ترا ز صحبت من   چرا کہ سنگ ندارد ز ریسماں گوہر

یہ ردیف اور یہ روانی پھر فی البدیہہ طویل قصیدہ کہدینا۔ کمال شاعری نہیں تو کیا ہے؟۔

دوسری بات ظہیر کے کلام میں یہ ہے کہ اسکے قصائد سرے سے اخیر تک یکساں ہوتے ہیں۔ انوری کے یہاں ظہیر کی سی ہمواری نہیں ہے۔ اگر بلند شعر ہے تو ظہیر کی رسائی وہاں تک دشوار اگر پست تو بالکل ہی پست تیسری خصوصیت اسکے کلام کی یہ ہے کہ خیال بندی میں متاخرین کے لئے شاہ راہ کھول گیا ہے۔ ممکن ہے کہ انوری کے یہاں بھی یہ بات ہو مگر زبان اور عنوان ادا

میں ظہیر کی متاخرین سے مشابہت ثابت کرتی ہے کہ اسکی تقلید کی گئی ہے:-

اندیشہ کہ گم شود از لطف در ضمیر　　گردوں بہ راز باکمرت درمیاں نہاد

یعنے معشوق کی کمر ایک ایسا لطیف خیال ہے کہ ضمیر میں چھپ جاتا ہے۔ آسمان نے یہ خیال بطور راز کمر کے سپرد کردیا کہ کسی پر ظاہر نہ کرنا۔ پھر "درمیاں نہاد" کا لطف کس طرح بیان ہو۔ چوتھی بات یہ ہے کہ تشبیہات اور استعارات میں بھی لطافت ادا سے تازگی پیدا کرتا ہے۔ انوری کے شعر ماہِ نو کی تشبیہات میں یہ ہیں:-

دیدم اندر سواد طرۂ شب　　گوشوارِ فلک (ماہ نو) زگوشۂ بام
گفتم آں نعلِ خنگ (گھوڑا) دستور (وزیر) ست　　قرۃ العین و فخر آل نظام

یہی تشبیہ اور گریز منطقی رازی کے یہاں پہلے نظم ہو چکی تھی (دیکھو شعر العجم جلد اول) ایک اور مقام پر کہتا ہے۔

مہِ گردوں مگر بیمار گشتہ　　کہ نالید و تنش بگرفت نقصاں
بسانِ گوی سیمیں بود اکنوں　　برآمد بر فلک چوں نوک چوگاں
تو گفتی خنگ صاحب تاختن کرد　　فگند ایں نعل زریں در بیاباں

معزی کی رباعی الخیں تشبیہات ماہ نو کے متعلق ابھی درج ہو چکی ہے اب ذرا میر کا قصیدہ پڑھو:-

ں بر فلک طلیعۂ (طلائی) شب آشکار　　آفاق ساخت کسوت (لباس سیاہ) عباسیاں شعار
راشد از کرانۂ میدانِ آسماں　　شکلِ ہلال چوں سرِ چوگان شہریار
رم زرِ پختہ بدیں لوحِ لاجورد　　نونے کہ آں بہ خطِ خفی کردہ شد نگار
ے فلک چو لجۂ دریا و ماہِ نو　　مانند کشتئے کہ ز دریا کند گذار
مثالِ ماہیِ یونس میانِ آب　　آہنگِ درکشیدنِ او کردہ از کنار

یا ہمچو یونس آمدہ بیروں ز بطنِ حوت — اُفتادہ بر کنارۂ دریا نحیف و زار
در معرضِ خلافِ جہانے ز مرد و زن — تو بیش در نظارۂ و خلقے در انتظار
من با خرد بحجرۂ خلوت نشستہ ام — گفتم کہ اے نتیجۂ الطافِ کردگار
باز ایں چہ نقشِ بوالعجب و شکلِ نادر است — کز کارگاہِ غیب ہمی گردد آشکار؟
آں شاہد از کجاست کہ ایں چرخِ شوخ چشم — از گوشِ او برون کشد ایں نغز گوشوار؟
گردوں ز بازوے کہ در ید ست ایں طراز؟ — گیتی ز ساعدِ کہ ربود ست ایں سوار؟
گر جرمِ کوکب است چرا شد چنیں دو تاہ؟ — ور پیکرِ مہ است چرا شد چنیں نزار؟
گفت آنچہ برشمردی ازیں جملہ ہیچ نیست — دانی کہ چیست با تو بگویم بہ اختصار
نعلِ سمندِ شاہِ جہان است کاسماں — ہر ماہ بر سرش نہد از بہرِ افتخار

دیکھو! جو نرالی تشبیہیں ہیں ان کو نیا لباس محض حسنِ ادا سے پہنا دیا ہے اور جو نئی ہیں وہ تو اپنے لئے مخصوص کر لے گیا ہے۔ ہر شعر کی لطافت بیان کرنے کے لئے تفصیل چاہئے مگر کتاب مختصر ہے۔ اتنی گنجائش کہاں سے آئے۔ غزل گوئی کے متعلق اتنا کہنا ضروری ہے کہ ایسا نازک خیال اور شیریں زبان اس صنفِ شعر کے لئے نہایت موزوں ہے مگر غزلیات ملتے نہیں اور جو غزلیں قصائد کے بعد کلیات مطبوعہ منشی نولکشور لکھنؤ میں طبع ہوئی ہیں وہ اسکی ہیں نہیں۔ کوئی دوسرا شاعر ظہیر تخلص ہے جس نے بعض مقامات پر صائب کی شاگردی کا اقرار کیا ہے۔ لہذا اس صنف پر تنقید نہیں کی جاتی ہے۔

اب قصیدہ گویوں کا حال ختم کیا جاتا ہے (اگرچہ حسن[1] غزنوی۔ ادیب صابر[2]۔ سوزنی[3]۔ مجیر[4] بیلقانی۔ فلکی[5] وغیرہ وغیرہ بکثرت شعراء ہیں جنکے حالات پر نظر رکھنا فنِ تاریخ و تنقید کے طالب کے لئے ضروری ہے) اور نظامی گنجوی کا حال لکھا جاتا ہے جس کا سکندر نامہ محیر العقول ثابت ہوا ہے اور پروفیسر براون کی

نظر میں تو شاہنامہ سے بھی بہتر ہے۔

نظامی گنجوی

نظامی گنجوی۔ ابو محمد نظام الدین الیاس بن یوسف ترکی المؤید القمی[۱]۔ ماں باپ کا سایہ بچپن ہی میں اٹھ گیا۔ ماموں نے پرورش کی مگر وہ بھی نہ بچے۔ درسیات سے فارغ ہوکے شاعری کیطرف توجہ کی اور ایسا کمال پیدا کیا کہ سلاطین کو انسے ملنے کا اشتیاق ہوا اور اکثر بادشاہوں نے انکے تصانیف اپنے نام پر معنون کرالے۔ پہلی تصنیف مثنوی مخزن اسرار ہے جو ۲۶ برس کی عمر میں نظم کرکے (۵۵۹ھ) بہرامشاہ کو نذر کی اور پانچہزار اشرفیاں۔ ایک قطار اونٹوں کی اور بیش قیمت کپڑے انعام میں پائے۔ مثنوی شیریں و خسرو طغرل ارسلاں کے لئے نظم کی اور ۵۸۴ھ میں لیلیٰ و مجنوں خاقان کبیر منوچہر بن اخستان کو نذر دی۔ پھر ہفت پیکر کو نظم کیا اور آخر میں سکندر نامہ ابوبکر نصرۃ الدین محمد کے نام پر ۶۰۰ھ میں لکھا۔ اسکے بعد زندگی نے وفا نہ کی اور غالباً ۶۰۶ھ میں رہگرائے ملک بقا ہوئے۔

ان پانچ مثنویوں کے علاوہ جو خمسۂ نظامی کہلاتی ہیں قصائد اور قطعات وغزلیات بھی نظم کئے تھے جنکے اقتباسات تذکروں میں ملتے ہیں۔ غزل کی ابتدا داغ بیل ڈالنے والوں میں نظامی کا نام لینا چاہئے اگرچہ وہ سکندر نامہ کے مصنف کی حیثیت سے بہت پست ہیں۔ البتہ سادگی اور سلاست ضرور ہے:—

پیشِ تو گر دہم شیاں حالِ تباہِ خویش را — تا تو نصیحتے کنی چشمِ سیاہِ خویش را

سرزنشم مکن کہ تو شیفتہ تر ز من شوی — گر نگری در آئینہ روئے چو ماہِ خویش را

۱؎ مولانا شبلی نے تحقیق کرکے بتایا ہے کہ اصل وطن (مضافات قُم سے) تفرش تھا۔ باپ وطن چھوڑکے گنجہ آئے اور نظامی یہیں پیدا ہوے اسوجہ سے گنجوی کہلائے۔ خود سکندر نامہ میں کہتے ہیں:— چو دُر گرچہ در بحرِ گنجہ گمم ۔ ولے از قہستانِ شہرِ قُمم۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اصلاً کُرد تھے۔

کہیں کہیں شوخی بھی کر جاتے ہیں :-

بوسہ میخواہم ازاں لب تو چہ میفرمائی ۔۔ گر صواب است بگو - ورنہ خطائے بکنم

فقر و سلوک کا رنگ مزاج میں غالب آگیا تھا بلکہ ابو الفرج زنجانی کے مرید بھی ہوگئے تھے اسلئے کہیں کہیں غزلوں میں یہ رنگ بھی نظر آتا ہے اور لطافت کے ساتھ :-

شبے تیرہ است و درہ مشکل جنیبت راعناں درکش
زمانے رخصت ہستی را بخواہ و تنگا و جاں درکش

طریقش بے قدم می رو و جمالش بے بصر می بیں
کلامش بے زباں میخواں شرابش بے دہاں درکش

یہ بھی کیا خوب کہا ہے :-

عشق زحمت بر نتابد کاشنائے خلوت است
چوں تو با عشق آشنائی از ہمہ بیگانہ شو

قصائد میں سنائی کا رنگ غالب ہے بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ سنائی پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس صنف سے اُمرا کی مدح سرائی کے بدنما داغ کو مٹا دیا اور عالم شعر میں ایک مثال قائم کر دی کہ اس سے بہت مفید کام لئے جاسکتے ہیں ۔ چنانچہ انکے قصائد میں مواعظ و نصائح نہایت عمدہ نظم ہوئے ہیں اور بعض قطعات تو اس رنگ میں لاجواب ہوئے ہیں ۔ ذیل میں ایک قطعہ درج کیا جاتا ہے جسکے متعلق مولانا شبلی کا دعوی ہے کہ اس کا جواب آج تک نہ ہو سکا :-

دوش از غم بخرابات و مرا راہ نبود ۔۔ میزدم نالہ و فریاد و کس از من نشنود
یا نبد ہیچکس از بادہ فروشاں بیدار ۔۔ یا کہ من ہیچکس ام ۔ ہیچ کسم در نگشود
پاسے از شب بگذشت[۱] بیشترک یا کمتر ۔۔ رندے از غرفہ بروں کرد سر و رخ بنمود

---

(۱) ایسے حرف سوقوف کو تقطیع میں ساقط کرنا اس زمانے میں رائج تھا ۔

گفت خیر ست! دریں وقت کرا میخواہی؟ — بے محل آمدنت بر در ما بہر چہ بود
گفتمش در بکشا، گفت برو ہرزہ مگو! — کاندریں وقت کسے بہر کسے در نکشود
ایں نہ مسجد کہ بہر لحظہ درش بکشایند — کہ تو دیر آئی و اندر صف پیش استی زود
ایں خرابات مغان است و درو رنداں اند — شاہد و شمع و شراب و شکر و نای و سرود
ہرچہ در حلقۂ آفاق - دریں جا حاضر — مومن و برہمن و گبر و نصارا و یہود
گر تو خواہی کہ دم از صحبت ایشاں بزنی — خاک پائے ہمہ شو تا کہ بیابی مقصود

تصوف کے رنگ میں اگر شراب و ساقی و رند وغیرہ کے معنے لیے جائیں تو فی الحقیقت یہ قطعہ ایسا لطیف ہے جس کا لطف غیر فانی ہے۔ بار بار پڑھو مگر جی سیر نہیں ہوتا۔ یہ ہے شعر کا اثر اگر حقیقت سے لگاؤ ہو۔

مثنویاں نظامی کی آیات کمالات ہیں اور اس حقیقت رس ذات کی عظمت کو ظاہر کرتی ہیں **مخزن اسرار** عہد جوانی کی تصنیف ہے اور ابتدائی تصنیف جس میں حقائق تصوف پر زمزمہ سرائی کی ہے۔ بحر بھی غالباً سب سے پہلے مثنوی کے لئے نظامی کی لائی ہوئی ہے۔ اگرچہ اس مثنوی کے جواب میں مولانا شبلی نے تقریباً ستاون (۵۷) مثنویوں کے نام لکھے ہیں مگر اسکے خصائص اپنے ساتھ ہیں۔ یہ مثنوی بہرام شاہ کو نذر کی گئی ہے اور آزاد خیالی ایسی ہے کہ اسکے سامنے سنجر سلجوقی کا ایک واقعہ بیان کیا ہے جس میں ایک بڑھیا کے آگے بڑا اچھا لکھا ہے تاکہ بادشاہوں کو عبرت ہو:—

پیر زنے را ستمے در گرفت — دست زد و دامن سنجر گرفت
کاے ملک آزرم تو کم دیدہ ام — از تو ہمہ سالہ ستم دیدہ ام
شحنۂ مست آمدہ در کوے من — زد لگدے[1] چند فرا روے من

---

[1] ٹھوکریں۔

بے گنہ از خانہ بروں کشید — موے کشاں بر سر خونم کشید

گفت فلاں نیمشبے کو بہ کشت — بر سر کوے تو فلاں را کہ کشت

گر ندہی داد من اے شہریار — یا تو و روز شمار این شمار

چونکہ تو بیدادگری پروری — ترک نۂ ہندوے غارتگری

شیریں و خسرو کو نظم کر کے عشقیہ شاعری کا راستہ کھول دیا۔ اگرچہ غزلیں پہلے بھی کہی گئی تھیں مگر مثنوی میں تمام وہ مقامات نظم کر دئے ہیں جو غزل کے لوازم سے ہیں اور نازک تشبیہوں اور استعاروں سے ایک لطف خاص پیدا کر کے اس صنف کی زبان کی داغ بیل ڈال دی ہے۔ شیریں کے حسن کی تعریف میں یہ شعر دیکھو اور غزل گویوں کی زبان سے اسی مضمون کو سنو تو کہہ دو گے کہ نظامی اس طرز ادا کا موجد ہے۔ شیریں نہانے جاتی ہے اور شاعر کہتا ہے:-

چو قصد چشمہ کرد آں چشمۂ نور — فلک را آب در چشم آمد از دور

شیریں چشمے کی طرف نہانے چلی۔ آسمان کو رنج ہوا کہ محض آبی رنگ ہونا بیکار ہے۔ کاش میں فی الحقیقت دریا ہوتا تو یہ لطف مجھے نصیب ہوتا۔ اس رنج کی وجہ سے آسمان کی آنکھ میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ (آفتاب کے تھرتھرانے کی حسن تعلیل ہے۔ کیا یہ معنے بھی ممکن ہیں کہ آنکھ جب تیز روشنی کو دیکھتی ہے تو پانی بھر آتا ہے۔ آفتاب نے شیریں کو دیکھا تو یہ حال ہو گیا؟):-

پرند آسماں گوں در میاں زد — شد اندر آب و آتش در جہاں زد

آبی رنگ کی چادر لپیٹ کے پانی میں نہانے اتری اور دنیا میں آگ لگا دی (اس وقت حسن میں جو دلفریبی پیدا ہو گئی تھی وہ دنیا کے دل میں عشق کی آگ بھڑکا رہی تھی)۔

ایک مقام پر شیریں کا بگڑنا ہر گڑنا نظم کیا ہے کہتا ہے

محبت کا جوش ہے :-

بخشش ناز بے اندازہ میکرد ، بہ دیگر چشم عذرے تازہ میکرد
چو سر پیچید گیسو مجلس آراست ، چو رخ گردید گردن عذر ہا خواست

غرض ساری مثنوی نہایت مزے کی ہے اور پڑھنے کے قابل - ایک دوست نظامی کو یہ داستان نظم کرنے سے منع کرتے تھے مگر جب اشعار سنے تو کہدیا :-

چنیں سحرے تو دانی ساز کردن ، بتے یا کعبہ انباز کردن

لیلیٰ و مجنوں میں دوسرا کمال دکھایا ہے - شیریں و خسرو میں ایرانی مناظر قدرت عشق و حسن کی داستان میں جان ڈالتے تھے - عرب کے مناظر میں وہ لطف کہاں مگر بادشاہ کی فرمائش - کیا کیا جائے - دقتوں کا احساس ہوا :-

نے باغ و نہ بزم شہریارے ، نے رود و نہ مے نہ کامگارے
بر خشکی ریگ و سختی کوہ ، تا چند سخن رود در اندوہ

بہرحال چار ماہ میں نظم ہو گئی :-

من گفتم و دل جواب می داد ، خاریدم و چشمہ آب می داد
ایں چار ہزار بیت و اکثر ، گفتم بہ چہار ماہ کمتر
گر شغل دگر حرام بودے ، در چاردہ شب تمام بودے

اگر آغاز شاعری میں یہ داستان نظم کرنی پڑتی تو نہ یہ پختگی آتی نہ یہ کامیابی مشق سخن نے اتنا حوصلہ بڑھادیا تھا کہ ایسا سنگلاخ وادی طے کرنا دو ہفتہ کا کام تھا -

ہفت پیکر بہرام گور کی داستان ہے کہ قصر خورنق میں داخل ہوا اور سات تصویریں دیکھیں یہ ہندوستان چین - خوارزم - صقلاب ایران روم اور مغرب کی شاہزادیاں تھیں دل میں امنگ ہوئی کہ ان سے شادی

کرنا چاہیئے - جب بادشاہ ہوا تو سات شہزادیوں سے ملا اور ہر ایک نے قصّے سنائے (مثنوی میں الف لیلہ کا مزا پیدا ہو گیا)- آخر میں بہرام کے انتقال کا حال ہے اور مثنوی ختم ہے - اس مثنوی میں نظامی نے بہرام گور میں عربی اور عجمی اخلاق کا مجموعہ دکھایا ہے کیونکہ اسکی ابتدائی تربیت عرب میں ہوئی تھی (غالباً یہی وجہ تھی کہ قبل اسلام کی شاعری میں اس کا مصرعہ "نام بہرام مرا و پدرم بو جبلہ"[1] عربی لفظ پر ختم ہے -

آخری تصنیف سکندر نامہ ہے جسکی وجہ سے نظامی کو دنیائے شاعری میں مثال بے مثالی حاصل ہوئی - اس مثنوی کے دو حصے ہیں برّی اور بحری - پہلا حصہ رزمیہ ہے اور دوسرا مذہبی اور اخلاقی - خود سکندر کے متعلق کہتے ہیں :-

گروہیش خوانند صاحب سریر — ولایت ستان بلکہ آفاق گیر
گروہے ز دیوان دستور او — بحکمت نوشتند منشور او
گروہے ز پاکی و دیں پروری — پذیرا شدندش بہ پیغمبری
من از ہر سہ دانہ کہ دانا فشاند — درختے برومند خواہم نشاند

رزمیہ حصہ کے متعلق یاد رکھنا چاہیئے کہ اگرچہ شاہنامہ کے مقابلہ میں قطرہ اور دریا کی نسبت ہے مگر پھر بھی کچھ ایسے شان سے نظم ہو گیا کہ سکندر نامہ ختم ہوتے ہی فارسی زبان میں رزمیہ شاعری کا کمال بھی ختم ہو گیا - سو برس کے بعد گوشہ نشین نظامی کے دل میں امنگ ہوئی - زبان بدل چکی تھی - خیالات میں انقلاب پیدا ہو گئے تھے - طرز ادا کی روش بدلنے کے خود ہی ذمہ دار تھے لطیف استعارے اور تشبیہیں زبان کے حظ کو بڑھا رہی تھیں - صاف شفاف چشمے کا پانی پینے والے برفاب اور قند اب کے جویا تھے - ایسے وقت میں سکندر نامہ کا

[1] یا اسکی معشوقہ کا مصرعہ "نام بہرام ترا و پدرت بو جبلہ" دیکھو صفحہ

عالم وجود میں آنا اہلا وسہلا کی آوازوں کا مستحق ضرور تھا۔ یہ داستان اگرچہ ایک ہی شخص کی تھی اور وہ بھی رومی النسل جس کی طرف عام دلچسپی مشکل سے ہو سکتی تھی اسکے علاوہ نظم میں بھی تعقیدات لفظی و معنوی موجود[۱] اور تاریخی غلطیاں سدّراہ۔ نہ ایران کا انسائیکلو پیڈیا نہ یونان کا۔ یہ سب کچھ سہی مگر شاعری کا زور ہر وقت پر غالب ہے اور فردوسی سے[۲] مقابلہ کے لئے تیار۔ اور بعض مقامات (اگرچہ شاذ و نادر ہیں) ایسے بھی ہیں جن کا رنگ فردوسی سے چوکھا ہے خصوصاً دارا کی آخری لڑائی اور قتل کا حال جس خوبی سے ادا ہوا ہے اُسکی نظیر شاہنامہ میں بمشکل ملیگی۔ اختصار کے لحاظ سے اُسوقت کا حال نقل کیا جاتا ہے جب دارا زخم کھا کے گرا اور سکندر سرہانے آیا تو دیکھا کہ دارا دم توڑ رہا ہے اسکے آنسو بھر آئے اور بکمال شفقت اُس کا سر اُٹھا کے اپنے زانو پر رکھا۔ دارا نے آنکھ کھولی تو دشمن کو سرہانے پایا عجیب عجیب خیالات دل میں پیدا ہوئے۔ کچھ مایوسی۔ کچھ ہراس۔ کچھ شاہی آن بان کا خیال۔ غرض اس کشمکش کی تصویر جیسے دلگداز الفاظ میں کھینچی ہے۔ وہ پڑھنے کے قابل ہے:۔

چو دارا بر و پیش نگہ کرد و دید	بسوز جگر آہ از دل کشید
چنین داد دارا بخسرو جواب	کہ بگزار تا سر نہم من بخواب
رہا کن کہ در من رہائی نماند	چراغ مرا روشنائی نماند
سپہرم بد انگونہ پہلو درید	کہ شد در جگر پہلوم ناپدید
تو اے پہلواں کامدی سوے من	نگہدار پہلو ز پہلوے من
کہ با اینکہ پہلو دریدم چو تیغ	ہمی آید از پہلوم ابے تیغ
سر سروراں را رہا کن ز دست	تو مشکن کہ ما را جہاں خود شکست

---

[۱] خود کہتے ہیں ۔ ز تقدیم و تاخیر بر من نگہ ۔ کہ با شکہ از بند دانا گزیر

[۲] کل تنقید شعر العجم حصہ اول میں موجود ہے۔

چہ دستی کہ با مادر اندر کنی | بتاراج گیاں دست بازی کنی
نگہدار دستت کہ دارا ست این | نہ پنہاں چو روز آشکار است این
زمیں را مخنم تاج تارک نشین | بلرزاں مرا تا بلرزد زمین
رہا کن کہ خواب خوشم می برد | زمیں آب و چرخ آتشم می برد

اسکے بعد سکندر کی آہ وزاری ہے اور معذرت۔ پھر دارا کی وصیتیں ہیں جو سکندر نے سنیں اور منظور کیں۔ پھر دارا کی موت کو اسی سکون کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ جتنی آسانی سے اُس کا دم ان واقعات کے بعد نکلا ہوگا:۔

سکندر پذیرفت از و ہرچہ گفت | پذیرندہ برخاست گویندہ خفت

مرنے کے بعد ہی ماتم شروع ہوجاتا ہے اور یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کون پہلے رویا۔ یہاں پر نظامی نے لطف بلاغت دکھایا ہے بجائے اوروں کے خود ہی مرثیہ شروع کردیا:۔

کبودی دکوری درآید بچرخ | کہ بغداد را بے کاخ وکرخ
درخت کیاں را فرو ریخت بار | کفن دوخت بر درع اسفندیار

نظامی کے شاعری پر مجموعی رائے ان الفاظ میں ہوسکتی ہے کہ زبان غیر مانوس اور ثقیل۔ خالص فارسی سے پاک ہے۔ یعنے فردوسی کی طرح خالص فارسی کے دلدادہ ضرور ہیں مگر امتداد زمانہ نے جن الفاظ کو ٹکسال باہر کردیا وہ انکے یہاں نہیں آسکتے بلکہ یہ کہنا بیجا نہوگا کہ جس طرح ناسخ اردو زبان کے ریفارمر ہوئے ہیں نظامی فارسی زبان کے تھے۔ علاوہ بریں طبیعت زوردار تھی اور واقعات میں زور بھر دینا انکے لئے معمولی بات تھی۔ اسی[لہ] غرض سے مختلف اسالیب بلاغت سے کام لیا ہے بلکہ جدید

لہ دیکھو صفحہ (۲۴۲) علم برکش اے آفتاب بلند الخ کر محض خطاب کرکے کلام میں زور پیدا کردیا۔

استعارے اور تشبیہیں پیدا کرنے کی خاص وجہ یہی معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً صبح ہونا ایک معمولی بات ہے اور اس روح پرور وقت کے سماں مختلف شعرا نے نظم کئے ہیں مگر نظامی کی محاکات پر تخیل غالب ہے :-

چو یاقوت خورشید را دُزد بُرد | بہ یاقوت جُستن جہاں پی فشرد
بہ دُزدی گرفتند مہتاب را | کہ او بُرد آں جوہرِ ناب را

وغیرہ وغیرہ۔

ساقی نامہ کا عنوان بھی نظامی ہی کا قائم کیا ہوا ہے۔ اکثر مقامات نظم کر کے اس فرضی شراب کو پی لیتے ہیں اور تھکن مٹ جاتی ہے۔ فلسفیانہ مباحث اگرچہ فردوسی اور ناصر خسرو وغیرہ نے نظم کئے ہیں مگر نظامی کو اس صنف میں امتیاز خاص حاصل ہے۔ اخلاقی شاعری میں تو اسقدر نظم کیا ہے کہ ۵۳ عناوین اخلاق کے تحت میں بکثرت اشعار ایک شخص نے جمع کئے ہیں جیسے مولانا شبلی نے خود لکھا ہے۔ مقامات عشق مجازی و حقیقی کے اظہار انھیں مثنویوں میں نہایت خوبی سے ہوئے ہیں۔ اگر غزل میں یہی مقامات آجاتے تو شاید سعدی و حافظ کی اولیت و اولویت میں فرق آجاتا۔ رزمیہ شاعری کے خصوصیات سکندر نامہ میں اس شان سے برتے کہ گویا یہ نظم اپنے صنف کی خاتم ہوگئی۔ اور شاہنامہ کے بعد اگر کوئی مثنوی ہے تو سکندر نامہ ہے۔

اب ہم شعرائے دور سلجوق سے بکمال حسرت رخصت ہوتے ہیں اور بعض نثر نگاروں کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے زبان فارسی پر اپنے تصانیف بیش بہا کے ذریعے سے احسان کیا ہے۔ امام غزالی۔ ناصر خسرو۔ نظام الملک وغیرہ کا ذکر سابق میں ہو چکا ہے۔ چند ہی نام اور باقی رہ گئے ہیں :-

---

سلہ دیکھو صفحات (۱۱۵ و ۱۱۶ و ۱۳۱)

شاہمرداں بن ابی الخیر نے اسی زمانے میں نزہت نامۂ علائی نثر میں لکھا اور علاء الدین خاص بیگ والی طبرستان کو نذر کیا۔ ابوالمعالی محمد بن عبید اللہ کی تالیف بیان الادیان بھی یادگار ہے جس میں مختلف مذاہب کے حالات درج کئے ہیں اور گردیزی نے ایک کتاب زین الاخبار حالات خراسان میں لکھی ہے۔ کشف المحجوب جلابی مقامات تصوف میں اسی عہد کی تصنیف ہے۔ اور نظامی عروضی سمرقندی کا چہار مقالہ تو اس قدر مقبول ہے کہ یورپ میں اسکے ترجمے ہو گئے ہیں۔

علاوہ بریں ذخیرۂ خوارزم شاہی ایک بیش بہا مجموعہ خوارزمشاہیوں کی یادگار ہے جسے علم طب کا انسائکلوپیڈیا کہنا چاہئے۔ اور قاضی حمید الدین کی مقامات حمیدی نے ایک نیا اسلوب نثر نگاری حریری و بدیعی کے رنگ میں پیش کیا جو عرصے تک نظر قبول سے دیکھا گیا مگر بعد کو پایۂ اعتبار سے ساقط ہو گیا۔ ذیل میں چند سطریں نقل کی جاتی ہیں۔ جن سے اندازہ ہو جائے گا کہ چہار مقالہ اور سفرنامۂ ناصر خسرو وغیرہ کی سادی اور بے تکلف نثر کو چھوڑ کے قاضی صاحب کس طرف چلے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ انشائے عجم کو بھی لے چلے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مصنفین عہد تیموریہ ایرانیوں کی نظر میں گر گئے اور آجتک ہندیوں کی فارسی پر ہنسی ہوتی ہے۔۔۔

سلہ تاریخ ادب میں اسے نظامی عروضی کہا جاتا ہے تاکہ نظامی گنجوی سے جدا نظر آئے۔ اسکا نام نجم الدین احمد بن عمر بن علی ہے اور تخلص نظامی۔ کہتے ہیں کہ ویس و رامین کی داستان بھی اسی نے نظم کی تھی مگر یہ روایت تحقیقی نہیں ہے۔ اسکی کتاب چہار مقالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۵۰۴ھ میں یہ سمرقند میں تھا جہاں رودکی کے حالات سے اطلاع پائی۔ ۵۰۶ھ میں نیشاپور گیا اور عمر خیام کے فیض صحبت سے مستفیض ہوا۔ طوس میں جا کے فردوسی کی قبر کی زیارت کی اور اسکے حالات دریافت کئے۔ ۵۳۰ھ میں پھر نیشاپور گیا اور خیام کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔ اسی کتاب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ملک الجبال غوریہ کے دربار میں اسکی رسائی تھی اور وہاں سے انعامات وغیرہ بھی حاصل کئے تھے۔

"حکایت کردمرا دوستی کہ حق مرا صحبت عہد صغر داشت و نسبت مصاحبت عہد کبر کہ وقتیکہ سیمای عالم غض و تازہ و طری بود و بساط ہامون استبرق و عبقری ردای و متہا کحلی و شہری بود و طاسے چمہا خیری و معصفری۔

ازبرگ گل بسیط زمیں را بساط بود   در صحن باغ چو بادِ صبح چو پادِ نشاط بود

درکوزہ مے چو دلبرے اندر نقاب بود   در غنچہ گل چو کودکے اندر قماط بود

درو قتیکہ عالم چنیں رنگ و بوے داشت و قدم ہمت عزم جستجوے۔ اتفاق را مجتاز وطاری گذر کردم نہ بروجہ سکون واقامت و نہ بعزم اطالت و اوامت"

کہنا اتنا ہے کہ "میرے ایک پرانے بچپن کے دوست نے بیان کیا کہ بہار کے زمانے میں سفر کرنے کے لئے میں روانہ ہوا" مگر متواتر مترادف الفاظ مشکل لغات۔ اضافتوں کے الٹ پھیر نے فصاحت کو کدھر پھینکا اور رنگ آمیزی کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔ فارسیت یکسر مفقود اور عربی لفظوں کی بھرمار کہ خدا کی پناہ۔ ورنہ اسی زمانے میں تاریخ بیہقی اور چہار مقالہ ایسی کتابیں لکھی گئیں جنکی سادگی اور ادائے حسنِ زبان کو دوبالا کر دیا ہے۔
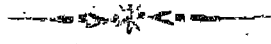
باب ہشتم

تاتاریہ

خوارزمشاہ

خوارزمشاہیوں کے تسلط کا حال سابق میں تحریر ہوچکا ہے۔ علاءالدین محمد خوارزمشاہ کی ملک گیری کا شوق ایسا کامیاب ہوا کہ تھوڑے عرصے میں جبل قاف سے بحر فارس تک اور دریای سندھ سے نہر فرات تک خوارزمشاہیوں کا ڈنکا بجنے لگا اور سب چھوٹی چھوٹی سلطنتیں مستہلک ہوگئیں۔ ناصر باللہ عباسی سے بھی عداوت ہوگئی تھی۔ دربار خلافت کیطرف سے غزنوی لوگ محمد خوارزم کی مخالفت پر آمادہ کئے جارہے تھے اور محمد چاہتا تھا کہ سادات علوی میں سے ایک شخص کو خلیفہ بنا کے عباسیوں کا خاتمہ کردے۔ اس زمانے میں تاتاریوں کو ملک گیری کا شوق ہوا اور

چنگیز خاں

اُنکے بادشاہ چینگیز خاں نے بُغرا کو دو مغلوں کے ساتھ محمد خوارزم کے دربار میں یہ پیام دیکے بھیجا کہ ایک والی نے چند تاجروں کو قتل کرڈالا ہے لہذا اُسے تاتاریوں کے حوالے کیا جاے۔ خوارزم شاہ نے بُغرا کو قتل کرڈالا اور مغلوں کو ذلیل کرکے نکلوادیا۔ یہ ذلت مغلوں کی قُرلتائی (مجلس شورائے ملّی) کو ناگوار ہوئی اور انتقام لینے کا جوش اتنا بڑھا کہ بخارا۔ نیشاپور۔ سمرقند۔ ترمذ اور مرو وغیرہ میں خون کی ندیاں بہادیا اور مساجد و مقابر۔ مدارس و مساکن سب کو یوں کھود کے مسمار کردیا کہ جن مقامات پر چہچہے اور قہقہے رہتے وہاں بجز زاغ و بوم کے کوئی بولنے والا نہ رہا اور جہاں سے تسبیح و تہلیل کی آوازیں بلند ہوتی تھیں وہاں

سوائے بادِ سموم کے خاک اڑانے کے کچھ بھی نہ تھا۔ علاء الدین کی یہ حالت پہونچی کہ شہر بشہر دیار بدیار بھاگا پھرتا تھا اور کہیں اطمینان نصیب نہ تھا۔ ماں، بیویاں، بچے، زر و جواہر سب تاتاریوں کی غنیمت میں آگئے یہانتک کہ خود بھی سنہ ۶۱۷ھ میں دل شکستہ ہو کے مر گیا اور اسکا بیٹا جلال الدین محمد مالک ہوا جو بڑی بہادری سے تاتاریوں کے مقابلے کرتا رہا مگر سوائے ہزیمتوں کے کچھ نہ ملا۔ یہانتک کہ پسپا ہوتا ہوا دریائے سندھ کے اس پار نکل آیا۔ یہاں راجہ جودی پر فتح پائی اور قباچہ امیر سندھ اور التمش سلطان دہلی کو ہیبت زدہ کیا لیکن تاتاریوں کے واپس جانے کی خبر سنکے پھر ایران واپس گیا اور ہر مخالف سلطنت کو تہ تیغ کیا۔ تھوڑے عرصے میں کرمان، فارس، رے اور اصفہان کو تسخیر کر کے خلیفہ عباسی کی فوج کو شکست دیتا ہوا جسر بغداد تک پہونچ گیا۔ پھر گرجستان و تفلس پر قبضہ کیا اور ازسرِ نو خوارزم شاہیوں کی عظمت قائم کر دی۔ سوء اتفاق سے ایک فوج تاتاریوں کی لڑنے آگئی اور جلال الدین کو شکست ہوئی مگر اس ہزیمت کے سلسلے میں بھی گنجہ فتح کر لیا۔ افسوس زندگی نے وفا نہ کی اور ناگہاں سنہ ۶۲۸ھ میں کسی شخص نے اُسے قتل کر ڈالا ورنہ ممکن تھا کہ تاریخ عجم کا رُخ دوسری طرف پھر جاتا۔

جلال الدین محمد خوارزم شاہ

اُدھر چنگیز خاں بھی تین سال پہلے ہی ہلاک ہو چکا تھا اور دو سال سے زائد قرلتائی کو جانشین مقرر کرنے میں صرف ہو گئے بالآخر اسکے بیٹے اکتائی خاں کی تخت نشینی اور خوارزم شاہیوں کا زوال تقریباً ایک ہی سال میں ہوا۔ اسکی حکومت دس برس رہی قراقرم پایۂ تخت قرار پایا اور ایران کے علاوہ روس اور پولینڈ کو بھی فتح کیا جہاں وہی ہیبت اور خونریزی کا منظر دکھلایا گیا جو چنگیز خاں کے حملے سے ایشیا میں ظاہر ہو چکا تھا۔

اکتائی

اکتائی کے بعد کچھ عرصے تک اُس کی بیوہ ترکانیہ حکمراں رہی یہاں تک کہ کیوک

کیوک جنگ روس سے واپس آیا اور ایک عظیم الشان قرلتائی میں تخت نشین ہوا۔ جس میں سفرائے خلیفہ عباسی و شیخ الجبل کے علاوہ پاپائے روم کے سفیر بھی موجود تھے۔ اسکے زمانے میں عیسائیوں نے بیحد کوشش کی کہ تاتاری فوج عیسائیوں کے ساتھ مل کے مسلمانوں کا خاتمہ کر دے بلکہ بغداد اور شیخ الجبل کے سفیروں کو ذلت کے ساتھ نکلوا بھی دیا مگر کوئی خاص کامیابی انکے ارادے کو نہ ہوئی اگرچہ یہ کوشش چنگیز خاں کے وقت سے جاری تھی اور مختلف ممالک مفتوحہ میں یورپ کے مشن کام کر رہے تھے۔

منگو

کیوک کے بعد ۶۴۸ھ میں منگو خاں بادشاہ ہوا۔ اس نے اپنے بھائی قبلا خاں کو تسخیر چین کے لئے اور دوسرے بھائی ہلاکو خاں کو خلافت بغداد اور اسمعیلیوں کا خاتمہ کر دینے کے لئے روانہ کیا۔ قبلا خاں کو چین کی تسخیر میں عظیم الشان کامیابی ہوئی اور

ہلاکو

ہلاکو نے پانچسو برس کی قائم خلافت عباسیہ کو اور ڈیڑھ سو برس کی تحریک اسمعیلیت کو ایسی بے دردی سے تہ تیغ کیا جس کی مثال تاریخ عالم میں شاید قدرت چنگیزی ہی ہو سکتی ہے۔ الموت کا مذہبی دور ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا اور دار السلام بغداد میں ۶۵۶ھ میں وہ تباہی آئی کہ پھر نہ سنبھلا اور آخری خلیفہ مستعصم باللہ کی زندگی کا خاتمہ نہایت عبرت ناک طریقہ سے ہوا۔ عجیب اتفاق ہے کہ ایسے خونریز بادشاہ کے ہمراہ رکاب عطا ملک جوینی۔ محقق طوسی۔ اتابک ابوبکر بن سعد زنگی (سعدی کا ممدوح) اور اتابک بدر الدین لولوئی موصلی سے نامبرآوردہ لوگ تھے۔ غرض اس انقلاب عظیم نے تاریخ کا دوسرا صفحہ شروع کر دیا۔ یہ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ ہیبت ناک منظر اپنے ساتھ انشائے عجم کے لئے روح تازہ لئے ہوئے آتا ہے اور اس خونریز قوم کی حکومت میں فنون جنگ کے اصول شائع ہونگے۔ ہیئت و ہندسہ۔ منطق و فلسفہ۔ کلام و تاریخ پر بے نظیر کتابیں لکھی جائینگی۔ فاتحوں کی وسیع سلطنت چینیوں کو بلاد روم و روس میں اور مغلوں کو اقصائے ہند و یمن تک پھیلا کے آپس میں تبادلہ خیالات و

نقل علوم کے مواقع عطا کریگی۔ ان لامذہب لوگوں کے زمانے میں مذہبی نزاعات فرو
ہوجائیں گے اور عالم اسلام نشر علوم کیطرف ملتفت ہوگا کیونکہ فرمانروائی دوسرے
کے ہاتھ ہوگی۔ عشق حقیقی و مجازی میں نظمیں ایسا سوز و گداز لے آئیں گی جسکی
نظیر قبل میں اسوجہ سے نہیں ملتی کہ مسلمان اسوقت تک مظلوم ہونے کا احساس ہی
نہیں کرسکتے تھے۔ جب دل دُکھتے ہیں تو خدا بھی یاد آتا ہے اور مصائب عشق سے
بھی متاثر ہونے کا موقع ملتا ہے۔ غرض اس دور میں یہ سب کچھ ہوا۔ البتہ رزمیہ
شاعری کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا۔ ٹوٹے ہوئے دل میں اتنا زور کہاں کہ ولولۂ
جنگ کو دکھاسکے۔ ایک فردوسی کا دل ٹوٹا تو یوسف زلیخا بجھ گئی۔ یہاں ساری قوم
تباہ ہے۔ اب رزمیہ جوش و خروش دکھانے کا کون وقت رہا؟

اباقا

ہلاکو کے بعد اُس کا بیٹا اباقا[1] ایلخانیوں کا سرتاج ہوا اور مسیحیوں کی طرفداری
کرکے دول یورپ کی نظروں میں وقار پیدا کیا۔ مصر کے مملوکوں سے اور اسمٰعیلیوں
کے بقیۃ السیف سرگروہوں سے مقابلے رہے۔ جوینی خاندان کا عروج و زوال
اسی کے عہد میں ہوا۔ آخر ۶۸۰ھ میں بیہوش ہوکے ایسا گرا کہ پھر نہ اُٹھا۔

احمد نکودار

پھر اُس کا بھائی احمد[2] نکودار وارث ہوا۔ یہ پہلا ایلخانی تھا جس نے اسلام
قبول کیا اور علمائے عصر کی بہت عزت کی۔ آخر بعض تاتاریوں نے سازش کرکے
اسکی زندگی کا خاتمہ کیا اور ارغون کو ۶۸۳ھ میں تخت پر بٹھلایا۔ شمس الدین جوینی

ارغون

کو کسی قدر عروج اس عہد میں بھی نصیب ہوا تھا۔ آخر ۶۸۳ھ میں ارغون کے
حکم سے قتل کیا گیا۔ مرنے سے قبل یہ رباعی کہی:۔

---

[1] قبلائی خاں چین کا بادشاہ ہوگیا تھا اور تمام تاتاری مقبوضات کا شہنشاہ تھا
ہلاکو اور اسکے وارث عرصے تک اسکے ماتحت بادشاہ رہے جو ایلخانیان ایران کہلاتے تھے

[2] پروفیسر براون کی تحقیق ہے کہ صحیح نام تقودار ہے اور نکودار کاتبوں کی تحریف۔

ورنگر اے چراغ جہاں گشتہ — تا بینی دو صد جہاں گشتہ

کشتگاں زندگان جاوید اند — خاصہ در دست کافراں گشتہ

ارغون لامذہب تھا مگر مسلمانوں کا سخت دشمن۔ اس نے ایک یہودی سعد الدولہ کو اپنا وزیر مقرر کیا جس نے اکابر اسلام کو تہ تیغ کیا اور شعائر اسلام کو بالکل مٹا دیا۔ آخر ۶۹۰ھ میں بادشاہ و وزیر دونوں ختم ہو گئے اور اس کا بھائی گیخاتو تخت نشین ہوا۔ یہ بادشاہ نہایت نیک بخت تھا مگر فضول خرچ۔ اس کا وزیر صدر جہاں بھی نہایت مدبر تھا۔ سیم و زر کی قلت سے مجبور ہو کے کاغذ کا سکہ (نوٹ) جاری کیا جس کا نام چاؤ تھا اور اعلان کیا کہ:۔

گیخاتو

چاؤ اگر در جہاں رواں گردد — رونق ملک جاوداں گردد

لیکن تاجروں نے اس اختراع کو پسند نہ کیا اور مجبوراً پھر طلائی اور نقرئی سکے جاری ہوئے جس سے اور شدید نقصان ہوا اور صرف ایک لفظ (چاؤ) کا فارسی زبان میں اضافہ ہو گیا۔ اس بادشاہ کا خاتمہ اپنے چچا زاد بھائی بائدو کے ہاتھوں ہوا جسے وہ نشہ میں بہت ذلیل کر چکا تھا۔ جمادی الاخری ۶۹۴ھ سے چھ ماہ تک اسکی حکومت رہی آخر ذی الحجہ میں یہ بھی غازان بن ارغون کے ہاتھ سے مقتول ہوا۔

غازان کا نام اس سلسلۂ سلاطین میں سونے کے حرفوں سے لکھنے کے قابل ہے۔ اسکے زمانے میں استقلال اسلام ممالک ایران میں ہو گیا اور آشوب تاتار ہمیشہ کے لیے ختم ہوا۔ خود بھی عربی و فارسی۔ چینی و تبتی و کشمیری بلکہ لاطینی بھی جانتا تھا اور [illegible] علوم کا ایسا شوق تھا کہ [illegible] کو اپنے [illegible] پیش کرنے کا موقع ملا۔ اسی نے [illegible] حکومت قائم کی اور [illegible]

امام حسینؑ و امام رضاؑ کو نہایت آراستہ کیا۔ سلاطین مصر سے بھی کئی مقابلے ہوئے اور بعض میں فتح بھی نصیب ہوئی۔ سنہ ایلخانی کو بغرض درستی حسابات ۱۳ رجب سنہ ۷۰۱ھ (مطابق ۱۴ ۔ مارچ سنہ ۱۳۰۲ء) سے جاری کیا۔ مساجد و مقابر و مدارس وغیرہ کو بھی خاصی رونق دی۔ غرض ایک مستقل سلطنت اسلامی کی بنیاد ڈال کے سنہ ۷۰۴ھ میں راہی ملک بقا ہوا۔

الجائتو — غازان کے بعد اُس کا بھائی الجائتو خاں خدابندہ تخت نشین ہوا جس کا لقب قبل سلطنت خربندہ[۱] تھا۔ محقق طوسی کی درست کی ہوئی رصدگاہ مراغہ اسکے وقت میں عروج پر آئی اور زنجان کے قریب سلطانیہ کی بنا ڈالی گئی جہاں عظیم الشان عمارتیں تیار ہوگئیں۔ اگرچہ اب یہ سب گردش فلکی سے محض کھنڈر ہیں اور کچھ نہیں۔ اس زمانے میں سلطنت اسلام کو اور مضبوطی ہوگئی آخر سنہ ۷۱۶ھ میں وجع مفاصل سے اسکا بھی پیمانۂ عمر لبریز کیا اور ابوسعید اس کا بیٹا وارث سلطنت ہوا

ابوسعید — ابوسعید کی سلطنت میں امیر چوبان کی امیر الامرائی یادگار ہے جس کی روز افزوں ترقی نے بہادر خاں خطاب دلایا اور بادشاہ کی بہن ستی بیگم سے شادی ہوگئی۔ اسی کے بیٹے دمشق خواجہ کا نواسہ سلطان اویس ابتدا دولت جلائر کا ہوا جس کا عہد حکومت علم و ادب کی ترقی کے لئے یادگار ہے۔ ابوسعید کی سلطنت کا زمانہ مختلف لڑائیوں اور بغاوت جنگیوں پر صرف ہوا اور سنہ ۷۳۶ھ میں اسکے انتقال کے بعد ایلخانیوں کی عظمت کا ایسا خاتمہ ہوا کہ ۳۵ برس تک کوئی مستقل بادشاہ نہ ہوسکا یہاں تک کہ تیمور لنگ نے حملہ کر کے سلطنت لے لی

۱؎ یہ لقب بعض کے نزدیک بچپن میں نظر بد سے بچنے کے لئے دیا گیا تھا اور بعض کہتے ہیں کہ غازان کے خوف سے واقعی بھاگ گیا تھا اور بار برداری کے گدھے کرایہ پر چلاتا تھا۔

رُخ پھر بدل دیا۔ یہ بھی عجب اتفاق ہے کہ تیمور کا سنہ ولادت اور ابوسعید کا سنہ وفات ایک ہی ہے ان لوگوں کا شجرۂ خاندان یہ ہے :۔
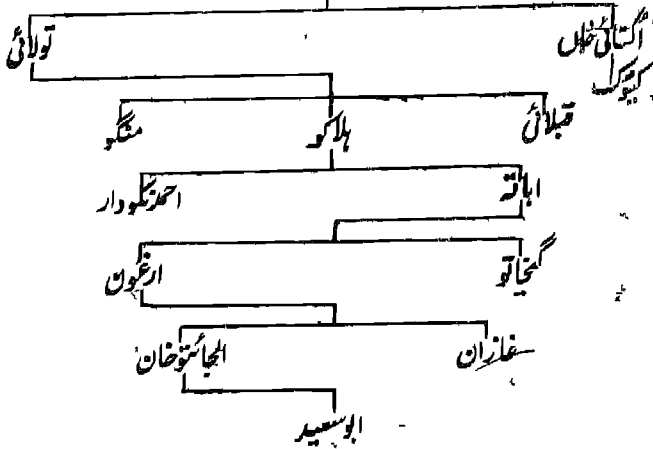
اب ہم اس عہد[1] کے تصانیف کا حال لکھتے ہیں۔ عربی میں تفسیر بیضاوی۔ فصوص الحکم ابن عربی طبقات الاطبا۔ کامل ابن اثیر۔ وفیات ابن خلکان۔ آثار البلاد وغیرہ بے نظیر کتابیں آج تک ثابت کر رہی ہیں کہ اسلامی علوم کا رُخ کس ترقی کیطرف جا رہا تھا اور فارسی میں تو ایسے بیش بہا تصانیف ہوئے کہ شاید و باید۔

عطا ملک جوینی

علاءالملک عطا ملک جوینی نے چنگیز خاں کے فتوحات کا حال قلمبند کیا اور تاریخ جہانکشا نام رکھ کے ۶۵۸ھ میں علمی دنیا کو پیشکش کیا۔ اس کتاب کے تین حصے ہیں۔ پہلا حصہ چنگیز خاں اور اُسکے اسلاف و اخلاف کے

[1] اسی زمانے میں ہندوستان میں فارسی زبان میں طبقات ناصری اور تاریخ فیروز شاہی وغیرہ تصنیف ہو رہی تھیں جنکا ذکر ایک علٰحدہ باب میں آئے گا۔

(چغتائی کے حال تک) تاریخ ہے۔ دوسرے حصہ میں خوارزم شاہیوں کا حال بالعموم ہے اور قطب الدین و جلال الدین کا بالخصوص۔ تیسرے میں حسن صباح اور اسمعیلیوں کا ذکر ہے۔ بیشتر واقعات چشمدید لکھے ہیں۔ زبان میں عربی الفاظ بے تکلف داخل ہونے لگے ہیں مگر جزوِ زبان نہیں معلوم ہوتے۔ سادگی ادا متقدمین سے ملتی جلتی ہے۔ مقامات حمیدی کی سے آورد نہیں۔

گلستان

اس سے دو سال قبل شیخ سعدی نے گلستان تصنیف کی تھی جسکے متعلق نہایت آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ آجتک نثر فارسی میں اس سے بہتر کتاب نہیں لکھی گئی۔ فصاحت و سلاست خداداد کی قوت سے جو معجز نگاری ظاہر کی گئی ہے وہ سراسر محیر العقول ہے۔ عربی الفاظ و محاورات بکثرت داخل کئے ہیں مگر زور تحریر نے انھیں بالکل جزوِ زبان بنا دیا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ فارسی خزانہ کے جواہر ہیں اور فطرت نے انھیں اسی سرزمین میں پیدا کیا ہے۔ صنائع لفظی و معنوی سے بھی مملو ہے مگر آمد اتنی ہے کہ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کسی صنعت کی غرض سے یہ عبارت لکھی گئی۔

"عاقلے را پرسیدند کہ نیکبخت کیست۔ و بدبخت چیست۔ گفت نیکبخت آنکہ خورد و کِشت و بدبخت آنکہ مُرد و ہشت۔"

ذرا ہموزن و ہم قافیہ الفاظ کی نشست دیکھو۔ پھر تضاد و تقابل وغیرہ کی لذت سے مقابلہ کرو اور علم اخلاق کے مسائل دقیق کی ایجازی شکل ایسی ہے کہ بچے بھی یاد کر لیں گے اور سمجھ جائیں گے اور بالغ العلم لوگ نوشیرواں ہی اوا کے دیوانے نظر آئیں گے حقیقت میں سہل ممتنع یہی ہے۔ علامہ تفتازانی نے مطول علم بلاغت میں نہایت ضخیم

لکھی ہے مگر انکا قول یہ تھا کہ سعدی اپنا ایک فقرہ[1] گلستاں کا مجھے دیدے اور ساری تصنیف میری خود لے لے۔ پروفیسر براؤن نے اسکے اخلاقی تعلیم کے معیار کو پست ظاہر کیا ہے اور "دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز" یا اور ایسی ہی دو ایک ہدایتوں سے استشہاد کیا ہے حالانکہ میدانِ عمل میں آ کے کامل الاخلاق کے مدعی اس سے بدتر نظر آتے ہیں مگر سعدی نے سچی بات کہدی اور انسان کی اخلاقی قوت کے حدود کو بتا دیا ورنہ اگر خود وہ اس ہدایت پر عمل کر لیتے تو شاید اعتراضات کے دروازے بند ہو جاتے۔

محقق طوسی

محقق طوسی نے اخلاق ناصری علم اخلاق میں اور معیار الاشعار فن عروض میں تصنیف کیں۔ محقق رحمہ کا نام نصیر الدین محمد بن حسن ہے اور طوس مقام پیدائش و نشو و نما۔ فلسفہ و ریاضی میں بے نظیر تھے اور فقہ و حدیث و تفسیر وغیرہ میں بھی کامل الفن۔ بلکہ ان کے لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اس جامعیت کے علما دنیائے اسلام میں کم نظر آتے ہیں۔ ابتدائی زمانہ قلاع اسمعیلیہ میں گذرا بلکہ شاید وہیں قید بھی رہے۔ ایلخانی فتوحات انکی رہائی کا باعث ہوئیں اور ہلاکو خاں اور اسکے وارثوں کے یہاں وزارت کے عہدے تک پہونچے آخر سنہ ۶۷۲ھ میں ۷۵ سال کی عمر پا کے رحلت کی اور کاظمین (بغداد) میں دفن ہوئے۔ بعض ناقدین کی رائے ہے کہ "از زمانِ او والی الآن نہایت مرتبۂ فضل فضلائے عہد بفہمیدن کتبِ او انحصار دارد"۔ یہاں بھی وہی چھوٹے چھوٹے فقرے ہیں مگر ترکیب تھا اور الفاظ عرب کی کثرت ہے لیکن قوت علمیہ نے طرز ادا میں

---

[1] فقرہ یہ ہے "[illegible]"۔ ایک شہزادے کی حالت [illegible] ایک عبرت ناک اور دردانگیز [illegible] خیال کو پہونچ سکے [illegible] طبیعت بیچین ہو جاتی ہے۔

ایک خاص مضبوطی پیدا کر دی ہے اور زبان کو متین بنا دیا ہے۔ کبھی کبھی عربی محاوروں کا لفظی ترجمہ کر دیتے ہیں مثلاً بجائے "بایدکہ فراموش نکنی" کے کہیں گے "بر تو باد" یا "چنانچہ گفتیم" کی جگہ لکھیں گے "چنانچہ یاد کردہ ایم"[1]۔ عربی میں مجسطی۔ تحریر اقلیدس (۱۷ مقالہ) شرح اشارات۔ اوصاف الاشراف وغیرہ انہیں کی یادگار ہیں۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتے ہیں اور حکیمانہ مذاق غالب ہے:۔

موجود بحق واحدِ اوّل باشد | باقی ہمہ موہوم و مخیّل باشد
ہر چیز جز او کہ آید اندر نظرت | نقشِ دومین چشم احول باشد

۶۹۹ھ میں عبداللہ وصاف بن فضل اللہ نے غازان خاں کے لئے **تاریخ وصاف** لکھی اور بقول مولانا آزاد "بڑا زور مارا۔ مگر فقط لفاظی اور لغت بازی ہے۔ عربی۔ فارسی۔ ترکی لفظوں کا حشر بپا ہے"۔ مصنف نے استعارات اور تشبیہات کو نثر میں لا کے کچھ ایسا پیچدار کر دیا ہے کہ مطلب گم ہو گیا۔ مترادف فقرات نے الفاظ میں زیادتی اور معانی میں کمی پیدا کر دی۔ بدنصیبی سے اس رنگ تحریر نے انشا پردازی کا مذاق بدل دیا اور چھ سو برس تک گویا سادہ عبارت لکھنا ایرانی لوگ بھول گئے۔ یہ تو اب ہمارے زمانے میں انقلابات ہو رہے ہیں اور سفرنامہ ناصر الدین شاہ وغیرہ کی عبارت پھر سادگی کی طرف آئی ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:۔

"وحسن را ہمین گناہ مواخذت فرمود۔ بطے بیان اور ابخشید۔ آیت طفلی در الاطاق ہنگام عربدہ گیخاتو خاں بحکم فرمان بے ادبی نمودہ بود

---

[1] عربی میں ذکر کے معنی ہیں "یاد کرنا"۔ دیکھو اردو میں اسی موقع پر کہتے ہیں کہ "میں نے ذکر کیا ہے"۔ اب یہ لفظ جزو زبان ہو گیا اگر ترجمہ کر دیا جائے تو وحشت ہوگی۔

دربارِ ارغو[1] حاضر گشت۔ جوابے درست درشت بے دہشت وَکَانَ[2] مِنْہُ الْعَفْوُ
بالجِدِّ دَہشَتْ عرض داشت کہ آں زو گیخاتو خان بر تخت خانیت متمکن
بود۔ اگر بر قتل اقدام نمودے امتثال واجب بودے۔ اجمام[3] نا ممکن۔ امروز نیز
بندۂ بادشاہم اگر سیورغامیشی فرماید و بر بندۂ خود نیم جانے منت نہد باہر کہ
اشارہ رود انقیادِ بجاں واجب دانم"۔

رشید الدین فضل اللہ

رشید الدین فضل اللہ کی جامع التواریخ بھی ایک یادگار کتاب
ہے۔ مصنف کی تاریخ ولادت سنہ ۶۴۶ھ ہے اور وطن ہمدان۔ ابتدائی زمانہ
اہل علم کی صحبت میں گذرا۔ غازان کے عہد حکومت میں وزارت پائی اور
وصاف کی تقریب دربار شاہی میں کی۔ الجائتو کے وقت میں بھی وزیر
رہا۔ آخر دراندازوں نے بادشاہ کو ناراض کر دیا اور ستر برس کی عمر
پا کے سنہ ۷۱۸ھ میں قتل کیا گیا۔ عمارات میں ربع رشیدیہ اور اپنا مقبرہ چھوڑا
تھا مگر گردش زمانہ نے اُنھیں بھی باقی نہ رکھا۔ جامع التواریخ اسکی بہترین یادگار
ہے۔ پہلی جلد میں مغلوں اور تاتاریوں کے حالات۔ اُنکے خاندانی شجرے قصص و
روایات و تقسیم قبائل وغیرہ کا ذکر ہے پھر چنگیز خاں اور اسکے اسلاف و اخلاف
کی (غازان خاں تک) تاریخ ہے۔ دوسری جلد میں حضرت ابوالبشر سے لیکے
حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ تک کے حالات ہیں اور سلاطین
ایران کا بھی عہد اسلام تک ذکر کیا گیا ہے۔ اسکے بعد حالات خلفائے بنی امیہ
و بنی عباس قلمبند کئے ہیں۔ پھر سلاجقہ و سلغریہ و اسمٰعیلیہ وغیرہ کے حالات
ہیں۔ آخر میں چینیوں۔ یہودیوں۔ نصرانیوں اور ہندوؤں کے اذکار ہیں بلکہ
سکیامنی (گوتم بدھ) کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ زبان سلیس اور شستہ ہے

---

[1] مواخذہ۔ [2] گویا کہ اُس سے عقلیں بحد دہشت کھا گئیں۔ [3] آرام کرا ۱۲

اور تاریخی تحقیق قابل قدر۔ اسکے علاوہ کتاب الاحیاء والآثار۔ کتاب توضیحات۔ مفتاح التفاسیر۔ رسالۂ سلطانیہ۔ لطائف الحقائق وغیرہ عربی میں لکھیں اور بمقتضائے احتیاط فارسی تصانیف کے عربی ترجمے اور عربی تصانیف کے فارسی ترجمے کرادیئے اور ہر کتاب کے متعدد نسخے مختلف لوگوں اور کتب خانوں کو نذر کردیئے تاکہ باقی رہیں۔ مگر زمانہ کی نظرِ انتخاب ان احتیاطوں کی پابند نہیں۔ یمحو اللہ ما یشاء و یثبت و عندہ ام الکتاب۔ رشید کے خطوط بھی سیاسی و ملکی حالات جمع کرنے کے لئے کافی مدد دیتے ہیں اور اسکے قلمی نسخے بڑے بڑے کتب خانوں میں موجود ہیں۔

تاریخ گزیدہ

حمد اللہ مستوفی کی تاریخ گزیدہ بھی نہایت سلیس فارسی میں ہے اور اسکے مضامین تقریباً جامع التواریخ ہی کے ایسے ہیں۔ البتہ اپنے وطن قزوین کا حال مصنف نے بڑھا دیا ہے اور ائمہ و مجتہدین۔ قاریانِ قرآن و مشائخ۔ ولات و سادات۔ حکما و اطبا۔ شعرا و مصنفین وغیرہ کا حال بھی لکھا ہے۔ اسی کتاب کے دیباچے میں اپنی مثنوی ظفر نامہ کا ذکر کیا ہے جسے پندرہ برس

ظفرنامہ

کی محنت کے بعد ۷۳۵ھ میں تمام کیا تھا اور محققین یورپ کی رائے ہے کہ تاریخی اعتبار سے یہ نظم نہایت صحیح اور مفید ہے۔ نمونہ کے طور پر چند شعر لکھے جاتے ہیں اور فیصلہ ناظرین پر چھوڑا جاتا ہے کیونکہ بعض لوگ اسے شاہنامہ کا جواب سمجھتے ہیں:۔

نماند اندراں شہر جائے گریز | ز بس کشتہ افگندہ بیحد و مر
ز بیم سپاہ مغل ہر کسے | گریزاں بر فتند ہر جا بسے
برفتند چندے بجامع دروں | پر اندوہ جان و بدل پر ز خوں
بجز بود نداز ان دشمن اندیشناک | فرازِ مقرنس نہاں گشتہ پاک

بسے مغل اندر آتش فگند — زبانہ برآمد بہ چرخ بلند
بآتش سقوف و مقرنس بسوخت — وزاں کفر جور و ستم بر فروخت

کہتے ہیں کہ ۰۰۰، ۵۰ شعر کی مثنوی ہے۔ ۲۵ ہزار شعر عرب کے حال میں بیس ہزار عجم کی تاریخ میں اور تیس ہزار تاتاریوں کے فتوحات وغیرہ کے ذکر میں ہیں۔ شاعری کے اعتبار سے بجز سادہ بیانی کے اور کس بات کی داد دی جاسکتی ہے۔

نزہت القلوب — **نزہت القلوب** پانچ سال بعد کی تصنیف ہے جسے فارسی زبان کا قدیم ترین جغرافیہ کہہ سکتے ہیں۔

تاریخ بناکتی — **تاریخ بناکتی** کو فخر الدین بناکتی نے نہایت شیریں اور سلیس فارسی میں لکھ کے ۷۱۷ھ میں شائع کیا۔ پروفیسر براؤن اسکی تاریخی معلومات کی بہت تعریف کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ "علاوہ تاریخ اسلام و تاتاریہ و عجم کے صحیح معلومات بہم پہونچانے کے مصنف نے جزائر برطانیہ و فرانس و روس و پرتگال وغیرہ کی بھی صحیح تاریخ بلکہ رومۃ الکبریٰ اور تاریخ مذہب مسیحی کے صحیح روایات نقل کئے ہیں اور یہ بات مسلمان مورخوں میں بہت شاذ و نادر ہے" اسی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل چین چھاپنے کا فن بخوبی جانتے تھے اور تختیوں پر ابھرے ہوئے حروف میں کتابوں کے صفحات تیار کرکے جمع کرلیتے تھے اور جس طرح مہر لگاتے ہیں اسی طرح جب کسی نسخے کی ضرورت ہوتی تھی تو چھاپ کے دیدیتے تھے۔

علامہ قطب الدین شیرازی محقق طوسی کے شاگرد رشید تھے انھوں نے

درۃ التاج — فارسی میں **درۃ التاج** تصنیف کی جس میں تمام اجزائے فلسفہ کی مکمل بحث موجود ہے۔ اسی طرح اور کاملین نے نایاب کتابیں لکھی ہیں جن کی تفصیل بخوف طول ترک کیجاتی ہے۔

اب ہم تاریخ نظم کی طرف توجہ کرتے ہیں اور بعض مشہور شعرا کے حالات لکھتے ہیں۔ رزمیہ مثنوی کا اس زمانے میں بڑا زور تھا مگر ظفر نامہ کے علاوہ شاہنامہ۔ چنگیز نامہ۔ غازان نامہ وغیرہ کی عدم شہرت خود بتا رہی ہے کہ یہ کتابیں کس پایہ کی ہونگی۔ اخلاق و تصوف میں بیشک بے نظیر مثنویاں تیار ہوئیں اور حالاتِ ملک مقتضی بھی اسی کے تھے کہ یہ صنف عروج پاسے اور صنف اول کو زوال ہو جیسا کہ ابتدائے باب میں لکھا گیا ہے۔ غزل کو بھی اسی زمانے میں اپنا خاص جامہ نصیب ہوا اور سوز و گداز نے اس قسم شعر پر اثر کیا۔ قطعات بھی بجھے ہوئے دلوں کی فریادیں ہیں اور رباعیاں بھی اسی لَے میں زمزمہ سنج ہیں۔

فریدالدین عطار

اس عہد میں **خواجہ فریدالدین ابو طالب** محمد بن ابی بکر ابراہیم بن مصطفےٰ ابن شعبان مضامین تصوف نظم کرنے میں نہایت ممتاز تھے اور عطار تخلص کرتے تھے۔ مولانا روم فرماتے ہیں:—

ہفت شہر عشق را عطار گشت ‏ ‏ ‏ ما ہماں اندر خم یک کوچہ ایم

طبیعت بچپن سے درد آشنا تھی اور اگرچہ پیشہ آبائی عطاری تھا بلکہ طبابت بھی ساتھ تھی مگر مذاقِ تصوف کوٹ کوٹ کے بھرا ہوا تھا۔ اپنا پیشہ بھی کرتے تھے اور تصوف میں تصانیف کرتے جاتے تھے۔ خود کہتے ہیں:—

مصیبت نامہ کاندوہ جہان است ‏ ‏ ‏ الٰہی نامہ کاسرار عیان است

بدار و خانہ ہر دو کردم آغاز ‏ ‏ ‏ چہ گویم زود رستم زین و آں باز

کہتے ہیں کہ خواجہ صاحب کی دکان پر ایک روز ایک فقیر نکل آیا اور ناراض ہو کے کہنے لگا کہ کیوں بے فائدہ وقت ضائع کرتے ہو۔ آپ نے جواب دیا کہ جاؤ اپنا راستہ لو۔ اُس نے کہا "تم اپنی فکر کرو میرا جانا کیا مشکل ہے" یہ کہتے وہیں لیٹ گیا۔ خواجہ نے جو اُٹھ کے دیکھا تو واصل بحق ہو چکا تھا۔ عبرت

طاری ہوئی اور دکان راہ خدا میں لٹا دی اور کاروبار چھوڑ کے فقیر ہو گئے۔ یہ قصہ ممکن ہے کہ آخر عمر میں پیش آیا ہو ورنہ بیشتر تصانیف آپ کے دوا خانے ہی میں ہوئے ہیں۔ ایک مثنوی میں اپنی سیاحی کا حال لکھتے ہیں:-

سر برآوردہ بہ مجذوبی عشق　　سیر کردہ مکہ و مصر و دمشق
کوفہ و رے تا خراسان گشتہ ام　　سیحون و جیحونش را بسپردہ ام
ملک ہندوستان و ترکستان زمین　　رفتہ چوں اہل خطا از سوی چین
در نشاپورم بہ کنج خلوتے　　با خدائے خویش کردم وحدتے

ان کی بیش بہا زندگی کا خاتمہ اپنے وطن نیشاپور میں ایک مغل کی تلوار سے ۶۲۷ھ میں ہوا اور تقریباً ۱۱۴ برس کی عمر پائی۔ تصانیف میں منطق الطیر اور پند نامہ کے علاوہ اسرار نامہ۔ الٰہی نامہ۔ مصیبت نامہ۔ وصیت نامہ۔ بلبل نامہ۔ حیدر نامہ۔ گل و ہرمز۔ سیاہ نامہ۔ مختار نامہ وغیرہ بھی ہیں۔ دقائق تصوف اس حد کے بیان نہیں کئے ہیں کہ سمجھ میں نہ آئیں اور زبان کی صفائی تو اس قدر ہے کہ گویا یہ صفت ان پر ختم ہو گئی اگرچہ پرانے تلفظ اور محاورات بھی شامل ہیں۔ قوت تخییل نے پرانے مضامین کو نیا جامہ پہنا کے بہت زوردار کر دیا ہے:-

می پنداری کہ جان توانی دیدن　　اسرار ہمہ جہان توانی دیدن
ہرگاہ کہ بینش تو گردد بکمال　　کوری تو خود آں زمان توانی دیدن

خواجہ صاحب کی معرفت کا اندازہ ان اشعار سے ہوگا:-

روزہ حفظ دل است از خطرات　　پس بود با مشاہدہ افطار
حج چہ باشد ز خود سفر کردن　　بکجا بہ جانب ہدایت کار
وحی چہ بود ہر آنچہ در دل تو　　سر زند از نتائج اسرار

منطق الطیر میں مقامات تصوف کو تمثیل کے طور پر بیان کیا ہے۔ طائروں (مخلوقات) کو سیمرغ (ذات الٰہی) کی تلاش ہوئی۔ ہدہد (مرشد) سے اُسکے آشیانے کی خبر سنی اور راستے کے مصائب کا اندازہ کیا۔ بلبل گل پر عاشق ہو کے رہ گئی۔ طوطی قفس میں پھنسا۔ ہما کو بادشاہ گری کا شوق ہوا۔ بطین پانی کو چھوڑ سکیں (دنیوی تعلقات نے بہت لوگوں کو روک لیا) کچھ طائر البتہ ہدہد کو راہبر بنا کے روانہ ہوئے اور اُنس۔ حکمت۔ انقطاع۔ اتحاد۔ حیرت۔ تجرید اور فنا کے منازل طے کر کے مقصد تک پہونچے۔ سلسلۂ سفر میں بہت سے روایات و حکایات بھی درج کئے جنسے اثر خاص پیدا ہو گیا ہے۔

مذاق طبیعت کا اندازہ ان اشعار متفرقہ سے ہو گا:۔

وصل تو نجست ہم پنہاں زخود　　ہر کہ گوید یافتم دیوانہ ایست

مظاہر قدرت کی معرفت:۔

چندیں در بستہ بے کلید ست چہ سود　　کس نام نشان نشنید ست چہ سود
پیراہن یوسف است یک یک ذرات　　یوسف ز میانہ ناپدید ست چہ سود

مذہب حقیقت مسائل کفر و اسلام سے بلند ہے:۔

لبِ دریا ہمہ کفر ست و دریا چاد پنداری　　ولیکن گوہرِ دریا ورائے کفر و دیں باشد

وحدت الوجود:۔

کاین دیدہ بنگری ظاہر　　صورت خویش را بصورت یار
ہر کہ اینجا ندید محروم است　　در قیامت ز لذت دیدار
انا لیلیٰ بگو اگر مردی　　ورنہ چوں ابلہاں مکن تکرار

دوئی را نیست رہ در حضرت تو　　ہمہ عالم توئی و قدرت تو
نگو گوئے نگو گفتست در ذات　　کہ التوحید اسقاط الاضافات

اسم فاعل

اسمعیل

خلاق المعانی کمال الدین محمد اسمعیل پسر جمال الدین عبد الرزاق اصفہانی تخلص کمال۔ باپ بیٹے دونوں شاعر تھے۔ علمی اعتبار سے فضیلت کا درجہ حاصل تھا اور خاندانی حیثیت میں بھی با اثر تھے۔ اصفہان کے قاضیوں کے خاندان صاعدیہ کی مدح کرتے تھے۔ کسی نے پوچھا کہ سلاطین کو چھوڑ کے قاضیوں کی مدح سرائی کیوں کرتے ہو۔ کہا یہ لوگ سخن فہم ہیں حالانکہ سلطان سنجر وغیرہ کی تعریف بھی کبھی کبھی کی ہے ۶۳۵ھ میں اُکتائی قاآن نے اصفہان میں قتل عام کا حکم دیا۔ شہر لوٹا گیا مگر اس گوشہ نشین شاعر سے کوئی نہ بولا بلکہ لوگ امانتیں لا کے اُنکے کنوئیں میں محفوظ کر دیتے تھے۔ اتفاقاً ایک ترک بچہ اِدھر نکل آیا اور ایک پرند کو غلیل سے مارنا چاہا۔ زہ گیر کنوئیں میں گر گئی۔ وہ اُترا تو پورا خزانہ پایا۔ سب لوٹ لیا اور کمال سے پوچھا اور مال کہاں ہے۔ وہاں کیا تھا جو دیتے۔ آخر ظالم نے شاعر کی جان لی اور شکنجہ میں کس کے مار ڈالا۔ ریاض الشعرا میں ایک رباعی اس اخیر وقت کی لکھی ہے:۔

ایں کُشتہ نگر کمال اسمعیل است — قرباں شد لیک نہ از رہِ تبجیل است
قربانِ تو شد کمال اندر رہِ عشق — قرباں شدن از کمالِ اسمعیل است

شاعری میں اسلاف کی استواری اور اخلاف کی نزاکت اور مضمون آفرینی دونوں کو جمع کیا ہے یہی وجہ ہے کہ متوسطین اور متاخرین سب ان کے معترف ہیں۔ حافظ کہتے ہیں:۔

کرہا ورت نمی‌شود از بندہ ایں حدیث — از گفتۂ کمال دلیلے بیاورم

حزیں کا فیصلہ باپ بیٹے کی شاعری میں یہ ہے:۔

در شعر جمال ارچہ جمالے بہ کمال است — امّا نہ بزیبائیِ افکارِ کمال است
در بوتہ گرِ رشحۂ او بیند حریفاں — الحق رگِ ابرِ قلمش بحرِ نوال است

سب سے زیادہ باعثِ فخر یہ ہے کہ معاصر جلیل القدر محقق طوسی نے معیار الاشعار میں کمال کی عظمت کا اعتراف کیا ہے :- مضمون آفرینی کے علاوہ مشکل طرحوں میں زورِ طبع دکھانا کمال کے لئے مخصوص ہے :-

ہرگز کسے ندید بدینساں نشانِ برف — گوئی کہ لقمہ ایست زمیں در دہانِ برف
مانند پنبہ دانہ کہ در پنبہ تعبیہ است — اجرام کوہ گشتہ نہاں درمیانِ برف

سلاست زبان اور شیرینی ادا میں متقدمین سے آگے قدم بڑھایا ہے :-

سپیدہ دم کہ نسیم بہار می آید — نگاہ کردم و دیدم کہ یار می آید
شراب در سر و چہرہ ز شرم رنگ آمیز — چنیں میانۂ شرم و حقار می آید
ز بسکہ داشت دل خستہ بستہ در فتراک — چناں نمود مرا کز شکار می آید

ہجو کو فحش اور لغویات سے پاک کیا ہے۔ ایک بخیل کی ہجو میں کہتے ہیں :-

بدہن نانِ خواجہ چوں بُردم — خواجہ گفتا کہ آہ من مُردم
گفتمش خواہ میر و خواہ ممیر — کہ من ایں لقمہ را فرو بُردم

خان آرزو کا خیال ہے کہ غزل کا پہلا خاکہ کمال نے بنایا ہے۔ معاملاتِ عشق میں خاص لذت بھر دی ہے۔ دیکھو کیا مزے کی طبیعت پائی ہے :-

از چشمِ نیمخوابِ تو امروز روشن است
آں نالہا کہ در غمِ تو دوش کردہ ایم

بود ہمیشہ - جانِ من ا- رسمِ تو بے گنہ کشتی
ہیچ نمی کشی مرا- من چہ گناہ کردہ ام

چو اندازد ہمیں تیرے کنم در سینہ پنہانش
بداں تا از پئے ہر تیر تیرِ دیگر اندازد

رُباعی میں جسقدر ترقی کی ہے قُدما کے یہاں نہیں:—

گل خواست کہ چوں رُخش نکو باشد و نیست ۔۔۔ چوں دلبر من برنگ و بو باشد و نیست
صد روے فراہم آورد در سالے ۔۔۔ باشد کہ یکے چو روے او باشد و نیست

مولانا روم × جلال[۱] الدین محمد بن بہاء الدین محمد بن الحسین البکری عرف مولانا روم
سال ولادت ۶۰۴ھ ہے اور مولد بلخ۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل
کی جن کا آستانہ سلطان محمد خوارزم شاہ کے زمانے میں طالبان حقیقت کا مرجع
تھا۔ کہتے ہیں کہ اس مرجعیت پر سلطان کو حسد ہوا اور امام رازی کے اُبھارنے
سے مولانا سے ناراضی کا اظہار کیا۔ وہ بھی کبیدہ خاطر ہو گئے اور بلخ سے نیشاپور
چلے گئے (۶۱۰ھ) یہاں شیخ فریدالدین عطار سے ملاقات ہوئی۔ مولانا روم اسوقت
کمسن تھے۔ صاحب زادے کو ہونہار دیکھ کے انھوں نے اپنا اسرار نامہ عطا کیا
اور باپ سے کہا "زود باشد کہ ایں پسر آتش در سوختگان عالم زند"۔ پھر مولانا
بہاء الدین بغداد چلے گئے اور وہاں سے زیارت حرمین شریفین اور سفر
بیت المقدس کرکے زنجان آئے اور پھر آق شہر اور لارندہ پہونچے۔ یہاں مولانا
روم کی شادی کی۔ لارندہ سے علاء[۲] الدین کیقباد نے قونیہ بلا یا اور یہیں انکی
وفات ہوئی (بعض کا خیال ہے کہ مولانا بہاء الدین کا انتقال شام میں ہوا اور

---

[۱] انکے تفصیلی حالات اور کلام کی کامل تنقید کے لئے مولانا شبلی کی سوانح مولوی روم سے بہتر کتاب ملنا مشکل ہے۔ [۲] سلجوقیوں کی تیسری شاخ کا بادشاہ قتلمش (دیکھو صفحہ ۱۱۰) کی اولاد میں تھا۔ ۲۲۰ سال تک ان لوگوں کی سلطنت ایشیائے کوچک پر رہی جنہیں اُن دنوں سلاجقہ روم کہتے تھے اور مولوی روم کا لقب اسی ملک میں توطن کی وجہ سے ہوا۔ اس علاء الدین کے بعد اس کا بیٹا غیاث الدین کیخسرو بادشاہ ہوا اور ۶۵۶ھ میں مر گیا۔ اسکے تین بیٹے تھے۔ علاء الدین کیقباد۔ عزالدین کیکاؤس۔ رکن الدین قلیج ارسلان۔ پہلے دو بھائی یکے بعد دیگرے قونیہ کے حاکم رہے لیکن ۶۵۹ھ میں تاتاریوں کے ہاتھ سے سارا خاندان ختم ہو گیا۔ معین الدین پروانہ مولانا روم کا شاگرد اور پسر خواندہ رکن الدین قلیج ارسلان کا حاجب تھا۔

مولانا روم تنہا قونیہ گئے)۔ باپ کے انتقال کے بعد مولانا روم نے بلاد مختلفہ میں تحصیل شروع کی یہانتک کہ انواع علوم میں کمال ہوگیا۔ جب قونیہ واپس آئے تو طالبان علوم ظاہری و باطنی کے مرجع ہو گئے۔ حضرت شمس تبریز جو فرقۂ اسمعیلیہ کے امام کیا بزرگ کی اولاد میں تھے یہاں آکے مولانا سے ملے اور انھیں اپنا مرید بنایا۔ شہر میں غوغا ہوا کہ ایک دیوانے نے مولانا روم پر سحر کرکے تسخیر کرلیا اور ایسی شورش بڑھی کہ شمس اپنے وطن تبریز چلے گئے۔ مولانا کو انکے فراق کا اتنا صدمہ ہوا کہ سب سے ملنا جلنا ترک کردیا اور اپنے پیر کے ہجر میں نہایت دردناک شعر کہے[1]۔ آخر کو مولانا نے شمس کو بڑی مشکل سے پھر بلایا مگر مولانا کے صاحبزادہ علاء الدین چلپی کو اُن سے کچھ شکایت ہوگئی چنانچہ ایکی شمس تبریز ایسے ناراض ہوکے گئے کہ پھر واپس نہ آئے (بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہیں قونیہ میں مولانا کے مریدوں نے یا علاء الدین چلپی نے ۶۴۵ھ میں قتل کرڈالا)۔ بہر تقدیر شمس تبریز کے فراق نے انکا سوز و گداز اور بڑھا دیا اور اسی عالم وارفتگی میں زبان پر اشعار جاری ہونے لگے جنکا مجموعہ مثنوی مولانا روم ہے۔ تاتاریوں کا حملہ اسی زمانے میں روم پر ہوا مگر مولانا کی عظمت سے متاثر ہوکے وہ لوگ ہٹ گئے اور قونیہ کو تباہ نہ کیا۔ شمس تبریز کے بعد شیخ صلاح الدین زرکوب کے ساتھ گوشۂ تجرید میں بیٹھنا شروع کیا اور انکی شان میں غزلیں کہیں :-

مطربا اسرار ما را باز گو   قصہائے جانفزا را باز گو

ما دہاں بربستہ ایم از ذکر او   تو حدیث دلکشا را باز گو

چوں صلاح الدین صلاح جان ماست   آں صلاح جانہا را باز گو
(باعلان نون)

شیخ صلاح الدین کی بیٹی سے مولانا کے بیٹے سلطان ولد کا عقد ہوا اور رشتۂ ظاہری

---

[1] مولانا روم کے صاحبزادے سلطان ولد نے یہ واقعہ اور اسکے بعد کے واقعات اپنی مثنوی میں نظم کئے ہیں۔

بھی قائم ہوگیا۔ صلاح الدین کے انتقال (۶۶۴ھ) کے بعد اپنے مرید حسام الدین چلپی کو ہمراز بنایا۔ انکو اپنی مثنوی میں بھی اکثر یاد کیا ہے:۔

ای ضیاء الحق حسام الدین بیار · این سیُم دفتر کہ سنت شد سہ بار

مدتے ایں مثنوی تاخیر شد · سالہا بایست تا خوں شیر شد

آخر ۶۷۲ھ میں انتقال ہوگیا اور حسام الدین انکے خلیفہ ہوئے۔ انکے بعد مولانا کے بیٹے سلطان ولد سجادہ نشین ہوے اور انکے مریدوں کا فرقہ جلالیہ کہلایا۔ بعد کو یہ لوگ مولویہ کہلانے لگے۔ رقص و سماع اس فرقے کے لئے مخصوص ہیں۔ کلام کی تنقید سوء ادب ہے خصوصاً مثنوی جو اسوقت مقبول خلائق چلی آئی ہے۔ کسی نے کہا ہے:۔

مثنوی مولوی معنوی · ہست قرآں در زبان پہلوی

من نمیگویم کہ آں عالیجناب · ہست پیغمبر۔ ولے دارد کتاب

صاحب آتشکدہ کے نزدیک اس مثنوی میں "عین الیقین کو بواسطہ علم الیقین مرتبۂ عیانی تک پہونچا دیا" اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اسرار معارف و رموز حقائق کو جس جذب کامل و جوش سرمستی کے عالم میں مولانا نے نظم کیا ہے اُس کا جواب تاریخ عالم میں نہیں ملتا۔ صاحب مجمع الفصحا کی راے بھی یہی ہے کہ "دنیائے شعر میں شاہنامہ اور مثنوی ایسی بے نظیر کتابیں ہیں جنکا جواب ناممکن ہے" (دیکھو صفحہ ۹۴) اکثر مقبول کتابوں کے متعلق دیکھا ہے کہ عام فہم اور سلیس ہونے کی وجہ سے مشہور ہوئیں پھر خواص کو التفات ہوا اور اگر قابل قبول ہوئی تو مقبول خاص و عام ہوگئی ورنہ فلا۔ مثنوی معنوی میں اسقدر دقیق باتیں ہیں کہ خاص لوگ بھی مشکل سے سمجھتے ہیں مگر پھر بھی شہرت اور مقبولیت ایسی ہے کہ حد نہیں۔ خدا جانے اس میں کیا راز ہے؟ اس کتاب کی تصنیف حسام الدین چلپی کی فرمائشوں کی وجہ سے دس برس

میں ہوئی ہے چنانچہ ہر دفتر کے آغاز میں اس امر کی طرف اشارہ ہے۔ چھٹا دفتر ناتمام تھا کہ مولانا بیمار پڑ گئے خیال ہوا کہ کوئی اور سوختہ دل اسے تمام کرے گا مگر اتفاق سے خود اچھے ہو گئے اور تمام کیا بلکہ ساتواں دفتر بھی نظم کیا چنانچہ کہتے ہیں:۔

ای ضیاء الحق حسام الدین فرید　　دولتت پائندہ قدرت بر مزید
چونکہ از چرخ ششم کردی گزر　　بر فراز چرخ ہفتم کن سفر
سعد اعدا دست ہفت اختر نگر　　زانکہ تکمیل عدد ہفت است بس

اس میں شک نہیں کہ مولانا کے سامنے منطق الطیر اور حدیقہ سنائی دونوں کتابیں موجود تھیں اور ان سے فیض پایا ہے خود فرماتے ہیں:۔

ترک جوشی کردہ ام من نیم خام　　از حکیم غزنوی بشنو تمام
در الٰہی نامہ گوید شرح این　　آن حکیم غیب و فخر العارفین

سنائی۱۲ عطار۱۲

بلکہ بعض اشعار بھی ان کتابوں سے لیکر اور بحر بدل کے اپنی مثنوی میں داخل کئے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ جو سکندر نامہ کو شاہنامہ سے نسبت ہے وہی ان کتابوں کو مثنوی سے مناسبت ہے۔ اہل تصوف عارف کو نئے سے تعبیر کرتے ہیں۔ حدیقہ کے اشعار دیکھو:۔

نالۂ نے ز درد خالی نیست　　شوق از روے زرد خالی نیست
بے زباں گوش را خبر کردہ　　بے بیاں ہوش را خبر کردہ
از دمش شعلہا ہمی خیزد　　چہ عجب گر نے آتش انگیزد

مولانا کہتے ہیں:۔

بشنو از نے چوں حکایت میکند　　وز جدائیہا شکایت میکند
کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند　　از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند
سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق　　تا بگویم شرح درد اشتیاق

ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش — باز جوید روزگار وصل خویش
من بہر جمعیتے نالاں شدم — جفت خوشحالاں و بدحالاں شدم
ہر کسے از ظن خود شد یار من — وز درون من نجست اسرار من
سر من از نالۂ من دور نیست — لیک چشم و گوش را آں نور نیست
تن ز جان و جان ز تن مستور نیست — لیک کس را دید جان دستور نیست

مولانا کی شاعری پر اگر بالاستیعاب نظر ڈالی جائے تو فک اضافات۔ تعقیدات لفظی۔ الفاظ غیر مانوس و ثقیل وغیرہ اس امر کے شاہد ہیں کہ فن کی نزاکتوں سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔ انکا کلام سحر نہیں ہے کہ اسباب و آلات کا محتاج ہو۔ یہ ایک کرامت ہے جو ان کی ذات سے مخصوص ہو گئی ہے:-

ملت عشق از ہمہ مذہب جداست — عاشقاں را مذہب و ملت خداست
گر باستدلال کار دیں بُدے — فخر رازی راز دار دیں بُدے

اکثر غلط حکایات و روایات (جو اُنکے زمانے میں مشہور تھے) نظم کر دئے ہیں جسکا اعتراف خود کو بھی ہے:-

ای برادر قصہ چوں پیمانہ ایست — معنی اندر وے بسان دانہ ایست
گفت نحوی زید عمرواً قد ضرب — گفت چونش کرد بیجرمے ادب
عمرو را جرمش چہ بُد کاں زید خام — بیگناہ او را بزد ہمچو غلام
گفت ایں پیمانۂ معنی بود — گندمش بستاں کہ پیمانہ است رد

یعنے جس طرح زید و عمر کے نام مثالاً بغرض اثبات اعراب لئے جاتے ہیں حالانکہ زید ضارب ہے نہ عمر و مضروب اسی طرح یہ قصص و روایات ہیں کہ اثبات نتائج حقیقت کے لئے اختیار کئے گئے ہیں نہ کہ تاریخ بیان کرنے کے لئے۔ ایک اور خصوصیت مثنوی میں یہ ہے کہ انکا استدلال اکثر قیاس و استقرا سے قطع نظر کرکے تمثیل کی صورت میں

ہوتا ہے کیونکہ اپنے ہم جنس کا حال سن کے سمجھنا بھی آسان ہوتا ہے اور اتباع کی طرف بھی رغبت پیدا ہوتی ہے۔ تمثیل ڈھونڈھنا بیشک مشکل ہے کیونکہ اس کے لئے تخئیل کی کمال قوت درکار ہے۔ مولانا کی قوت متخیلہ ان مشکلوں پر ہمیشہ غالب آجاتی ہے اور بے مثل تمثیلیں تلاش کر لیتے ہیں۔ مباحث کلامیہ اور اصول اخلاقیہ کو بھی اپنے مذاق میں ڈھال لیا ہے اور بڑے بڑے دشوار راستوں سے نکل کے تصوف اور علوم باطن کا تفوق بدیہی طور سے ثابت کر دیتے ہیں۔

دیوان کے متعلق اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ یہ مجموعہ جو شمس تبریز کے نام سے منسوب ہے سب مولانا روم کا ہے جس کی غزلیں کہیں بطور خطاب اور کہیں تبرکاً اپنے مرشد کے نام سے مزین کی ہیں۔ اس وقت تک جن شعرائے مضامین عشقیہ نظم کئے تھے۔ اُن کے دل چوٹ کھائے ہوئے نہ تھے۔ تصوف نے عشق حقیقی کا راستہ پیدا کر کے اہل باطن میں ایک خاص ذوق پیدا کر دیا تھا جس کی وجہ سے مولانا کی غزلیں محفل سماع کی زینت ہونے لگی تھیں اور چونکہ عشق مجازی سے لگاؤ نہ تھا اس لئے معاملہ بندی وغیرہ میں قاصر نظر آتی تھیں۔ اکثر غزلیں مسلسل ہیں اور زبان وعنوان ادا کے اعتبار سے اتنی شیریں اور خوشگوار نہیں کہ سعدی اور حافظ کے مقابلے میں پیش کی جائیں۔ حکمت کی کھلی راہیں ہیں جو اہل معرفت کے لئے مخصوص ہیں۔ چند موثر اشعار نقل کئے جاتے ہیں:۔

یار کہ آمد زدر خلوتیاں! دوست دوست!

دیدہ غلط می کند۔ نیست غلط۔ اوست اوست

واردات قلبی کا اظہار ہے اور اُتنی ہی جتنی گذری ہے۔ ایک مرتبہ خیال آگیا کہ اگر معشوق کسی پر عاشق ہو جائے تو لطف ہے۔ ایک غزل

اسی خیال میں کہہ ڈالی :-

ای خداوند یکے یار جفا کارش دہ — دلبر عشوہ گر و سرکش و خونخوارش دہ

چند روزے زپئے تجربہ بیمارش کن — با طبیبانِ دغا پیشہ سروکارش دہ

تا بداند کہ شب ما بچساں میگذرد — دردِ عشقش دہ و عشقش دہ و بسیارش دہ

مقام فنا میں سالک پر خضوع و خشوع کی حالت طاری ہوتی ہے اور مقام بقا میں جلال و عظمت کا احساس ہوتا ہے۔ اس عالم میں مولانا کے اشعار عجیب رنگ میں ہو گئے ہیں :-

بزیرِ کنگرۂ کبریاش مردانند — فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر
اسم فاعل — اسم فاعل — اسم فاعل

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم — چو غلام آفتابم ہمہ آفتاب گویم

بنمودے نشانے زجہاں دوست لیکن — دو جہاں بہم بر آید سر شور و شر ندارم

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما — گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزو ست

ای بلبلِ سحر کہ مارا بپرس گہ گہ — آخر تو ہم غریبی ہم از دیار مائی

رباعی کا انداز دیکھو :-

در مذہب عاشقاں قرارے دگر ست — ویں بادۂ ناب را خمارے دگر ست

ہر علم کہ در مدرسہ حاصل کردیم — کارے دگر ست و عشق کارے دگر ست

آخری خصوصیت انکے کلام کی یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ مولانا پہلے شاعر ہیں جنکی زبان امرا کی ستائش یا بیہودہ ہجو سے آلودہ نہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ دوراز کار باتیں انکے کلام میں بالکل نہ ملیں گی۔ نثر میں ایک کتاب فیہ ما فیہ

معین الدین پروانہ کو مخاطب کرکے لکھی تھی جو نایاب ہے اسی طرح ایک مجموعہ خطوط بھی تھا جو نہیں ملتا۔

سعدی

شیخ شرف[۵۱] الدین بن مصلح الدین عبداللہ۔ انکے والد اتابک سعد بن زنگی[۵۲] والی شیراز کے ملازم تھے اسوجہ سے سعدی تخلص اختیار کیا۔ سال ولادت غالباً ۵۸۹ھ ہے اور مولد شیراز شیخ کے حالات تفصیلی طور سے کسی تاریخ میں درج نہیں۔ البتہ خود اُنکے تصانیف میں جابجا آگئے ہیں جنسے اچھا ذخیرہ تیار ہو سکتا ہے۔ دارالعلم شیراز میں درس و تدریس کا بہت موقع تھا۔ خصوصاً مظفرالدین تکلہ بن زنگی المتوفی ۵۹۱ھ کا مدرسہ مجمع علما و فضلا تھا مگر ان کی تعلیم نظامیۂ بغداد میں ہوئی اور ابن جوزی سے بھی شہر بغداد ہی میں حدیث پڑھی حسب تصریح دولتشاہ تیس برس طالب علمی کی تیس برس سیاحت اور تیس برس عبادت۔ انھیں سیاحتوں کے دوران میں پانچ بار حج کیا اور شہاب الدین سہروردی کے مرید ہوئے پھر ہند و شام و بلقان

---

[۵۱] عوام میں مصلح الدین مشہور ہیں اور انڈیا آفس کے ایک نسخۂ قدیم میں جو سعدی کے ۲۶۶ برس بعد کا لکھا ہوا ہے مشرف الدین درج ہے [۵۲] یہ خاندان بھی سلجوقیوں کا قائم کیا ہوا تھا سعد زنگی اس سلسلے کا پانچواں حکمراں تھا ۶۲۳ھ میں اسکا انتقال ہوا اور اسکا بیٹا ابوبکر سعد تخت نشین ہوا۔ اسکے زمانے میں صوبۂ فارس نہایت امن و امان کی حالت میں ہوگیا جب اس کا بھی انتقال ہوا تو محمد بن ابی بکر اسکا بیٹا دارالسلطنت میں موجود نہ تھا باپ کی موت کی خبر سنکر شیراز کو چلا مگر راہ میں انتقال ہوگیا اور اُس کا صغیر السن بیٹا بادشاہ ہوا مگر وہ بھی مدت میں سات مہینے کے بعد مر گیا آخر محمد بن سلغر بن سعد حکمران ہوا۔ اس کی سفاکی سے لوگ عاجز آگئے اور آٹھ مہینے بعد ہلاکو خاں کے پاس گرفتار کرکے بھیجدیا۔ پھر اس کا بھائی حکمراں ہوا اور وہ بھی ۶۶۳ھ میں مر گیا۔ اب خاندان میں کوئی مرد باقی نہ رہا لہذا آتش خاتون دختر سعد کی حکومت ہوئی۔ اسنے ہلاکو کے بیٹے منگو تیمور سے شادی کر لی اور ۶۸۴ھ میں مر گئی۔ اسکے بعد شیراز اور فارس براہ راست تاتاریوں کی زیر حکومت آگیا اور انکیانو والی مقرر ہوا۔

ہوتے ہوئے بلاد روم میں پہونچے جہاں مولانا روم سے ملاقات ہوئی (امیر خسرو سے سند میں ملاقات ثابت نہیں۔ ہاں اتنا معلوم ہوتا ہے کہ امیر صاحب کا کلام سن کے پسند کیا تھا) فترت تاتاریہ کے زمانے میں خواجہ شمس الدین جوینی اور علاء الدین جوینی ان کے بڑے قدر دان تھے اور اباقہ (اباقاآن خاں) تک رسائی بھی انھیں کی وجہ سے ہوئی بلکہ آزادمنشی نے ان کی شان اُس دربار میں بہت بڑھا دی تھی۔ بادشاہ نے اشعار سننا چاہے تو آپ نے کہا :۔

شہے کہ حفظ رعیت نگاہ می دارد　　حلال باد خراجش کہ مزد چوپانی است
وگرنہ راعی خلق است زہر مارش باد　　کہ ہرچہ میخورد از جزیت مسلمانی است

بادشاہ نے بار بار پوچھا کہ میں راعی ہوں یا نہیں ہر مرتبہ یہی جواب دیا کہ آپ ایس تو پہلا شعر حسب حال ہے اور نہ دوسرا (شعر العجم جلد دوم)۔ آخر عمر میں شیخ نے زاویہ نشینی اختیار کر لی اور ارغون خاں کے زمانے میں ۱۰۲ برس کی عمر پاکے ۶۹۱ھ میں انتقال کیا۔ ایک مقام دلکشا نام تھا وہاں مزار بنا جو سعدیہ کہلاتا ہے اور زیارت گاہ عجم ہے۔

شیخ کے تصانیف میں گلستاں کا ذکر ہو چکا ہے جو صاحب مجمع الفصحا کے نزدیک فارسی لٹریچر کی چار نایاب کتابوں میں ہے (باقی تین کتابیں شاہنامہ مثنوی مولانا روم اور دیوان حافظ ہیں) بلکہ نثر میں یہی تنہا کتاب بے نظیر ہے۔ اسکی شیرینی ادا اور لطف بیان نے اُدبائے یورپ کو بھی تسخیر کر لیا ہے چنانچہ پروفیسر ویمبری سر گور اوسلی۔ سر ایڈون آرنلڈ وغیرہ اسکی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ بوستاں ایک مثنوی ہے جس کی سادگی توصیف سے بالاتر ہے بلکہ سہل ممتنع کی نظم میں اگر مثال ہے تو یہی۔ بچے سے لیکے بوڑھے تک ان دونوں کتابوں کو بلاد اسلامیہ وغیر اسلامیہ میں پڑھتے ہیں اور مزے لیتے ہیں فلسفہ اخلاق کے مفید مسائل ایسے

سہل اور شیریں کر دئے ہیں کہ دل میں جگہ کر لیتے ہیں اور زبانوں پر ضرب المثل ہو گئے ہیں قصے بھی تمثیل کے طور پر بیان ہوئے ہیں اور نہایت پُر لطف ہیں۔ حضرت ابراہیم نے ایک کافر کو دستر خوان پر سے اٹھا دیا وحی ہوئی کہ

منش داوہ صد سال روزی و جاں ترا نفرت آید از و یک زماں

کس قدر عمدہ صلح کل کی تعلیم ہے۔ قناعت اور اُسکے ساتھ خود داری کی تعلیم دیکھو۔ عنوان ادا ایسا ہے کہ قلب کو تسکین ہوتی ہے:۔

قناعت کن ای نفس بر اندکے کہ سلطان و درویش بینی یکے

گرا آزادہ بر زمیں خسپ و بس مکن بہر قالی زمیں بوس کس

تربیت کے متعلق آجکل یہ خیال ہے کہ بید وغیرہ نہ مارنا چاہئے بلکہ اگر ممکن ہو تو ڈانٹنا بھی نہیں چاہئے۔ شیخ نے معلم کی زبانی تو یہ کہا کہ "جورِ اُستاد بہ ز مہرِ پدر" مگر خود یہ تعلیم دیتے ہیں:۔

تو آموز را ذکر و تحسین و زہ ز توبیخ و تہدید اُستاد بہ

صنعت و حرفت کی تعلیم کو بھی جزو تکمیل سمجھتے ہیں:۔

بیاموز پرور دہ را دست رنج و گر دست داری چو قارون بگنج

بپایاں رسد کیسۂ سیم و زر نگر دو تہی کیسۂ پیشہ ور

بے تعصبی کی مثالیں بھی شیخ کے کلام میں بکثرت ہیں اور ایسی صوفی منش بزرگ سے یہی امید بھی کی جاتی ہے۔ بدگوئی کی ممانعت بالکل نادر طرز میں کی ہے:۔

بد اندر حق مردم نیک و بد مگو ای جوانمرد صاحب خرد

کہ بد مرد را خصم خود میکنی و گر نیک مرد است بد میکنی

زاہدان ترشخو اور عارفان ریاکار سے بے حد ناراض ہیں۔ اخلاقی زندگی میں ہمیشہ عمل کو ترجیح دیتے ہیں اور وہ دور از کار باتیں نہیں بیان کرتے جو مایوس کن ہیں

یا فطرت انسانی کے مقتضیات کے بالکل خلاف جاتی ہیں۔ یہ کامل تعلیم اس وجہ سے ہے کہ شیخ نے حدیث و[1] تفسیر وغیرہ کو بھی سمجھ لیا تھا اور اُسکے فیض سے جو اثر پایا ہے اُسی سے اپنے کلام کو موثر بنایا ہے۔ بیشتر احادیث حضرت رسولؐ اور کلمات علی بن ابی طالب علیہ السلام و ائمہ کبار کے لفظی ترجمے کر دئے ہیں جن کی نورانیت سے شیخ کے کلام کو ابدی جلوہ دیدیا ہے بلکہ جس مقام پر ان تعلیمات قدسیہ سے ہٹ گئے ہیں اور اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں وہاں مورد اعتراض بھی ہو جاتے ہیں۔ مثلاً

زنِ نو کن ای دوست در ہر بہار　　که تقویم پارینہ ناید بکار

شیخ کی نظر معمولی واقعات پر عارفانہ پڑتی ہے اور دنیا کی ہر چیز سے ایک عبرت کا سبق حاصل کرتے ہیں:۔ اپنے بچپن کا حال لکھا ہے:۔

بدر کرد ناگہ یکے مشتری　　بشیرینی از دستم انگشتری

چو نشناسد انگشتری طفل خُرد　　بشیرینی از وے تواند بُرد

تو ہم قیمت عمر نشناختی　　که در عیش شیرین برانداختی

ایک مقام پر کہتے ہیں:۔

زدم تیشہ یک روز بر تلِ خاک　　بگوش آمدم نالۂ دردناک

کہ زنہار اگر مردی آہستہ تر　　کہ چشم و بناگوش و روی است و سر

قصائد و قطعات کی بھی یہی حالت ہے کہ مواعظ و نصائح کا سرچشمہ بنے ہوئے ہیں اور لطف ادا اور فصاحت خداداد کا سچا نمونہ کہیں کہیں مناظر قدرت کی تصویریں کھینچی ہیں اور وہ بھی سچی:۔

---

[1] تعجب ہے کہ باوجود اس فضل و کمال کے اکثر حدیثیں ضعیف اور موضوع بھی نقل کر دی ہیں اور تاریخی غلطیاں بھی گلستاں و بوستاں میں نظر آتی ہیں۔

بامداداں کہ تفاوت نکند لیل و نہار　　خوش بود دامن صحرا و تماشای بہار
آدمی زادہ اگر در طرب آید چہ عجب　　سرو در باغ برقص آمدہ و بید و چنار
ژالہ بر لالہ فرود آمدہ ہنگام سحر　　راست چوں عارض گلبوی عرق کردۂ یار
گو نظر باز کن و خلقت نارنج ببیں　　ای کہ باور نہ کنی فی الشجر الاخضر نار

اُمراے وقت کی مدح سرائی بھی کبھی کبھی کر دیتے ہیں۔ نہ کرتے تو کیا کرتے۔ زمانے کا رنگ یہی تھا مگر بیجا مبالغات کے قصور کا اعتراف بھی ہے اگرچہ ایسے قصور شاذ و نادر ہوئے ہیں۔ بلکہ حق یہ ہے کہ بیجا خوشامدوں کی آلودگی سے اپنے دامن کو بہت بچاتے ہیں مستعصم باللہ کے قتل پر جو مرثیہ کہا ہے اُس میں اپنے درد و دل کا پورا ثبوت دیا ہے۔ بادشاہ وقت قاتلوں کا شریک تھا۔ اُس کا ذکر بھی ہے تعریف میں شعر بڑھاتے ہیں۔ معلوم نہیں تقیہ ہے یا ہجو بلیح :-

مصلحت[1] بود اختیار رای روشن بین او　　زیر دستاں را سخن گفتن نشاید جز چنیں

غزل گوئی کے موجد شیخ سعدی سمجھے جاتے ہیں۔ زبان کو تو زمانہ خود صاف کر لایا تھا۔ چوٹ کھاے دل بھی فترت تاتار یہ کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے شیخ خود بھی حُسن پرست اور عاشق مزاج تھے۔ انھوں نے یہ ایجاد کی کہ تشبیب قصیدہ سے عشقیہ اشعار کو جدا کر کے ایک الگ صنف قرار دے دیا۔ اُن کی غیرت عشق قبول نہیں کرتی کہ معشوق کی تعریف کے بعد کسی اور کی تعریف کی جاے۔ خود کہتے ہیں :-

دعوی عشق حرام است مرآں بیہدہ گوی　　کہ چو دہ بیت غزل گفت مدیح آغاز د
مرحبا ہمت سعدی و سخنگوئے او　　کہ ز معشوق بہ ممدوح نمی پردازد

عشق اک آگ تھی جو شیخ کے قلب میں بھڑکتی تھی۔ عالم مجاز کے واقعات سے

[1] یعنے ہلاکو کو مدد کسی مصلحت سے دی ہوگی اور ہم رضا یا کیا کہہ سکتے ہیں۔

طبیعت میں سوز و گداز بھر دیا تھا۔ عالمِ حقیقت میں آئے تو وہ شعلے اور تیز ہو گئے۔ موسمِ بہار میں بلبل کے نغمے سُنے اور بیچین ہو گئے۔ مُنہ سے نکل گیا:۔

خبر ما برسانید بمرغانِ چمن　　　کہ ہم آواز شما در قفسے افتادست

کبھی اپنی بیتی یوں سُناتے ہیں:۔

سعدیا! نوبتِ[1] شب دُہلِ صبح بکوفت　　　یا مگر صبح نباشد شبِ تنہائی را

اور سُنئے:۔

سعدیا! ایں ہمہ فریادِ تو بے چیزے نیست　　　آتشے ہست کہ دود از سرِ آں می آید

پچھلے شاعروں کی غزل میں یہ سوز و گداز کہاں سے آتا؟ شیخ پر جو گزری وہ اُن پر کب گزری؟ سنو! کیا کہتے ہیں:۔

حدیثِ عشق چہ داند کسے کہ در ہمہ عمر　　　بسر نکوفتہ باشد درِ سرائے را

اس "سرائے" کی تنکیر کا لطف دیکھنا! اگر معشوق یا دوست کہدیتے تو یہ بات نہ رہتی۔ اُن کو تو بعض وقت یہ بھی کہتے اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ میں جورِ محبوب سے فریاد کرتا ہوں۔ جس عالم میں خود ہیں وہاں ظالم و مظلوم کے درمیان اتنا اتحاد ہے کہ دوئی کو راہ نہیں۔ جو معشوق کے جور و جفا کے شکوہ پرداز ہیں وہ فنا فی المعشوق نہیں ہوئے:۔

ہمہ از دستِ غیر نالہ کنند　　　سعدی از دستِ خویشتن فریاد

سچ یہ ہے کہ غزل کی پیغمبری انھیں کے لئے ہے (دیکھو صفحہ ۹۳) طول کا خوف اگر نہ ہوتا تو جی بھر کے لکھتا۔ تبرکاً چند شعر اور لکھے جاتے ہیں:۔

بمن ایں نظر حرام است و بے گناہ دارم
چہ کنم نمی توانم کہ نظر نگاہ دارم

---

[1] اگلے زمانے میں پانچوں وقت نوبت بجتی تھی اب بھی حسین آباد مبارک (لکھنؤ) میں صبح و شام نوبت بجتی ہے۔

ستم از کسے است بر من کہ ضرورت است بردن
نہ قرار زخم خوردن نہ مجال آہ دارم
چہ شب است یارب امشب کہ ستارۂ برآمد
کہ دگر نہ عشق خورشید و نہ مہر ماہ دارم

اسی شوریدہ سری نے گلستاں کے دامن پر یاب ہجم کا دھبّہ چھوڑ دیا ورنہ وہ پاکیزہ کتاب اس قابل نہ تھی کہ ایسے واقعات درج ہوتے۔

شیخ نے عربی میں بھی قصائد کہے ہیں اور ایک مختصر پند نامہ فارسی میں بچوں کے لئے نظم کیا ہے۔ کسی نے تعریضاً کہا کہ رزمیہ اشعار نظم نہیں کر سکتے۔ فوراً چند اشعار نظم کئے جو بوستاں میں شامل ہیں:۔

ہماندم کہ دیدیم گرد سپاہ | زرہ جامہ کردیم و مغفر کلاہ
چو ابر اسپ تازی برانگیختیم | چو باراں پلارک فرو ریختیم
دو لشکر بہم بر زدند از کمیں | تو گفتی زدند آسماں بر زمیں
زباریدن تیر ہمچوں تگرگ | بہر گوشہ برخاست طوفان مرگ
بصید ہزبراں پرخاش ساز | کمند اژدہاے دہن کردہ باز
زمین آسماں شد زگرد کبود | چو انجم درو برق شمشیر و خود۔

دیکھو! زور طبیعت خوب دکھایا ہے مگر فردوسی اور نظامی والی بات کہاں:۔

برانگیختم گرد ہیجا چو دود | چو دولت نباشد تہوّر چہ سود

واقعاً ان کے لئے میدان رزم میں قدم رکھنا تہوّر محض ہے۔ عشقیہ اور وعظیہ کلام کے بادشاہ ہیں۔ ایک یوروپین نے مجھ سے کہا تھا کہ "اسلام کی ایک تعلیم جو سعدی نے نظم کر دی ہے اُس سے بہتر کسی مذہب میں شاید نہ ملے گی":۔

چو بینی یتیمے سرافگندہ پیش | مدہ بوسہ بر روی فرزند خویش

اور تعلیم کو قومی یوں کر دیا :۔

مرا باشد از درد طفلاں خبر   کہ در طفلی از سر برفتم پدر
(از سر من برفت)

رباعیاں بیشتر وعظیہ ہیں اور مرغوب ہیں :۔

دوران بقا چو بادِ صحرا بگذشت   تلخی و خوشی و زشت و زیبا بگذشت
پنداشت ستمگر کہ جفا بر ما کرد   بر گردنِ او بماند و بر ما بگذشت

قانعی — قانعی طوسی تاتاریوں کی شورش سے خوف زدہ ہو کر ہندوستان چلا گیا اور وہاں سے عدن ہوتا ہوا حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوا پھر بغداد گیا اور وہاں سے قونیہ پہونچا۔ سلجوق روم کی بارگاہ میں رسائی ہوئی اور خطاب ملک الشعرا پایا مولانا روم کا مرثیہ اس نے نظم کیا ہے کہتے ہیں اس کے دیوان میں تین لاکھ شعر تھے۔

پور بہائی جامی — پور بہائی جامی صاحب دیوان شمس الدین جوینی کا شاعر تھا۔ زلزلۂ نیشاپور کے حال میں ایک مشہور قصیدہ یادگار ہے لیکن شاعرانہ اعتبار سے کوئی خاص بات اس میں نہیں جو نقل کیا جائے۔ کسی کا ایک دانت ٹوٹ گیا تھا تسلی کے لئے یہ رباعی کہدی :۔

گر شد گہرے ز دُرجِ نوشینت کم   در حسن نگشت ہیچ تمکینت کم
صد ماہ ز اطرافِ رُخت بیناہد   گو باش ستارۂ زپروینت کم!

امامی و مجد ہمگر — امامی ہروی۔ ابو عبداللہ محمد بن ابی بکر بن عثمان المتوفی ۶۶۷ھ۔ اتابکان فارس کے شعرا میں سر بلند تھا۔ مجد الدین ہمگر سے پوچھا گیا کہ سعدی اور امامی دونوں میں کون بہتر شاعر ہے۔ جواب دیا :۔

ما گرچہ بنطق طوطئ خوش نفسیم   بر شکرِ گفتہ ہای سعدی مگسیم
در شیوۂ شاعری باجماعِ امم   ہرگز من و سعدی بامامی نرسیم

امامی نے سُنا تو یہ کہا:۔

در صدرِ بلاغت ارچہ با دست رسم   در عالمِ نظم ارچہ مسیحا نفسم
دانم کہ بخاکِ درِ دستورِ جہاں   سحبانِ زمانہ مجد ہمگر نرسم

سعدی کو یہ سُن کے نہایت رنج ہوا۔ غور کرو تو سعدی پر صریحی ظلم تھا کہ اُس کا نام بھی کسی ایسے شاعر کے ساتھ لیا جاتا تھا کہ امامی سے کم درجہ قرار پاتا۔ شیخ نے بھی تعریضاً کہا:۔

ہر کسکہ بپایگاہ سامی نرسد   از بخت بد و سیاہ کامی نرسد
ہمگر چو بعمرِ خود دگر دست نواز   آری چہ عجب گر بہ امامی نرسد

اب ہم امامی کے چند بہترین اشعار نقل کرتے ہیں۔ قصیدہ کی حمد دیکھو:۔   امامی و مجد ہمگر

سحرگہ در جہانِ جان بعونِ مبدعِ اشیا   مسافت قطع می کردم زلا تا حضرتِ الّا
(پیدا کرنے والا)
جہاں را مرکزی دیدم محیطش دور پرکاری   کہ کروے آخرِ ہر دور از دورِ دگر مبدا
کواکب را چناں دیدم روانی صفحۂ گردوں   کہ از سیماب گوئے چند در مقدار نے از بیضا
یکے چوں کاسۂ سیمیں میانِ نیلگوں وادی   یکے چوں زورقِ زریں درونِ نیلگوں دریا

سلاست بھی کبھی کبھی آجاتی ہے جس کا نمونہ اس قصیدے سے معلوم ہوگا:۔

یک روز بود عید بہ یکسال ہر یکبار   ہموارہ مرا عید ز دیدارِ تو ہموار
یکروز بشاخ اندر یکبار بود گُل   روی تو مرا ہست ہمیشہ گلِ پربار
یکہفتہ بہ بیدار بود نرگسِ دشتی   آں نرگسِ چشمِ تو ہمہ سالہ بہ بیدار

بس جسقدر کلام امامی کا دیکھا انھیں دو رنگوں میں ہے۔ کجا سعدی کجا امامی۔ مجد ہمگر اور بھی پست ہیں:۔

چو عکسِ روئے تو پرتو بر آسماں انداخت   زمانہ را بد و خورشید در کماں انداخت
جہاں ز زحمتِ تاریکئ شب ایمن شد   چو آفتابِ رخت سایہ بر جہاں انداخت
فزود رونقِ بستانِ عارضت کاملاں   بنفشہ سایہ بر اطراف ارغواں انداخت

یہ تشبیب ایک بہترین قصیدے کی ہے جس میں اظہار تغزل کیا گیا ہے - رباعیاں بھی کہی ہیں - بعض فحش ہیں بعض صاف - مذاق طبیعت کا اندازہ اس رباعی سے ہوگا۔

در عشق تو کس تاب نیارد جز من　　در شورہ کسے تخم نکارد جز من
با دشمن و با دوست بدت میگویم　　تا ہیچکست دوست ندارد جز من

بہترین رباعی یہ ہے :-

تا کی عمرت بخود پرستی گزرد　　یا در غم نیستی و ہستی گزرد
آں عمر کہ مرگ باشد اندر پئے آں　　آں بہ کہ بخواب یا بمستی گزرد

عراقی

عراقی - فخر الدین ابراہیم ہمدانی کا نام صوفیانہ شاعری میں اس دور کی آخری یادگار ہے - قرآن مجید کا ناظرہ اور حافظہ ختم کرنے کے بعد کوئی سترہ برس کی عمر ہوگی کہ قلندروں کے ایک گروہ سے ملاقات ہوئی - ان میں سے ایک قلندر ایسا پسند آیا کہ اُس کے ہمراہ ہندوستان آئے اور یہاں شیخ بہاء الدین زکریا کے مریدوں میں شامل ہوئے - حسب دستور چلہ کشی کے لئے بیٹھے لیکن دسویں ہی دن مریدوں نے شیخ سے شکایت کی کہ نیا مرید بجائے اذکار و اوراد کے اپنی ایک غزل گایا کرتا ہے جو تمام اوباشوں میں مشہور ہو گئی ہے - شیخ نے بلوا کے وہ غزل سُنی - بعض اشعار درج کئے جاتے ہیں :-

نخستیں بادہ کاندر جام کردند　　ز چشم مست ساقی وام کردند
لب میگون جاناں جام در داد　　شراب عاشقانش نام کردند
سر زلف بتاں آرام نگرفت　　ز بس دلہا کہ بے آرام کردند
بہ مجلس نیک و بد را جائے دادند　　بجامی کار خاص و عام کردند
نہاں با محرمے رازے بگفتند　　جہانے را ازاں اعلام کردند
بعالم ہر کجا درد و غمے بود　　بہم کردند و عشقش نام کردند
چو خود کردند راز خویشتن فاش　　عراقی را چرا بدنام کردند

آخری شعر سنا تھا کہ شیخ نے کہا کہ انکے لئے ریاضت کی ضرورت نہیں اور خرقہ وغیرہ عطا فرمایا۔ پچیس برس ہندوستان میں قیام رہا یہانتک کہ شیخ نے رحلت فرمائی اور ان کو خلیفہ نامزد کرگئے مگر مریدوں کو مخالفت زیادہ ہوگئی مجبوراً زیارت حرمین کے لئے چلے گئے اور وہاں سے قونیہ میں آئے اور شیخ صدرالدین رومی کے شاگرد ہوئے۔ یہیں ابن عربی کی فصوص الحکم پر ایک کتاب تصوف میں لکھی جس کا نام لمعات ہے (ملا جامی نے اسکی شرح اشعۃ اللمعات لکھی ہے)۔ یہ کتاب عجب دلکش پیرایہ میں ہے۔ اصل تو نثر ہے لیکن بیچ بیچ میں عربی اور فارسی کے دلکش اشعار بھی درج کئے ہیں۔ معین الدین پروانہ کو ان سے ارادت ہوگئی اور ایک خانقاہ قیام کے لئے بنوادی۔ آخر عمر میں بلاد شام کا سفر کیا۔ وہیں اسکے بیٹے کبیرالدین ہندوستان سے آکے ملے اور وہیں ۶۸۸ھ میں انتقال کیا اور صالحیۂ دمشق میں ابن عربی کے برابر دفن ہوئے۔

غزل میں تصوف کا رنگ غالب ہے اور ایک عجیب قسم کی لذت کلام میں ملتی ہے۔ یہ بھی وہی اظہار واردات قلب ہے جس سے زبان خود بخود دلکش ہوجاتی ہے:۔

از پردہ بروں آمد ساقی قدحے بردست ۔۔۔ ہم پردۂ ما بدرید ہم توبۂ ما بشکست
بنمود رُخ زیبا گشتیم ہمہ شیدا ۔۔۔ چوں ہیچ نماند از ما آمد بر ما بنشست

دیکھو مرتبۂ فنا کو کن خوبصورت لفظوں میں ادا کیا ہے۔ اب مرتبۂ اتحاد کے لذات بیان کرتے ہیں:۔

زلفش گرہے بکشاد بنداز دل ما برخاست ۔۔۔ جان دل زجہاں برداشت واندر سر زلفش بست
دردام سر زلفش ماندیم ہمہ حیراں ۔۔۔ وز جام مئے لعلش گشتیم ہمہ سرمست
چوں سلسلۂ زلفش بند دل حیراں شد ۔۔۔ آزاد شد از عالم وز ہستی خود وارست

جام الست کا سیہ مست اپنی دُھن کا پکا ہے۔ ایک مثنوی عشاق نامہ بھی

نظم کر ڈالی ہے اگر ملتی تو یقیناً عجب کیفیت کی ہوتی۔ ایک شعر اور سنو:—

عراقی طالب درد است و آں نیز — با امیدے کہ درمانش تو باشی

سعدی و عراقی کے کلام پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ کی بارگاہ کمال کو آراستہ کرنے کے ساز و سامان مہیا ہو رہے ہیں۔ نہ ایسے کامل شعرا گذرتے نہ حافظ کی طبیعت میں زور آتا۔

اوحدالدین کرمانی

اسی سلسلے میں اوحدالدین کرمانی کا ذکر مناسب ہے۔ ان کی ایک مثنوی مصباح الارواح اور ایک دیوان بھی سات ہزار شعر کا ہے۔ شیخ محی الدین عربی، شمس تبریز، مولانا روم کے فیض صحبت سے مستفیض ہوئے تھے۔ مثنوی میں حقائق و معارف بیان کئے ہیں۔ انھیں کے ایک ہمنام اصفہان یا مراغہ میں پیدا ہوئے تھے جو ان کے مرید بھی تھے۔ ان کی مثنوی جام جم مشہور ہے اور سلطان ابوسعید کے نام پر معنون ہے۔ اس مثنوی کا رنگ حدیقہ سنائی سے ملتا ہے۔ دیوان بھی چھ سات ہزار شعر کا ہے جس میں علاوہ قطعات کے غزلیں بھی ہیں۔ ایک غزل درج کی جاتی ہے تاکہ رنگ طبیعت کا اندازہ ہو جائے:—

اوحدالدین اصفہانی

پیدا ست حال مردم رندان چناں کہ ہست
خرم کسیکہ فاش کند ہر نہاں کہ ہست

ای محتسب تو دانی شرع و اساس آں
آئین عشق را بگذار آنچناں کہ ہست

مومن ز دین برآمد و صوفی ز اعتقاد
ترسا مجدی شد و عاشق ہماں کہ ہست

خلقے نشان دوست طلب می کنند و باز
از دوست غافلند بہ بین نشاں کہ ہست

گر نام اوحدی سنگ تست از درش مران

اور ابھی لقب کہ تو خوانی بداں کہ ہست

سال وفات سنہ ۵۵۵ھ مجمع الفصحا میں دیا ہے مگر صحیح نہیں کیونکہ اوحدالدین سلطان ابوسعید کے ہمعصر تھے اور یہ سنہ چنگیز سے بھی سو برس پیشتر ہے بلکہ سنہ ۷۳۸ھ جو مشہور ہے وہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

محمود شبستری

محمود شبستری (المتوفی سنہ ۷۲۰ھ) نے مثنوی گلشن راز نظم کی جس میں مقامات تصوف میر حسینی کے پندرہ سوالوں کے جواب میں بیان ہوئے ہیں۔ اور اکثر قصص و روایات و تمثیلات لطیف درج ہیں (ملا عبدالرزاق لاہیجی نے اس کتاب کی شرح کی ہے)۔ اس کے علاوہ حق الیقین اور رسالۂ شاہد بھی انھیں کے تصنیفات سے ہیں۔

ہمام تبریزی

ہمام تبریزی (المتوفی سنہ ۷۱۴ھ) کا نام صاحب دیوان کے شعرا میں لیا جاتا ہے اور شیخ سعدی سے ایک نزاع لفظی کے سلسلے میں بھی ذکر آتا ہے۔ شاعری کا رنگ یہ ہے:-

وداع یار و دیار ہم بود بگر و خیال	شود منازل ما از آب دیدہ مالامال
فراق را نفسے چوں ہزار سال بود	ببیں کہ چوں گزرد روز و ہفتہ و مہ و سال

ایک رباعی بھی درج کی جاتی ہے:-

شد دوش بہ یار حکایت آغاز	از ہر بن موئیم بر آمد آواز
شب رفت و حدیث ما بپایاں نرسید	شب را چہ گنہ قصۂ ما بود دراز

افضل کاشی - سیف الدین اسفرنگی - رفیع ابہری - فرید احول - نزاری قہستانی وغیرہ وغیرہ بکثرت شعرا ہیں جنکا ذکر کرنا رہ گیا۔ سب سے آخر میں مولانا روم کے بیٹے سلطان ولد کا نام ہے۔ ان کی مثنوی رباب نامہ میں علاوہ فارسی اشعار کے ترکی اشعار بھی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ فارسی لٹریچر کا اثر ترکی شاعری پر کتنا نفیس پڑا ہے۔ اس مثنوی میں مولانا روم کے بھی اکثر واقعات زندگی درج ہیں۔ آپ کا تاریخی حیثیت سے اس سے زیادہ مستند حوالہ نہیں ہو سکتا۔

سلطان ولد

———

باب نہم

تیموریہ

تمہید

ابوسعید ایلخانیوں کا آخری فرمانروا ۱۳ ربیع الثانی ۷۳۶ھ میں رہگرائے ملک عدم ہوا اور اسی سال ۲۵ شعبان کو حسب روایت مطلع السعدین تیمور لنگ کی ولادت ہوئی۔ ابوسعید کی وفات سے لیکے فترت تیموریہ تک جتنا زمانہ گزرا اُس میں ایران چھوٹی چھوٹی سلطنتوں میں تقسیم ہو گیا تھا جنمیں سے ممتاز سلطنتیں چار تھیں (۱) آل مظفر جن کی حکومت فارس اور عراق عجم اور کرمان پر تھی۔ (۲) جلائر (ایلخانی) جو بغداد اور آذربائجان میں سلطنت کر رہے تھے۔ (۳) سربدار (یا سربدال) جو سبزوار کے بادشاہ تھے۔ اور (۴) کُرت جن کا مستقرّ ایالت ہرات تھا۔ یہ چند سلطنتیں اگرچہ مختصر تھیں مگر تربیت اہل فضل و کمال کے معاملے میں ہر ایک سبقت لے جانے کے لئے کوشاں تھی۔ لہذا پہلے انہیں کے مختصر حالات لکھے جاتے ہیں۔

آل مظفر

(۱) آل مظفر کی سلطنت کا آغاز مبارز الدین محمد سے ہے جسے سلطان الجائتو خاں نے یزد کی حکومت عطا کی تھی۔ اس کے بزرگ بھی ہلاکو خاں کے ساتھ رہے تھے اور اپنے کو عرب کہتے تھے جو ابتدائے فتوحات اسلامیہ میں آکے آباد ہوئے تھے۔ ۷۱۳ھ سے مبارز الدین کی حکومت کا آغاز ہوا۔ اس کے پانچ بیٹے تھے۔ شرف الدین مظفر۔ شاہ شجاع۔ قطب الدین محمود۔ احمد۔ بایزید۔ مبارز الدین کے عہد میں فتوحات بھی ہوئے۔ کرمان کو قطب الدین سے لیا اور فارس کو مع شیراز و اصفہان ابواسحٰق انجو کو شکست دیکے حاصل کیا۔ پھر تبریز پہ

حملہ آور ہوا اور نخجوان تک فتح کر لیا۔ آخر قسمت کا ستارہ گردش میں آیا اور اُس کے دو بیٹے محمود اور شاہ شجاع جو فتوحات میں مددگار رہے تھے مخالف ہو گئے جنہوں نے اُسے قید کر کے آخر عمر تک نہ نکلنے دیا۔ مبارز الدین کے بعد شاہ شجاع ۷۵۹ھ میں تخت نشین ہوا۔ یہ خود قابل آدمی تھا اور شاعر بھی تھا اسکے زمانے میں خواجہ حافظ شیراز کی شاعری۔ مولانا قوام الدین کا درس اور سید شریف جرجانی کا مدرسۂ دار الشفائے شیراز میں تقریباً یادگار رہے۔ اس نے محمود سے شیراز اور دولتشاہ سے کرمان لیا اور سلطان اویس جلائر کے انتقال کے بعد تبریز۔ نخجوان۔ قراباغ۔ سلطانیہ۔ شوستر بلکہ بغداد تک پر قبضہ کیا۔ محمود کا انتقال ۳۰ برس کی عمر میں ہو گیا اسے بیحد افسوس ہوا اور یہ رباعی کہی :۔

محمود برادرم کہ شد شیر کمیں — میکرد خصومت از پئے تاج و نگیں
کردیم دو بخش تا برآساید خلق — او زیر زمیں گرفت و من روئے زمیں

آخر عمر میں اپنے دو بیٹوں سلطان اویس اور سلطان شبلی سے ناراض ہو گیا بلکہ شبلی کی آنکھیں بھی نکلوا لیں اور اسی واقعے کے دوسرے سال ۷۸۶ھ میں انتقال کر گیا۔ بستر مرگ پر سے ایک خط تیمور کو لکھوایا جس میں اپنی وفاداری اور خیر خواہی کا اظہار کر کے اپنے بیٹے زین العابدین کی سفارش کی مگر وہ تین برس بھی تخت پر نہ بیٹھ سکا تھا کہ اہل خاندان نے معزول کر کے سلطنت آپس میں بانٹ لی۔ آخر ۷۸۹ھ میں تیمور نے پہلا حملہ عراق عجم اور فارس پر کیا اور ستر ہزار ایرانی قتل کئے اور مال و اسباب لوٹ کے چلا گیا۔ اسکے بعد چھ سال تک آل مظفر کے شاہزادے شاہ منصور والی فارس و اصفہان۔ شاہ یحیی والی یزد اور شاہ احمد حاکم کرمان آپس میں لڑا کئے یہانتک کہ

تیمور کا دوسرا حملہ ہوا جس میں شاہ منصور کو شکست دیکے زین العابدین کو پھر بادشاہ بنایا آخر تمام آل مظفر نے تیمور کی اطاعت قبول کی مگر رفتہ رفتہ سب قتل ہو گئے اور سنہ ۷۹۵ھ میں بجز شبلی اور زین العابدین کے کوئی نہ بچا۔ پھر تیمور ان دونوں کو بھی سمرقند لے گیا جہاں اپنی زندگی کے دن پورے کرکے مر گئے اور آل مظفر کا اس عبرتناک طریقے سے خاتمہ ہو گیا۔

(۲) جلائر۔ امیر چوبان اور حسن جلائر کا ذکر ابوسعید کے حال میں آچکا ہے جسکے انتقال کے بعد حسن جلائر نے اُس کی بیوہ دلشاد خاتون سے عقد کر لیا اور سات برس امیر چوبان کی اولاد اور حسن جلائر سے لڑائیاں رہیں۔ انقلاب زمانہ نے امیر چوبان کے خاندان کا خاتمہ کر دیا۔ ان میں سے حسن کوچک زیادہ مشہور ہے اور حسن جلائر کو تاریخ میں حسن بزرگ کہتے ہیں۔ یہ دونوں کسی نہ کسی شخص کو ہلاکو کے خاندان میں بادشاہ بنا کے آپس میں لڑا کرتے تھے آخر حسن بزرگ کا سنہ ۷۴۰ھ میں بغداد و تبریز پر قبضہ ہو گیا اور خود جلائر خاندان کا پہلا بادشاہ قرار پایا سنہ ۷۴۴ھ میں حسن کوچک کو اُس کی زوجہ نے مار ڈالا تو اور بھی اطمینان ہو گیا۔ بیس برس سلطنت کرکے حسن جلائر نے قضا کی اور اُسکا بیٹا سلطان اویس جو دلشاد خاتون کے بطن سے تھا وارث سلطنت ہوا۔ بیس برس اس نے بھی حکومت کی اور اہل فضل و کمال کی تربیت میں منہمک رہا۔ سلمان ساوجی انھیں تینوں کا مداح ہے سنہ ۷۷۶ھ میں اس کا بھی انتقال ہوا اور خاندان جلائر پر زوال آنے لگا جس دن اس کا انتقال ہوا اُسی دن اسکے بڑے بیٹے کو امرائے دربار نے قتل کرکے چھوٹے بیٹے حسین جلائر کو تخت نشین کیا

سلہ اس خاندان کو کبھی ایلخانی بھی کہتے ہیں کیونکہ حسن جلائر بن آق بوغا بن ابدکان اپنے کو ہلاکو کی اولاد میں کہتا تھا۔

جس کے زمانے میں شاہ شجاع مظفری نے حملہ کر کے بغداد تک پر قبضہ کر لیا تھا۔ پہلے اس کے بھائی علی نے مخالفت کی پھر دوسرے بھائی احمد[1] نے اسے قتل کر کے سلطنت حاصل کی مگر اُس پر اُس کے بھائی بایزید نے حملہ کیا۔ آخر دونوں میں بٹوارہ ہو گیا مگر خانہ جنگیوں کا خاتمہ تیمور کے حملے نے کیا۔ احمد اور اُس کے سپہ سالار قرا یوسف نے مقابلہ بھی کیا اور دونوں ہزیمت پا کے سلطان بایزید بلدرم کے یہاں پناہ گزین ہوئے پھر مصر چلے گئے۔ تیمور کے انتقال کی خبر سن کے واپس آئے تو دونوں آپس میں لڑ گئے۔ آخر قرا یوسف کے ہاتھوں جلائریوں کا خاتمہ ہو گیا۔

کرت (۳۱) کرت۔ سلطان غیاث الدین محمد غوری کا نواسا شمس الدین کرت امیر تویان کے ساتھ ہندوستان پر حملہ آور ہوا اور ملتان میں شیخ بہاء الدین زکریا[1] سے ملاقات کی پھر منگو قاآن خاں سے ملا جسکے دربار سے ہرات۔ جام۔ غرجستان۔ مرو۔ فاریاب وغیرہ کی دریائے سیحون تک اور اسفزار۔ سیستان۔ کابل وغیرہ کی دریائے سندھ تک سلطنت عطا ہوئی۔ ۶۶۲ھ میں سیستان فتح کر کے ہلاکو سے ملا اور تین برس بعد اباقا آن خاں سے ملاقات ہوئی اور بہت عزت و احترام ہوا۔ ۶۷۵ھ میں شمس الدین جوینی کے ہمراہ پھر ملاقات کی مگر ابکی بار سلطان اس سے مشتبہ نظر آیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۶۷۶ھ میں اسے زہر دیدیا گیا۔ پھر اس کا بیٹا رکن الدین بادشاہ ہوا اور ملک شمس الدین کہین لقب اختیار کیا۔ ۷۰۵ھ میں وہ بھی نذر اجل ہو گیا۔ اُس کی زندگی ہی میں ملک فخر الدین حکومت پا گیا تھا۔ اس نے غازان خاں اور الجائتو خاں سے مقابلے کئے اور ۷۰۶ھ میں مر گیا۔ کہتے ہیں اس کے دربار میں شعرا و علما کا مجمع

---

[1] عراقی کے مرشد

رہتا تھا اور تربیت علم وفضل ہوا کرتی تھی۔ پھر اس کا بھائی ملک غیاث الدین[4]
وارث ہوا۔ سنہ ۷۱۸ھ میں نکوداریوں سے مقابلہ ہوا اور سنہ ۷۲۰ھ میں فتح پائی
اور نکوداریوں کا بالکل استیصال ہوگیا۔ سنہ ۷۲۹ھ میں اس کا انتقال ہوا
اور ملک شمس الدین[5] تخت نشین ہوا مگر دو ماہ کے بعد مرگیا اور اُس کا بھائی
ملک حافظ[6] بادشاہ ہوا۔ دو برس بعد وہ بھی مرگیا اور ملک معز الدین[7]
تخت نشین ہوا۔ یہ وہی زمانہ تھا جب سلطان ابوسعید کا انتقال ہوا اور
تیمور لنگ کی ولادت ہوئی۔ اس کی سلطنت چالیس برس رہی اور سربداریوں
کا بڑھتا ہوا خاندان اسی کے ہاتھوں ختم ہوا۔ یہ بڑا بے رحم بادشاہ تھا اور
دشمنوں کے کٹے ہوئے سروں کے دو مینار نصب کرائے تھے۔ سنہ ۷۷۱ھ میں
اس نے وفات پائی اور اس کا بیٹا غیاث الدین[8] پیر علی بادشاہ ہوا۔ اب
تیمور کو اس مُلک کی طرف توجہ ہوئی۔ پہلے اپنی بھتیجی سوچ قتلق آغا کو پیر علی
کے بیٹے پیر محمد کے عقد میں دیا۔ پھر سلطنت پر حملہ کیا اور اپنے بیٹے میران شاہ[9]
کو حاکم کر دیا۔ پیر علی اور پیر محمد کو گرفتار کر کے سمرقند لے گیا اور سنہ ۷۹۱ھ میں
سارا خاندان کُرت ختم کر دیا۔

سربدار

(۴) سربدار۔ یہ خاندان پچاس برس تک امن و امان سے سبزوار میں
حکمراں رہا۔ اس عرصے میں بارہ بادشاہ ہوئے آخری بادشاہ خواجہ علی موید
نے اپنی حکومت بڑھالی تھی مگر معزالدین کُرت کے ہاتھوں ساری اُمنگوں کا
خاتمہ ہوگیا۔ ابن یمین اسی دربار سے توسل رکھتا تھا۔

امیر تیمور

امیر تیمور گورگان صاحبقران بعض کے نزدیک قوم کا گڈریا تھا
اور بعض مورخ چنگیز خاں کی اولاد سے بتاتے ہیں۔ اسکے حالات فارسی میں

ظفرنامۂ شرف الدین علی یزدی اور ظفرنامۂ نظام شامی سے
ملتے ہیں اور عربی میں ابن عرب شاہ کی تاریخ تیمور ہے جس میں اس کی
ہجو کے پل باندھے ہیں۔ علاوہ بریں تزک تیموری خود اس کی ترکی زبان
میں لکھی ہوئی ہے جس کا ترجمہ عہد شاہجہاں صاحبقران ثانی میں ابوطالب
حسینی نے فارسی میں کیا ہے۔ ۲۸ شعبان ۷۳۶ھ سال ولادت ہے
اور ساری عمر ایک فتوحات کا سلسلہ ہے جو ختم ہی نہیں ہوتا۔ ممالک اسلامیہ
کی تاخت و تاراج اس حد تک کی کہ ہلاکو خاں ثانی کا لقب[ف۱] ملا۔ ایران کی سلطنت
ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی تھی۔ اس وجہ سے اور بھی آسانی ہوئی۔ اسکے زیر اثر سلطنت
روس کے جنوب سے لیکے بلاد روم و عراق عرب و سلطنت ایران و ممالک
افغانستان بلکہ بیشتر بلاد ہندوستان بھی آگئے تھے۔ سلطان بایزید یلدرم عثمانی
کو شدید شکست دی تھی اور برقوق سلطان مصر سے صلح کر لی۔ آخر عمر میں
اسپین کے سفیر بھی تحائف لیکے آئے تھے اور چین پر حملہ کرنے کا ارادہ تھا
کہ پیمانۂ عمر لبریز ہوگیا۔ حقیقت یہ ہے کہ تیمور نہ "دجال کذاب" تھا۔ نہ
"صفات جلالیہ و قہریہ الٰہی کا مظہر" بلکہ ایک ملک گیر اور سخت مزاج بادشاہ
تھا۔ سکندر ہو یا چنگیز۔ تیمور ہو یا نپولین۔ کسی ملک گیر کی نظر میں انسان کی
زندگی کوئی چیز نہیں۔ لڑنا۔ مرنا۔ قتل و غارت کرنا ان کا کام ہے اور اسی
میں انکی کامیابی۔ بہرکیف فارسی لٹریچر کے لئے یہ زمانہ بھی عجیب ترقی کا ہے۔
خواجوی کرمانی۔ کمال خجند۔ ابن یمین۔ مغربی اور سب سے بڑھ کے حافظ شیرازی
اسی عصر میں ہوئے ہیں جنکے حالات عنقریب لکھے جائینگے۔ ۸۰۷ھ میں ۷۱ سال
دنیا میں رہ کے تیمور نے انتقال کیا اور چونکہ بڑے بیٹے جہانگیر اور دوسرے

ف۱ [illegible]

بیٹے عمر شیخ مرزا کا انتقال ہوچکا تھا لہذا پیر محمد جہانگیر اپنے پوتے کو اس عظیم سلطنت پر حکمرانی کے لئے نامزد کرگیا۔

شاہرخ

تیمور کے بعد میرانشاہ تیسرا بیٹا دو تین سال زندہ رہا مگر مخبوط الحواس۔ البتہ شاہرخ چوتھا بیٹا خراسان پر اطمینان سے حکومت کرنے لگا حسب وصیت پیر محمد کو سلطنت ملی مگر میرانشاہ کے بیٹے خلیل سلطان نے حملہ کرکے شکست دیدی اور سمرقند میں تخت نشین ہوا۔ یہ اپنی معشوق شادملک کا اتنا گرویدہ تھا کہ امراے دربار ناراض ہوگئے اور اُسے معزول کرکے جلاوطن کردیا۔ اب شاہرخ نے اس طرف کا قصد کیا اور وارث سلطنت تیموری ہوا۔ اسکے حکومت کا زمانہ نہایت امن وآسائش کا تھا۔ رفتہ رفتہ کل مفتوحات پر قبضہ کرکے باپ کے تاراج کئے ہوئے شہروں کو آباد کیا اور صنائع وفنون کی تربیت میں مصروف ہوگیا۔ سلاطین وقت سے بھی دوستانہ مراسم پیدا کئے اور خیرات ومبرات میں وہ نام پیدا کیا کہ حاتم وقت کہلانے لگا۔ آخر سنہ ۸۵۰ھ میں ۴۳ برس سلطنت کرکے وفات پائی۔

الغ بیگ

اسکے بعد **الغ بیگ** اسکا بیٹا تخت نشین ہوا۔ اس نے سمرقند کی مشہور رصدگاہ تعمیر کی اور خود زیج الغ بیگی مرتب کی جو علم ہندسہ وہیئت کی بہترین خدمت کہلانے کے قابل ہے۔ اسکا بیٹا عبداللطیف مخالف ہوگیا اور ایک شخص عباس نام کے ہاتھوں قتل کرادیا (عباس کشت تاریخ وفات ہے) مگر خود بھی عرصے تک زندہ نہ رہ سکا اور ایک شخص بابا حسین نے اسکا خاتمہ کردیا (بابا حسین کشت اسکی تاریخ وفات ہے)۔

زوال تیموریہ

اب آل تیموریہ پر زوال آگیا سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔ ہر تیموری اپنے کو وارث تخت سمجھتا تھا۔ اُدھر ترکمانوں کا زور بڑھا۔ پہلے قرا قیونلو (قرا یوسف) کا خاندان غالب آنے لگا پھر ان لوگوں پر زوال آیا اور آق قیونلو ترکمان غالب ہوئے۔ آخر اسمٰعیل شاہ

صفوی ان کا خاتمہ کرکے سنہ ۹۰۷ھ میں تخت نشین ہوا اور رفتہ رفتہ تمام ایران اطمینانی اور اجتماعی حالت سے اسکے زیر نگیں آگیا۔ تیموریہ خاندان کا ایک فرد فرید ازبکوں کے ہاتھ سے شکست کھا کے ہندوستان گیا اور عظیم الشان سلطنت مغلیہ کا بانی ہوا۔ یہ تیمور کے پوتے کا پوتا ہے اور نام اسکا ظہیر الدین محمد بابر شاہ ہے۔

آل تیمور کی شائستگی

عہد تیموریہ جسکی ابتدا قتل و غارت سے ہے اور انتہا پراگندگی اور شورشوں پر ہے۔ ترقی علوم و فنون کے لئے مشہور ہے۔ ایران کی لطافت طبع کے نمونے جو آج ملتے ہیں اسی عہد کی یادگار ہیں۔ تہذیب و شائستگی کے اعتبار سے تیموری خاندان کے افراد اپنے زمانے میں فرد نظر آتے ہیں صفوی خاندان کے آرائش و زیبائش کے سامانوں کی صنعت یہی لوگ اپنے زمانے میں شروع کر گئے تھے اور انکے عظمت و جلال کی خشت اولین گویا پہلے ہی سے رکھ گئے تھے۔

ترقی علوم کے متعلق اتنا کہنا کافی ہے کہ سعد الدین تفتازانی۔ سید شریف جرجانی۔ صاحب مواقف اور صاحب قاموس وغیرہ اس دور کے آغاز میں گزرے ہیں اور فارسی میں بھی بعض عمدہ تصنیفیں اسی عہد میں شائع ہوئی ہیں۔

شمس فخری

پہلا شخص قابل ذکر شمس فخری ہے جسکی کتاب معیار سنہ ۷۴۵ھ میں شیخ ابو اسحق انجو کے لئے لکھی گئی۔ اس میں علاوہ عروض و قافیہ و بدیع کے قدیم اور غیر مستعمل فارسی الفاظ کی فرہنگ دی ہوئی ہے جو نہایت مفید ہے۔

معین یزدی

معین الدین یزدی کی مواہب الٰہی آل مظفر کی تاریخ ابتدا سے سنہ ۷۶۶ھ تک ہے اور بیشتر چشمدید واقعات درج ہیں۔

فخر شیرازی

شیخ فرید الدین ابو العباس احمد شیرازی نے شیراز نامہ سنہ ۷۴۷ھ میں تصنیف کیا جس میں علاوہ شعرا کے بکثرت علما و مشائخ کے حالات درج کئے ہیں۔

نظام الدین شامی

نظام الدین شامی کے ظفر نامہ کا ذکر ہو چکا ہے۔ جب تیمور نے بغداد پر حملہ کیا تو یہ پہلا شخص تھا جو فاتح سے ملنے کو باہر چلا آیا تھا۔ سنہ ۸۰۳ھ میں حلب میں

قید تھا اور یہاں کے قلعے کی تسخیر اپنی آنکھوں سے دیکھی ۸۰۴ھ میں امیر تیمور نے اسے تاریخ لکھنے کا حکم دیا اور کاغذات متعلقہ حوالے کئے ۸۰۶ھ میں جب تیمور ملک گیری کیلئے چلا تو اُسے اپنے پوتے عمر بہادر بن میران شاہ کے یہاں بھجوا دیا جہاں یہ تاریخ ختم ہوئی۔

شرف الدین علی یزدی

شرف الدین علی یزدی کا **ظفر نامہ** اسکے بعد تصنیف ہوا ہے۔ عبارت متعلق اور مسجع ہے اور بیشتر واقعات ظفر نامہ نظام شامی سے لئے ہیں یہانتک کہ قرآن مجید کے اقتباسات اور اشعار بھی اُسی کتاب کے ہیں کہا جاسکتا ہے کہ وہی ظفر نامہ مرصع کیا گیا ہے لیکن اس ظفر نامہ کی اشاعت نے اُس کا چراغ گل کر دیا۔ ۸۲۸ھ میں ظفر نامہ تصنیف ہوا۔ **صنف فی شیراز** تاریخ اختتام ہے۔ اسکے علاوہ ایک کتاب معما اور چیستان پر لکھی اور ایک شرح قصیدۂ بُردہ کی تصنیف کی۔ کحل المراد در علم وفق اعداد میں طلسمات اور تعویذات درج کئے ہیں۔ ایک دیوان اور ایک مثنوی نظم میں اسکی یادگار ہے مصنف کی بیشتر زندگی شاہرخ اور اُسکے بیٹے مرزا ابراہیم سلطان کے یہاں گذری۔ پھر درس و تدریس میں مشغول ہو گیا یہانتک کہ سلطان محمد والی عراق نے اُسے قم میں بُلا لیا جب شاہرخ نے اُس پر بہ جرم بغاوت حملہ کیا اور فتح پائی تو مشیران کار کو قتل کیا شرف یزدی بھی اُنھیں میں تھا مگر مرزا عبداللطیف نے سفارش کی کہ اسے میرے باپ الغ بیگ کے پاس بھیجدیجئے۔ رصد خانہ میں ضرورت ہے۔ بادشاہ نے جان بخشی کی اور سمرقند بھیجدیا۔ وہاں سے آخر عمر میں وطن واپس ہوا اور ۸۵۸ھ میں وہیں انتقال کیا۔

حافظ آبرو

حافظ آبرو (نور الدین لطف اللہ ہروی) نے **زبدۃ التواریخ** لکھی اور بائسنقر پسر شاہرخ کو نذر کی۔ مجمل فصیحی میں اس کتاب کا نام مجمع التواریخ سلطانی لکھا ہے۔ ۸۲۳ھ میں علاوہ تاریخ کے ایک جغرافیہ بھی تصنیف کر کے شاہرخ کے نام پر معنون کیا تھا مصنف تیمور کے ہمراہ بعض فتوحات میں موجود تھا اور شاہرخ کے

زمانے میں بیشتر اپنے وطن ہرات میں رہا۔ ۸۳۳ھ میں زنجان میں وفات پائی۔ اور وہیں دفن ہوا۔ **فصیحی** خوافی کی مجمل بھی اسی عہد کی تصنیف ہے اور ۸۴۵ھ تک کے حالات اس میں درج کئے ہیں۔ مصنف کو ۸۰۰ھ میں نظارت خزانہ کا عہدہ ملا۔ ۸۱۸ھ میں جب شاہرخ اپنے بھتیجے بیقرا کی بغاوت کو فرو کرنے کیلئے شیراز گیا تو یہ ہمراہ تھا۔ پھر نظارت مالیہ کا کام کرمان میں کرتا رہا۔ وہاں سے بادغیس گیا۔ ۸۲۸ھ میں بائسنقر نے اسے پھر سرکاری ملازمت عطا کی۔ ۸۴۳ھ میں عتاب سلطانی ہوا اور قید خانے میں زندگی کاٹی۔ جب رہا ہوا تو ۸۴۹ھ میں اپنی کتاب مجمل شاہرخ کو نذر دی۔ یہ کتاب فارسی میں ہے اور ادبیات کی زیادہ توضیح کی گئی ہے۔

فصیحی

کمال الدین عبد الرزاق سمرقندی (تاریخ ولادت ۸۱۶ھ مولد ہرات) نے پچیس سال کی عمر میں ایک کتاب صرف و نحو میں لکھ کے شاہرخ کو نذر دی اور مورد الطاف ہوا۔ ۸۴۵ھ میں بیجاپور سفارت پر آیا اور تین برس رہ کے واپس گیا۔ ۸۵۰ھ میں پھر سفیر ہو کے گیلان گیا۔ شاہرخ کے بعد مرزا عبد اللطیف۔ عبد اللہ[1]۔ ابو القاسم بابر[2] اور آخر میں ابو سعید[3] کی ملازمت میں رہا۔ آخر عمر میں ہرات واپس گیا اور شاہرخ

کمال الدین سمرقندی

---

[1] عبد اللہ بن ابراہیم بن شاہرخ (المتوفی ۸۶۱ھ) کو عبد اللطیف کے بعد سلطنت ملی اور عراق و فارس و کرمان پر اسکے زمانے میں جہانشاہ بن قرا یوسف ترکمان کا قبضہ ہو گیا۔ [2] ابو القاسم بابر بن بائسنقر بن شاہرخ کو عبد اللہ بن ابراہیم کے مقابلے میں ادعائے سلطنت ہوا تھا۔ اور بعض شہروں پر سلطنت بھی کرتا تھا (یہ سلطنت مغلیہ کا بانی ظہیر الدین محمد بابر نہیں ہے) [3] سلطان ابو سعید نبیرہ میرانشاہ بن تیمور گویا آل تیمور کا آخری چراغ تھا۔ علما و فضلا کی تربیت کا اسے شوق تھا۔ ترکستان۔ خراسان۔ زابلستان۔ مازندران پر عبد اللطیف کے بعد اسکی حکومت ہوئی۔ جہانشاہ نے اسکی زمانے میں ہرات کو فتح کیا اور اسکے مقبوضات پر تسلط حاصل کیا۔ ازون حسن آق قیونلو نے جہانشاہ کو قتل کیا تو ابو سعید حکومت ایران کے شوق میں اس سے لڑنے گیا مگر شکست کھائی اور گرفتار

کی بنوائی ہوئی خانقاہ کا شیخ ہو گیا۔ ۸۸۷ھ میں انتقال کیا **مطلع السعدین**
اسی کی تصنیف ہے جس میں ابو سعید[1] ایلخانی کے حال سے ابو سعید[3] تیموری تک
کے حالات درج ہیں۔ **معین الدین محمد اسفزاری** نے روضۃ الجنات
فی تاریخ مدینۃ ہرات میں ۸۷۵ھ تک کے واقعات لکھے (شہر صفر تاریخ اختتام
ہے۔ اسی مہینے میں یہ کتاب ختم بھی ہوئی تھی۔) اور سلطان[2] حسین ابو الغازی کو
نذر دی۔ یہ بادشاہ اور اس کا وزیر امیر علی شیر (المتوفی ۹۰۶ھ) دونوں بزرگ
فضل و کمال کے لئے تاریخ میں مشہور ہیں۔ محمد بن خاوند شاہ بن محمود المعروف

(معین الدین اسفزاری)

بمیر خاوند (المتوفی ۹۰۳ھ) نے **روضۃ الصفا** لکھی اور امیر علی شیر کو نذر دی۔
ابتدائے آفرینش سے ۸۷۳ھ تک کی تاریخ چھ جلدوں میں ہے۔ ساتویں جلد غالباً
اسکے پوتے خاوند میر نے اضافہ کی اور ۹۱۲ھ تک پہونچا دیا۔ اسی جلد میں سلطان
حسین ابو الغازی کے حالات بالتفصیل ہیں۔ عبارت پوری کتاب کی فصیح و بلیغ
ہے اور کسی قدر پر تکلف بھی۔ رضا قلی خاں ہدایت نے ناصر الدین شاہ قاچار کے عہد
میں ایک ضمیمہ بڑھایا جس میں اپنے وقت تک کے حالات درج کئے ہیں اور
پامیوں کے واقعات اچھی طرح لکھے ہیں۔ خاوند میر (المتوفی ۹۴۱ھ) اُس کے
پوتے نے **حبیب السیر** لکھی۔ یہ ۹۲۹ھ کی تصنیف ہے اور اچھی تاریخ ہے۔

(روضۃ الصفا)

(حبیب السیر)

ان تاریخوں کے علاوہ تذکرے بھی نہایت عمدہ لکھے گئے۔ منجملہ اُن کے
دولت شاہ سمرقندی کا تذکرۃ الشعراء ہے ۸۹۲ھ میں یہ کتاب ختم ہوئی اور
حالات شعراء میں علاوہ قصص و حکایات کے کلام کے انتخابات بھی درج کئے گئے

(تذکرۂ دولت شاہ)

---

[1] چنگیز خانیوں کا آخری فرمانروا۔ [2] حسین بن منصور بن بیقرا ابن عمر
شیخ بن تیمور کی حکومت ابو سعید تیموری کے بعد ہرات میں قائم ہو گئی اور
۳۰ برس سلطنت کر کے ۹۱۱ھ میں انتقال کیا۔ ملا جامی، میر خوند اور مشہور

بلکہ اکثر سلاطین کے حالات بھی ذیل کلام میں آگئے ہیں۔ عبارت نہایت صاف ہے۔ ابوالغازی سلطان حسین نے ۹۰۹ھ میں مجالس العشاق لکھی اور اپنی علمی قابلیت کا پورا ثبوت دیا۔ دیباچہ کی عبارت رنگین ہے اور شعراء کے صوفیہ کے کلام سے مزین۔ ابتدا میں عشق حقیقی اور مجازی کی بحث ہے۔ پھر ۷۶ مضمون ہیں جن میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے لیکے جامی تک کے حالات درج کئے ہیں۔ آخر میں آپ اپنے حالات بھی لکھے ہیں۔ اس لئے بابر نامہ کا بابر کی تصنیف ہونے سے انکار کیا ہے اور کہتا ہے کہ میر علی شیر کا تربیت یافتہ کمال الدین حسین گازرگاہی اس کا مصنف ہے۔ دیکھو اس زمانے کے سلاطین بھی طبقۂ اہل علم میں داخل ہونا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے۔ ملا حسین واعظ کاشفی اس زمانے کے کامل انشا پرداز تھے۔ سلطان ابوالغازی نے انہیں خراسان کے بلاد کے ہرات کا خطیب مقرر کیا اور وہیں سنہ ۹۱۰ھ میں انکا انتقال ہوا۔ طرز تحریر نہایت رنگین اور موثر ہے۔ نثر میں پوری نظم کی دلکشی ہے اور جابجا نظموں نے سونے میں سہاگے کا کام کیا ہے۔ ان کی نثر کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ گلستان اور سہ نثر ظہوری کی درمیانی حالت میں ہے یعنی نہ گلستان کے سے بے تکلف اور سہل ممتنع فقرے ہیں۔ نہ ظہوری کے پیچ در پیچ استعارات و صنائع۔ آورد ہے مگر اعتدال کے ساتھ مرادف الفاظ اور جملے ہیں مگر تکلیف دہ نہیں۔ ان کی تصانیف میں روضۃ الشہدا مشہور کتاب ہے وہ مجلس ہے محققانہ نظر سے اگر دیکھو تو بعض واقعات مصائب امام حسین علیہ السلام میں ضعیف بلکہ موضوع بھی ملیں گے مگر ترتیب ایسی دلکش ہے کہ مجالس میں عام طور سے یہی پڑھی جاتی تھی اور فرمائش ہوتی تھی کہ روضۃ الشہدا

مجالس العشاق

روضۃ الشہدا ✓

سلہ حبیب السیر میں انکا نام کمال الدین حسین لکھا ہے اور خوش آوازی کی بڑی تعریف کی ہے

خوان کو بلاؤ نتیجہ یہ ہوا کہ مجلسیں پڑھنے والے روضہ خوان کہلانے لگے۔

اخلاق محسنی

اخلاقِ محسنی میں مختلف اخلاقِ فاضلہ کی توضیح کی ہے مگر عربیت کی کثرت
سے ہر توضیح مغلق ہو گئی ہے۔ پھر ہر خلق کے متعلق حکایتیں درج کی ہیں اگر
گلستاں کا جواب سمجھا جائے تو دونوں میں ذرہ اور آفتاب کی بھی نسبت

انوار سہیلی

نہیں۔ یوں بہت اچھی ہے۔ انوارِ سہیلی میں کلیلہ و دمنہ کا قصہ نہایت
شیریں اور دلکش انداز میں لکھا ہے اگرچہ زورِ قلم سے داستان کو بیحد طویل
کر دیا ہے۔ مثنوی مولانا روم کا خلاصہ بھی تیار کیا تھا جس کا نام لب لباب
ہے اور تفسیر میں جواہر التفاسیر لکھی تھی۔ محقق دوانی (جلال الدین محمد بن
سعد الدین اسعد) ۸۲۹ھ پیدا ہوئے۔ پہلے اپنے والد ماجد کے شاگرد
ہوئے پھر ملا محی الدین انصاری۔ خواجہ حسن شاہ اور سید شریف وغیرہ سے
درسیات پڑھے یہاں تک کہ علماے زمانہ میں شمار ہونے لگا اور رفتہ رفتہ
محقق کہلانے لگے تحصیل علم سے فراغت حاصل ہونے پر گازرون کے قاضی
ہوئے پھر مدرسۂ دار الایتام کے صدر مقرر ہوے۔ سلاطین آق قونیلو نے
انھیں قاضی القضاۃ کا عہدہ عطا کیا آخر ۹۰۸ھ میں انتقال کیا۔ نظم
میں فانی تخلص تھا اور نثر میں عمدہ کتابیں تصنیف کی ہیں۔ شرح ہیاکل۔

اخلاق جلالی

شرح عقائد عضدی۔ نور الہدایہ وغیرہ مگر شہرت انکی اخلاقِ جلالی سے
دنیاے ادب میں قائم ہوئی۔ عبارت کسی قدر دقیق ہے اور جملے طویل۔
عالمانہ و حکیمانہ رنگ کے آدمی ہیں۔ اخلاقِ ناصری کے مباحث اپنے
رنگ میں بیان کئے ہیں مگر اتنی پختگی نہیں جتنی محقق طوسی کے یہاں ہے لیکن
کسی دوسرے کی مجال نہیں کہ ان سے اس رنگ میں ہمسری کا دعویٰ کر سکے
افسوس کہ نثر ہی کے بیان میں اتنا طول ہو گیا اور ابھی بہت لوگ

باقی ہیں مگر اب ہم ایک اور بزرگ کا ذکر کرتے ہیں جو اس عہد کے نظم و نثر دونوں کے خاتم ہیں۔ مولانا عبدالرحمٰن جامی کا فروغ ہرات میں ہوا۔ درسیات سے فارغ ہونے کے بعد علوم باطن کی طرف توجہ ہوئی۔ شیخ سعدالدین کاشغری کے مرید ہو کے ایسا تصفیۂ قلب کیا کہ شیخ کے بعد سجادہ نشین ہوئے۔ علم و فضل کے علاوہ فن شعر اور سلسلۂ ارادت میں جامی کا پایہ اتنا بلند ہے کہ اس جامعیت کا شخص ایران میں مشکل سے نظر آئے گا۔ سلاطین روزگار انکی عزت کرتے تھے۔ اور صاحبان ثروت انکی خدمت کو اپنا فخر سمجھتے تھے۔ اس مقام پر انکی کتابیں نثر کی ذکر کی جاتی ہیں۔ نظم پر نظر اس دور کے خاتم الشعراء کی حیثیت سے آخر میں کی جائیگی۔

جامی

نفحات الانس

نفحات الانس فارسی میں اولیا کا تذکرہ ہے۔ تاریخ تصنیف ۸۸۱ھ ابتدا میں تاریخ تصوف سلیس زبان میں بیان کی ہے مگر حالات تاریخی ترتیب سے لکھے ہیں یہانتک کہ کمال اسمٰعیل۔ حافظ شیرازی اور مغربی وغیرہ حالات بھی آگئے ہیں۔ مذاق سلیم کا اندازہ طرز تحریر سے ہوتا ہے کہ واقعات کے بیان میں لفاظی اور صنعت گری سے بالکل دور رہتے ہیں۔

بہارستان

دوسری تصنیف بہارستان ہے جسے گلستاں کے جواب میں لکھا ہے۔ اس کی عبارت میں کسی قدر تکلفات ہیں اور گلستاں سے قطع نظر کر کے نہایت عمدہ کتاب ہے۔ ہاں سعدی کا مقابلہ اس میدان میں بالکل بیکار ہے۔

اشعۃ اللمعات

اشعۃ اللمعات عراقی کے لمعات کی شرح تصوف میں بے نظیر کتاب ہے اور دقائق معارف کو نہایت خوبی سے حل کیا ہے۔ ۸۸۶ھ میں یہ کتاب ختم ہوئی اور تَمَّمْتُہٗ تاریخ اختتام ہے۔ اسی طرح

لوائح

لوائح بھی تصوف میں ہے۔ طرز تحریر کے اندازہ کے لئے خاتمہ کے چند فقرات لکھے جاتے ہیں:۔

"الٰہی الٰہی خَلِّصْنَا مِن اشتغالِ الملاہی وَ اَرِنَا

حقائق الاشیاء کماہی ــ خشا و بے غفلت از بصر بصیرت ما بکشا۔
ہر چیز را چنانکہ ہست بنمائے۔ نیستی را بر ما در صورت ہستی جلوہ مدہ۔ و از نیستی
بر جمال ہستی پردہ منہ۔ ایں صور خیالی را آئینہ تجلیات جمال خود گرداں نہ علت حجاب
و دوری۔ و ایں نقوش وہمی را سرمایۂ دانائی و بینائی ما گرداں نہ آلت جہالت و
کوری" الخ

مولانا جامی کے اور بھی تصانیف نادر ہیں یہاں تک کہ موسیقی پر بھی ایک رسالہ لکھا ہے مگر ہم اپنا اختصار کو مد نظر رکھ کے تاریخ نظم شروع کرتے ہیں۔

ابن یمین

امیر فخر الحق والدین محمود بن یمین فریومدی (المتوفی ۷۶۹ھ)۔ انکے باپ یمین الدولہ ترکی النسل تھے اور سلطان الجائتو کے زمانے میں آ کے فریومد میں مقیم ہوئے تھے۔ خواجہ علاء الدین وزیر سلطان ابوسعید انکے مربی تھے۔ ابن یمین اسی قریہ میں پیدا ہوئے۔ صاحب مجمع الفصحا وغیرہ نے انھیں سربداریوں کے مداحوں میں شمار کیا ہے اور امیر تیمور کا بھی مداح سمجھا ہے۔ کہتے ہیں کہ سربداریہ کے ہنگامۂ زوال میں دیوان ضائع ہو گیا۔ اخلاقی شاعری میں قطعات بہت بلند پایہ کے ہیں۔ تشبیہات میں جدت تخیل بھی نہایت قوی ہے اور زبان سلیس اور شستہ۔ سپاہ جاہلی پر کیا خوب کہا ہے:

ز دیوانہ کرد و وزیرے سوال — سلیمان مرسل علیہ السلام
که چوں با چنیں [illegible] — مرا با شما با ہم احتشام
چه خوش گفت دیوانه در راه جا — که چوں نیست ایں مملکت مستدام
بہ [illegible] آمدن سر ... — تو در باد بسود ولی صبح و شام
بیکار نظام کرنا — بیکار نظام کرنا

تحفۂ سلیمان اور [illegible] ساز کی داؤد پر نظر کرو تو محاورات میں لطف

ایہام خاص رنگ میں نظر آئے گا۔ زر پرست شعرا کی شان میں کہتے ہیں:۔

شاعری نیست پیشۂ کہ ازاں　　رسد نان و نبیذ تره و دوغ
راستی سخت زشت و بے معنی است　　اجرتے خواستن برائے دروغ
زاں بود کار شاعراں بے نور　　کہ ندارد چراغ کذب فروغ

کبھی کبھی رموز فلسفہ اور نکات تصوف کبھی نظم کرتے ہیں اور صفائے زبان کی قوت سے دقیق مطالب کو آسان کر دیتے ہیں۔

خواجو　کمال الدین ابوالعطا محمود بن علی بن محمود المعروف بہ خواجوے کرمانی شرفائے کرمان سے تھے ۶۷۹ھ میں پیدا ہوئے۔ علوم رسمیہ پڑھ کے سیاحت کا شوق ہوا۔ مختلف بلاد کا سفر کیا۔ اسی سلسلے میں شیخ علاء الدین سمنانی کے مرید بھی ہوئے۔ شاعری کی حیثیت سے آغاز حال میں انکا تعلق پہلے آل مظفر کے دربار سے معلوم ہوتا ہے اور غالباً یہ وہیں مبارز الدین محمد مظفری کے یہاں ابتدا میں حاضری دی ہے۔ پھر شیخ ابو اسحق انجو کے یہاں شیراز میں رہے۔ بعض قصائد میں شروانشاہ اور قزل ارسلان والی عراق کی تعریف کی ہے اور بعض میں دربار بغداد سے بھی تعلق ظاہر کیا ہے۔ بظاہر سیر و سیاحت کا شوق ایسا غالب تھا کہ کہیں جم کے نہ رہے۔ خزانۂ عامرہ میں لکھا ہے کہ شیخ ابو اسحق کے بیٹے علی سہل کا ختنہ ہوا۔ اس تقریب میں خواجو نے ایک قصیدہ کہا۔ بادشاہ نے انعام میں ایک کشتی اشرفیوں سے بھر کے عطا کی۔ دولت دیکھتے ہی شادی مرگ ہو گئے۔ سال وفات ۷۵۳ھ ہے اور مدفن مقام "اللہ اکبر" جو بعد کو حافظ شیرازی کی سیرگاہ بن گیا تھا۔ غزل گوئی انکا خاص جوہر ہے۔ حافظ کہتے ہیں:۔

استاد غزل سعدی است پیش ہمہ کس اما　　دارد سخن حافظ طرز روش خواجو

---

[1] غزل گوئی کی تنقید کے لئے صفحہ (　) دیکھو۔

خمسہ نظامی کا جواب بھی نظم کیا ہے۔ نوروز و گل[۱] (۵۶۱۲ شعر) ہمائے و ہمایون[۲] (۴۰۳۲ شعر) کمال نامہ[۳]۔ روضۃ الانوار[۴]۔ ایک اور مثنوی[۵] جس کا نام یاد نہیں آتا۔ علاوہ ان کے قطعے اور رباعیاں بھی کہی ہیں اور مستزاد بھی نظم کئے ہیں :—

کس نیست کہ گوید ز من آن ترک خطا را — گر رفت خطائے
باز آے کہ داریم توقع بتو ما را — یا وعدہ وفائے
مِنداز بنا رمن دلسوختہ قلفل — بر آتش رخسار
[ہِنداز]
کافتادم ازاں دانۂ مشکینِ تو یارا — در دام بلائے
امروز منم چوں خم ابروے تو در شہر — مانند ہلالے
تا دیدہ ام آں صورت انگشت نما را — انگشت نمائے
در شہر شما قاعدہ باشد کہ نپرسند — احوال غریباں
آخر چہ زیاں مملکت حُسن شما را — از بے سروپائے الخ

عبید زاکانی

عبید زاکانی[۱] نظام الدین عبید اللہ کی نشو و نما شیراز میں ابو اسحٰق انجو کے زمانے میں ہوئی اور علم و فضل میں امتیاز حاصل کیا یہاں تک کہ قزوین کا قاضی مقرر ہو گیا۔ اسکے زمانے میں تاتاریوں کی بڑھتی ہوئی قوت نے ایرانیوں کی حالت خراب کر دی تھی اور اخلاق رذیلہ کی طرف شغف بڑھتا جاتا تھا۔ مجبوراً اُس زمانے کی حالت دکھانے کے لئے **اخلاق الاشراف** تصنیف کی اور جہالت کا خاکہ **رسالۂ دلکشا** میں کھینچا۔ پھر اخلاق حسنہ کی تعلیم کے لئے **رسالہ صد پند** اور **رسالۂ تعریفات** تصنیف کئے جن سے اس کا کمال علمی بخوبی ثابت ہوتا ہے۔ خستہ حالی اور نا داری کے غلبہ نے درباری شعرا میں داخل ہونے کا شوق پیدا کیا اور ایک رسالہ معانی و بیان میں تیار کر کے

---

[۱] زاکان مضافات قزوین کا ایک قریہ ہے۔

ابواسحق کو پیش کرنا چاہا مگر اہلِ دربار نے کہا کہ بادشاہ کو یہ لغویات پسند نہ آئیں گے۔ پھر ایک قصیدہ نظم کیا مگر کہا گیا کہ بادشاہ جھوٹی خوشامد بہت ناپسند کرتا ہے۔ آخر ہزل گوئی شروع کر دی اور بے تکان ہجو میں تصنیف کرنے لگا جن میں سے اگر فحش نکال ڈالا جائے تو عالی دماغی۔ نازک خیالی سب کچھ ملیگی۔ اب عبید کی طرف توجہ ہو گئی اور بڑے بڑے انعام اور جائزات ملنے لگے۔ زمانے کا عجیب رنگ تھا عبید سا ہنرمند اور یہ تضیع اوقات! تنگ دل ہو کے کہتا ہے:۔

ای خواجہ مکن تا بتوانی طلب علم — کاندر طلب راتب ہر روزہ بمانی
رو مسخرگی پیشہ کن و مطربی آموز — تا داد خود از کہتر و مہتر بستانی

سلمان ساوجی اس کا ہمعصر تھا۔ اس نے جو فن شعر میں یہ لغویات سنے تو عبید سے ناراض ہو گیا اور کہا:۔

جہنمی ہجا گو عبید زاکانی — مقرر است بہ بے دولتی و بے دینی
اگرچہ نیست ز قزوین و روستا زادہ است[1] — ولیک میشود اندر حدیث قزوینی[1]

عبید نے یہ ہجو سنی تو بغداد جا پہونچا۔ دیکھا سلمان دجلہ کے کنارے بڑی شان و شوکت سے کھڑا ہوا سیر کر رہا ہے اور علما و کاملین فن اسے حلقے میں لئے ہوئے ہیں۔ غرض کسی نہ کسی طرح یہ بھی اس صحبت میں شریک ہوا۔ سلمان نے یہ مصرعہ کہا:۔

دجلہ را امسال رفتارے عجب مستانہ است

اور یہ کہا کہ کوئی اس پر دوسرا مصرعہ لگائے۔ عبید نے برجستہ جواب دیا:۔

پای در زنجیر و کف بر لب مگر دیوانہ است[2]

---

[1] یعنے گفتگو میں اسے قزوینی کہنا ٹھیک ہے حالانکہ اس سے بد تر ہے کیونکہ قزوین کا دیہاتی ہے۔ لطیفہ یہ ہے کہ ایران میں قزوینی لوگ بیوقوف سمجھے جاتے تھے اسی طرح طوس کے لوگ بخیل اور خراسانی لوگ گدھے ہندوستان میں بھی بعض مقامات ایسے ہی خصوصیات سے منسوب ہیں۔ [2] دولت شاہ نے یہ مصرعہ ناصر بخاری سے منسوب کیا ہے۔

سلمان پھڑک گیا اور پوچھا کہ "کہاں سے آئے ہو؟" جواب دیا "قزوین سے" پوچھا "تمہارے اشعار بھی وہاں مشہور ہیں یا نہیں" کہا "ہاں! یہ اشعار مشہور ہیں:-

من خراباتیم و بادہ پرست　　　در خرابات مغاں عاشق و مست
می کشندم چو سبو دوش بدوش　　　می برندم چوں قدح دست بدست

میرے نزدیک بھی سلمان ایک کامل شاعر ہے مگر یہ اشعار اُس کی بیوی کے معلوم ہوتے ہیں" سلمان جھینپا اور سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو عبید یہی ہے اور اپنی ہجو کی بہت معذرت کی۔ اب یہ بغداد میں رہنے لگا اور سلمان اس کی خاطر کرنے لگا۔ عبید کہا کرتا تھا کہ "سلمان تم بڑے خوش قسمت ہو کہ میری زبان کے زہر سے ہلاک نہ ہوئے"۔

عبید کے تصانیف میں **عشاق نامہ** بھی قابل ذکر ہے۔ اسکے علاوہ قصائد و قطعات ہیں جو سنجیدگی کے عالم میں نظم ہوگئے اور ہزلیات سے کوسوں دور رہے مثلاً:-

افتادہ باز در سر ہوائے　　　دل باز دارد میلے بجائے
او شہریارے من خاکسارے　　　او بادشاہے من بینوائے
بالا بلندے گیسو کمندے　　　سلطان حسنے فرماں روائے
ابرو کمانے نازک میانے　　　نامہربانے شنگے و غائے
دارد شکایت ہر کس ز دشمن　　　ما را شکایت از آشنائے

دیکھو کتنی شیریں زبان ہے اور کیسی دلکش طرز ادا۔ افسوس! متاخرین نے اس رنگ کی قدر نہ کی۔ ایک مثنوی اسکی اور دلچسپ ہے جسے فارسی کا چوہے نامہ کہنا چاہیئے۔ اس کا نام موش و گربہ ہے۔ بلی کی تعریف ہے:-

از قضائے فلک یکے گربہ　　　بود چوں اژدہا بکرمانا

گربۂ دوربین و شیر شکار　　کہربا چشم و تیز مژگانا
پائے کژدم عقاب پیشانی　　بود پر مکر و پر ز دستانا
شکمش طبل و سینہ اش قاقم　　ابرویش قوس و تیز دندانا

یہ بلّی گوشت کی تلاش میں میخانے پہونچی اور ایک خُم کے پیچھے چھپ کے بیٹھ رہی - ایک چوہا ڈینگیں مارتا ہوا نکلا کہ میں رستم وقت ہوں - بلّیوں کا مجھسے دم نکلتا ہے :-

سر صد گربہ را ببخشم من　　گر شود روبرو بہ میدانا

× × × × × × × ×

ناگہاں جست گربہ و موش را بگرفت　　گفت موشک کجا بری جانا
موش گفتا کہ من غلام توام　　عفو کن بر من این گنا ہانا

غرض بلّے نے اسے چٹ کیا - پھر اپنے گناہ پر نادم ہو کے ایک مسجد میں گئی اور توبہ و استغفار کرنے لگی - چوہوں کو خبر ہوئی تو بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے :-

مژدگانے کہ گربہ عابد شد　　زاہد و مومن و مسلمانا[1]

پھر سات چوہوں کا وفد مع تحف و ہدایا کے روانہ کیا مگر بلّی انھیں پکڑ کے کھا گئی - آخر تین لاکھ تیس ہزار چوہوں کی فوج نے اس پر حملہ کیا اور قید کر کے اپنے بادشاہ کے پاس لے گئے - حکم ہوا کہ اسے سولی دیجائے - یہ قید توڑ کے بھاگ گئی اور چوہوں کے بادشاہ اور رعایا سب کو قتل کر ڈالا :-

ہست این قصۂ عجیب و غریب　　یادگارِ عبید زاکانا

بسحق اطعمہ — ابواسحٰق فخر الدین احمد حلاج شیرازی کو بُسحٰق اطعمہ بھی کہتے ہیں - اسکندر بن عمر شیخ مرزا والی فارس و اصفہان اس کا مربّی تھا - فن شعر میں اسکا

---

[1] یہ شعر ضرب المثل ہو گیا ہے -

رنگ خاص تھا ہر نظم میں کھانے کا ذکر ہوتا تھا استعارہ ۔ تشبیہ ۔ صنائع ۔ غرض ہر قسم
کی تخییل اسی ذکر میں ہوتی تھی مثلاً اسکے پیر شاہ نعمت اللہ نے یہ رباعی کہی :۔

گوہر بحر بیکران مائیم   گاہ موجیم و گاہ دریائیم
ما بدیں آمدیم در دنیا   کہ خدا را بخلق بنمائیم

اس نے فوراً یوں اُلٹ دی :۔

رشتۂ لاک معرفت مائیم   گہ خمیریم و گاہ بغرائیم
ما ازاں آمدیم در مطبخ   کہ بہا ہیچہ قلیہ بنمائیم

نعمت اللہ سے جو ملاقات ہوئی تو کہا کہ "میں نے خدا کا ذکر کیا تھا تو نے یہ
کیا کیا"؟ جواب دیا کہ "اللہ تک تو رسائی نہ تھی میں نے نعمت اللہ (خدا کی
نعمت) کا ذکر کیا"۔ اپنی شاعری پر فخر کرتا ہے :۔

خوانے کشیدہ ام ز سخن قاف تا بقاف   ہم کاسۂ کجاست کہ آید برابرم

کلیات کا نام دیوان اطعمہ نام ہے ۔ غزل ۔ قصیدہ ۔ قطعہ ۔ رباعی سب
کہا ہے اور اسی رنگ میں کہا ہے ۔

محمود قاری   نظام الدین محمود قاری یزدی نے دیوان ۸۱۴ھ جمع کیا ۔ یہ لباس ول
کا ذکر کرتا ہے ۔ کبھی کبھی مقامی محاورات میں اشعار بھی کہے ہیں اور یہی اسکے
ٹھلویات و شیرازیات ہیں ۔

شاہ نعمت اللہ   شاہ نعمت اللہ کرمانی کا کلام تصوف میں یادگار ہے ۔ انکے والد
کا نام میر عبداللہ ہے اور نسب امام محمد باقر علیہ السلام تک پہونچتا ہے ۔
سنہ ۷۳۰ھ میں بمقام حلب آپکی ولادت ہوئی ۔ ۲۴ برس کے تھے کہ حج بیت اللہ
کیا اور مکہ معظمہ میں سات برس مقیم رہے ۔ پھر سمرقند ۔ ہرات اور یزد میں زندگی
کے دن کاٹے ۔ آخر عمر میں کرمانشاہ واپس آئے اور وہیں ۸۳۴ھ میں

انتقال کیا۔ مقبرہ آپکا ماہان کرمانشاہ میں آجتک موجود ہے اور لوگ زیارت کرنے جاتے ہیں۔ اکثر قصائد آپکے نام پر منسوب ہیں جنمیں اخبار آیندہ کی پیشینگوئی کی بذریعہ کشف کے ہے چنانچہ ایک قصیدے میں کہتے ہیں:—

از نجوم ایں سخن نمی گویم — بلکہ از کردگار می گویم

غزلیں اکثر وحدت الوجود کے رنگ میں ہیں یا حقائق تصوف کی تشریح میں مثلاً:—

بادشاہ و گدا یکیست یکیست — بے نوا و نوا یکیست یکیست

دردمندیم و درد مینوشیم — درد و درد و دوا یکیست یکیست

آئینہ صد ہزار می بینم — روی آں جانفزا یکیست یکیست

مبتلاے بلاے بالائیم — مبتلا و بلا یکیست یکیست الخ

قاسم الانوار

قاسم الانوار کا نام سادات صوفیہ میں مشہور رہے مسقط الراس تبریز کے مضافات میں سراب میں ہے اور سال ولادت ۷۵۷ھ۔ انکے مرشدوں میں خاندان صفویہ کے مورث اعلیٰ شیخ صدرالدین اردبیلی کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ گیلان و خراسان میں بقصد توطن بود و باش اختیار کی تھی مگر رہ نہ سکے اور ہرات میں جا کے قیام کیا۔ یہاں پیری مریدی کا سلسلہ شروع ہوا۔ احمد لر نے جب ۸۳۰ھ میں شاہرخ کو چھری ماری تھی تو مرزا بائسنقر کو ان پر بھی اس جرم میں سازش کا اشتباہ ہوا۔ آخر ہرات چھوڑ کے سمرقند چلے گئے اور الغ بیگ نے انھیں پناہ دی۔ آخر عمر میں خراسان واپس آئے اور ۸۳۷ھ میں انتقال کیا۔ انیس العارفین اور انیس العاشقین کے علاوہ ایک کلیات نظم چھوڑا ہے جس میں حقائق تصوف سے بحث کی ہے اور تلمیحات صوفیہ بھی ایسے ہیں کہ عوام سمجھ نہیں سکتے۔ رنگ طبیعت کا اندازہ

اس غزل کے بعض اشعار سے ہو جائیگا :-

سنہ ایام گفت و سبع سماوات　　ثم علی العرش استوا ست نہایات
حضرت حق را عروش نا متناہی است　　فاش بگویم عروش جملۂ ذرّات
بر سر ہر ذرّہ مستوی است باسمے　　چوں بشناسی رسی بہ نیل مرادات
نعرۂ مستی مزن کہ مست ہوائی　　غایت عمیا بود بجہل مباہات

بعض نقادوں کا خیال ہے کہ یہ غزل فرقۂ حروفیہ[1] کے رنگ میں کہی ہے اور مولانا جامی نے انھیں اس انتساب میں کسی قدر ماخوذ کیا ہے - والعلم عند اللہ - مثنوی انیس العارفین بھی تصوف میں ہے جسکے بعض اشعار شیخ صفی الدین اردبیل کی تعریف میں ہیں :-

شیخ عالم آفتاب اولیا　　پیشوائے دیں صفی الاصفیا
آنکہ از وے گشت مشہور اردویل (اردبیل)　　وز جمالش گشت پُر نور اردویل

[1] فرقہ حروفیہ کی ابتدا فضل اللہ استرابادی کی ذات سے امیر تیمور کے زمانے میں ۷۸۸ھ میں ہوئی - یہ لوگ حروف تہجی کو مظاہر حالات انسانی سمجھتے تھے اور کہا جاتا ہے کہ حلال و حرام کے منکر تھے - ابتدا میں کوشش رہی کہ یہ مذہب خاندان تیموریہ میں پھیل جائے مگر احمد لُر کی وجہ سے یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا - اسکی جیب سے بوقت قتل ایک کنجی برآمد ہوئی جس سے ایک مکان کھولا گیا' معلوم ہوا کہ وہ حروفیوں کی خفیہ خانقاہ ہے اور اس سوسائٹی کے ممبروں کے نام بھی معلوم ہو گئے جو رفتہ رفتہ قتل کر ڈالے گئے - ۷۹۶ھ میں میرانشاہ نے فضل اللہ کو قتل کرکے لاش کو تشہیر کرایا اس واقعے سے حروفیوں میں جوش پیدا ہوا اور اپنا مذہب پھیلانے نکل پڑے چنانچہ انکا ایک خلیفہ علی الاعلیٰ بلاد روم میں پہونچا اور وہاں بکتاشیوں میں مل کے اپنے اعتقاد پھیلائے جسکے آثار آج تک ملتے ہیں جاویدان کبیر فضل اللہ کی کتاب اور اسکے خلفا کے پانچ جاویدان اس مذہب کے اصل لٹریچر ہیں - انکے علاوہ آدم نامہ - عرش نامہ - ہدایت نامہ - استوا نامہ - کرسی نامہ - محبت نامہ وغیرہ فارسی میں ہیں اور لیض نامہ - گنجنامہ وغیرہ ترکی میں ہیں - انکے جاویدان میں بعض مقامات مبہم ہیں اور رموز میں بیان کئے گئے ہیں جس کا حل انکی ایک کتاب مفتاح الحیات میں ہے - ترکی شعرا میں ان فرقے کے لوگ نامور ہوئے ہیں - ایران میں یہ مذہب نہ پھیل سکا -

اسکے بعد شیخ سعدی سے ملاقات کا ذکر کیا ہے اور بیان کیا ہے کہ حقائق معرفت میں کے شیخ نے صفی الدین کے کمال باطنی کا اعتراف کیا اور کہا :-

داری الحق مملکتِ بے انتہا ۔۔۔ یُرلغش اللہ یہدی مَن یَشاء

ابھی اس عصر کے بہت شعرا باقی ہیں جیسے کاتبی نیشاپوری - عارفی ہروی کمال خجند - مغربی نیشاپوری وغیرہ مگر بخیال اختصار اب ہم تین ممتاز شاعروں کا حال اور لکھتے ہیں جن کی ذاتیں فارسی لٹریچر کے لئے مایہ ناز ہیں یعنے سلمان ساوجی - خواجہ حافظ شیرازی اور ملا جامی -

سلمان

جمال الدین محمد سلمان بن علاء الدین محمد ساوجی اپنے وطن ساوہ (عراق عجم) میں ۷۰۰ھ میں پیدا ہوا اور درسیات پڑھنے کے بعد شعر گوئی کی طرف توجہ کی - ابتدائی شاعری کا نمونہ وہ مرثیہ ہے جو سلطان ابوسعید کے انتقال پر نظم کیا تھا - سال بھر بعد (۲۱ رمضان ۷۳۶ھ) میں دوسرا مرثیہ غیاث الدین محمد کے قتل پر کہا - اسی سال حسن بزرگ ایلخانی نے خاندان جلائر کی سلطنت بغداد میں قائم کی اور سلمان وہاں چلا گیا - حسن بزرگ کی زوجہ دلشاد خاتون جو اپنی قابلیت خداداد کے زور پر سلطنت بغداد کو چلا رہی تھی - سلمان کی قابلیت کی خاص قدردان تھی اور وہ بھی اسکی مداحی نہایت زور و شور سے کرتا تھا - حسن کے بعد سلطان اویس بادشاہ ہوا - یہ شاعر بھی تھا اور سلمان سے اصلاح لیا کرتا تھا - مختصر یہ کہ جلائری خاندان کے عروج کا زمانہ ملجانے کی وجہ سے سلمان ساوجی کا ڈنکا بج گیا اور عزت و دولت دونوں چیزیں اچھی طرح ملیں - آخر عمر میں ملازمت ترک کرکے خانہ نشین ہوگیا اور ۱۲ صفر ۷۷۸ھ کو راہی ملک بقا ہوا - اسکے کلیات میں دو مثنویاں (فراق نامہ اور جمشید و خورشید) اور متعدد قطعات وغزلیات وقصائد وغیرہ ہیں - کلام میں اتنی قوت ہے

کہ خواجہ حافظ فرماتے ہیں:۔

سر آمد فضلائے زمانہ دانی کیست — ز راہ صدق و یقین نی ز راہ کذب و گماں
شہنشہ فضلا بادشاہ ملک سخن — جمال ملت و دیں خواجہ جہاں سلماں

فی الحقیقت خواجہ سلمان کی شاعری کی داغ بیل کمال اسمٰعیل اور ظہیر فاریابی کی طرحوں پر پڑی اور اکثر اُنھیں کے جواب میں قصائد نظم کئے لیکن ذوق سلیم اور مناسبت خداداد نے اِس کا پایہ کافی بلند کر دیا۔ زبان میں شیرینی۔ ترکیبوں میں چُستی۔ دقیق اور نازک مضمون آفرینی سے کلام مالا مال ہے۔ جدت پسند اور شوخ طبیعت معمولی تشبیہوں اور استعاروں میں بھی مزہ بھر دیتی ہے:۔

چشمت بخنجرِ مژہ عالم خراب کرد — کس خنجرِ کشیدہ بمستے چناں دہد؟

مژہ کو خنجر کہنا یا آنکھوں کو مست کہہ دینا ہر شاعر کے لئے ممکن ہے مگر دوسرے مصرع میں جو سوالیہ صورت اختیار کی ہے دیکھو کتنے مزے کی ہے۔ ایک سادہ شعر اسی قصیدے کا سنو:۔

در حسرتِ جمال تو ہر کس کہ عاشق است — جانے بیک نظر دہد و بس گراں دہد

تخلص کا مقام قصیدے میں قوت شاعری کی امتحان گاہ ہے۔ سلمان کی شوخ طبیعت عجیب نزاکتیں پیدا کر دیتی ہے۔ معشوق کے دہن کی تعریف میں مبالغہ کیا جاتا ہے کہ معدوم ہے اور فتنے پرداز بھی۔ ان دونوں مبالغوں کو یکجا کر کے مدح کی طرف گریز کرتا ہے:۔

نیست پیدا دہنت بر رخ و در دولت شاہ — فتنۂ آں بہ ہمہ وجہ کہ پنہاں باشد

مشکل ردیفیں اور قافیے اس کی زور طبیعت کے سامنے پانی ہیں:۔

منم امروز بلائے شب ہجراں بر سر — کردہ در کار تو چوں شمع دل و جاں بر سر
سرو برپائے تو می سیرد و مرغانِ چمن — میکنندش ہمہ شب نالہ و افغاں بر سر

گریز دیکھو:-

آفتاب تو اگر سایہ زمن باز گرفت باد پائندہ ہمراسایہ سلطان بر سر

فخریہ شعر بھی خوب کہا ہے اور ردیف کو بالکل آسان کر دیا ہے:-

شعرم از تربیت لطف تو بر جائے رسید کہ نہندش ہمہ اشراف خراساں بر سر

حسن بزرگ جب بھاگ کے بغداد پہونچا تو سلمان کا قصیدہ تسکین قلب کے لئے موجود تھا۔ مطلع سنو بے حد رنگین کہا ہے:-

وقت صحبت ولب دجلۂ وانفاس بہار اے پسر کشتئ مے تا شط بغداد بیار

شاہ شجاع کی فتح پر جو تہنیت میں قصیدہ کہا اُس نے خود بادشاہ کے قلب کو مسخر کر لیا۔ مطلع یہ ہے:-

سخن بوصف رخش چوں ز خاطرم سر زد ز مطلع سخنم آفتاب سر بر زد

توریہ اور ایہام کا بے حد شوق ہے۔ "سر بر زد" ٹکرایا یا نکل آیا دونوں معنوں پر لیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح کہا ہے:-

باد سحر گہی ہوائے تو جاں دہد آب حیات را لب لعلت رواں دہد

اس میں بھی "جاں دہد" کے دو معنے ہیں۔ جان عطا کرنا اور دم دینا اور دونوں معنے لئے جاسکتے ہیں۔ مذاق سلیم اس بد مذاقی کو بھی سنبھالے ہے اور جہاں نہیں سنبھلی وہاں جگت بازی رہ گئی ہے:-

چشم سرمست ترا عین بلا می بینم لیکن ابروئے تو چیزیست کہ بالائے بلاست

خدا اس ضلع جگت کے زہر سے ہر لٹریچر کو محفوظ رکھے۔

اس میں شک نہیں کہ قصیدہ گوئی میں سلمان کا جواب ملنا دشوار ہے مگر قطعات میں بھی زور طبیعت کی یہی حالت ہے۔ ہجو کو دیکھو تو وہ بھی خوش فکری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ ایک گھوڑا بادشاہ نے دیا اُس کے بڈھے ہونے کی شکایت کرتا ہے اور

ذوق سلیم دور از کار مبالغوں سے مانع ہے :-

از بندہ مہتر ست لبنی سال راستی ۔ گستاخی است بر زبر مہتران نشست

اپنے سے بڑوں پر سوار ہوتا بے حد معیوب ہے اور یہی وجہ انکار۔

غزلیں کہی ہیں اور خوب کہی ہیں مگر سوز و گداز نہیں۔ چند سادہ شعر لکھے جاتے ہیں جن پر قصیدہ گوئی کا رنگ نہیں چڑھا ہے۔ ان میں کسی قدر تغزل ہے :-

اینکہ در خواب غروری خبرے نیست کہ من ۔ ہر شب از خاک درت بالش و بستر دارم

چشم فتان تو ہر جا کہ بلا انگیزد ۔ ای بسا کس کہ دراں عرصہ بلا ایہام اندازد

مثنویوں میں کوئی خاص بات نہیں جو ذکر کیجائے۔ ایک قادر الکلام قصیدہ گو کی نظمیں ہیں اور بس۔

حافظ — ~~حافظ شیرازی~~۔ خواجہ شمس الدین محمد بن بہاء الدین محمد شیرازی۔ باپ تجارت پیشہ تھے۔ حافظ اور اُنکے دو بھائیوں کو چھوٹا چھوڑ کے انتقال کر گئے۔ بدسلیقگی کی وجہ سے بھائیوں نے دولت اُڑا دی اور وطن آوارہ ہو گئے۔ حافظ شیراز میں رہے اور ماں نے پرورش کی۔ گھر میں فاقے ہونے لگے تو خمیر گری اختیار کی۔ اسی افلاس کے عالم میں پڑھنے کا شوق ہوا اور قرآن مجید حفظ کر کے کچھ درسیات بھی ختم کر لئے۔ محلے میں ایک بزاز رہتا تھا۔ وہاں شاعری کا چرچا تھا۔ حافظ کو یہ صحبت پسند آئی اور خود بھی نظم کرنے لگے مگر بے تکے اشعار جن کی وجہ سے خوب بنائے جاتے تھے۔ ایک دن اتنا بنائے گئے کہ دل ٹوٹ گیا۔ بابا کوہی کے مزار پر رات بھر رو یا کئے کہ یا تو شعر کہنا آجائے یا موت آجائے۔ آخر آنکھ لگ گئی۔ خواب میں امیر المومنین

---

[1] شعر العجم جلد دوم میں نہایت عمدہ تحقیقی حال اور تنقیدی تذکرہ دیا ہوا ہے۔ یہاں جو کچھ لکھا جاتا ہے بیشتر اُسی کا اقتباس ہے۔

علیہ السلام کی زیارت ہوئی جنھوں نے بشارت دی کہ مایوس نہ ہو۔ تجھ پر علوم کے دروازے کھل گئے۔ صبح اٹھے تو یہ غزل کہی :-

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند واندراں ظلمت شب آب حیاتم دادند

مجمع میں جب یہ غزل پڑھی تو لوگوں کو حیرت ہوئی اور سمجھے کہ کسی سے کہلوا لائے ہیں مگر امتحاناً جو طرح دی گئی اسی میں عمدہ شعر کہہ دیئے۔ انہوں ان کے کمال کا شہرہ ہو گیا اور سلاطین وقت کا تقرب نصیب ہوا۔ شاہ ابواسحق انجو جس کا ذکر تربیت شعرا و اہل کمال میں بار بار آیا ہے ان کا خاص قدردان تھا اور حافظ صاحب بھی اس کا نام اپنے کلام میں بڑی محبت سے لیتے ہیں۔ جب مبارز الدین محمد بن مظفر کے ہاتھوں اس کا خاتمہ ہوا تو بے حد قلق ہوا۔ فرماتے ہیں :-

راستی خاتم فیروزۂ بواسحاقی خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود
(جلد جلنے والی)

مبارز الدین کی عہد حکومت میں عیش و عشرت کا خاتمہ ہو گیا۔ شراب خانے بند کر دیئے گئے محتسب مقرر ہوئے۔ لہو و لعب یکقلم موقوف۔ یہ حال بھی نظم کیا ہے :-

اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گلریز است ببانگ چنگ مخور مے کہ محتسب تیز است
در آستین مرقع پیالہ پنہاں کن کہ ہمچو چشم صراحی زمانہ خونریز است

امیر مبارز الدین کے بعد شاہ شجاع وارث تخت ہوا۔ یہ عیش پسند تھا۔ پھر شراب خانے کھل گئے اور دور چلنے لگے۔ اس کا حوالہ بھی دیوان میں موجود ہے :-

سحر ز ہاتف غیبم رسید مژدہ بگوش کہ دور شاہ شجاع است مے دلیر بنوش

خیال تھا کہ اس کے زمانے میں خوب کٹے گی مگر سوء اتفاق سے عماد فقیہ دربار میں بارسوخ تھے اور بادشاہ ان کا معتقد تھا مگر حافظ انھیں ریاکار سمجھتے تھے۔ فقیہ صاحب نے ایک بلی کو سدھایا تھا۔ جب وہ نماز پڑھتے تھے یہ بھی ساتھ ساتھ رکوع و سجود بجا لاتی تھی۔ حافظ نے اسی زمانے میں ایک غزل کہی جس کا ایک شعر

چھپتا ہوا تھا:-

ای کبک خوش خرام کہ خوش میروی بناز — غرّہ مشو کہ گربۂ عابد نماز کرد

صفت و موصوف کی صورت میں محض عبید زاکانی کے گربہ و موش کا حوالہ ہے جہاں اُس نے کہا ہے:-

مژدگانے کہ گربہ عابد شد — زاہد و مومن و مسلمانا

مگر مضاف و مضاف الیہ کی حیثیت سے فقیہ صاحب پر لگتی ہوئی کہی۔ شاہ شجاع ناراض ہوگیا اور ہمیشہ اسی تاک میں رہا کہ خواجہ کو کسی طرح شکنجے میں لائے مگر اُسکا (۷۸۶ھ میں) انتقال ہوگیا اور منصور بادشاہ ہوا۔ خواجہ صاحب نے مبارکباد دی:-

بیا کہ رایت منصور بادشاہ رسید — نوید فتح و ظفر تا بمہر و ماہ رسید

جب منصور تیمور کے ہاتھوں مارا گیا تو بغداد سے سلطان احمد بن اویس نے بلا بھیجا اور جانے کو جی بھی چاہتا تھا مگر وطن کی خاکِ دامنگیر نے نہ چھوڑا۔ غزل کہہ کے بھیجدی جس کا مطلع یہ ہے:-

احمد اللہ علی معدلۃ السلطان — احمدِ شیخ اویس حسنِ ایلخانی

از گل فارسی ام غنچۂ عیشے نشگفت — حبذا دجلۂ بغداد و مئے ریحانی

پھر دکن سے محمود شاہ بہمنی نے طلب کیا اور زادِ راہ بھی بھیجا۔ خواجہ صاحب نے بھی تہیۂ سفر کیا مگر راہ میں لٹ گئے۔ آخر دو تاجروں نے انکی کفالت کی اور ساحل تک لاکے جہاز میں بٹھا دیا۔ اتفاقاً جہاز چلنے نہ پایا تھا کہ طوفان آگیا۔ خواجہ صاحب ڈر کے اُتر آئے اور یہ غزل کہہ کے بھیجدی:-

دمے با غم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد — بمی بفروش دلق ما کزیں بہتر نمی ارزد

بس آساں می نمود اوّل غمِ دریا ببوئے سود — غلط کردم کہ یک موجش بصد من زر نمی ارزد

سلطان غیاث الدین حاکم بنگالہ نے بلایا مگر وہاں بھی نہ گئے۔ ایک قصّہ

یہ بھی مشہور ہے کہ اسکی تین کنیزیں تھیں۔ سرو[1]۔ گل[2]۔ لالہ[3]۔ بادشاہ بیمار ہوا تو یہ تینوں خدمت گذاری کرتی رہیں۔ جب غسل صحت کا وقت آیا تو تینوں میں تکرار ہونے لگی کہ کون غسل صحت دے۔ غرض فیصلہ ہوا کہ تینوں اس خدمت کو بھی بجالائیں۔ اس واقعے پر بادشاہ نے یہ مصرعہ کہا:۔

ساقی حدیث سرو وگل و لالہ می رود

اور حافظ کے پاس بھیجدیا کہ اسی پر غزل کہدیں۔ انھوں نے کہا:۔

ساقی حدیث سرو وگل و لالہ می رود — ویں بحث با ثلاثۂ غسالہ[1] می رود

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند[2] — زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

طیّ مکاں ببیں و زماں در سلوک شعر — کایں طفل یکشبہ رہ یکسالہ می رود

حافظ ز شوق مجلس سلطان غیاث دیں — غافل مشو کہ کار تو از نالہ می رود

خواجہ صاحب کی وفات ۷۹۱ھ میں ہوئی۔ خاک مُصلّیٰ تاریخ وفات ہے اور یہی مقام مدفن جو اب حافظیہ[3] کہلاتا ہے اور آخر ماہ رجب میں لوگ زیارت کو جاتے ہیں۔ خود بھی کہہ گئے تھے:۔

بر سر تربت ما چوں گذری ہمت خواہ — کہ زیارت گہ رندان جہاں خواہد بود

شاخ نبات کے ساتھ انکی عشق وازدواج کا قصہ پایۂ ثبوت تک نہیں پہونچا۔ البتہ تاہل کیا تھا اور اولاد بھی تھی چنانچہ انکے ایک صاحب زادے شاہ نعمان ہندوستان میں آکے برہان پور میں مقیم ہوے تھے اور اسیر گڑھ میں انکی قبر ہے (خزانۂ عامرہ)۔

---

[1] ثلاثۂ غسالہ وہ تین گھونٹ شراب کے ہیں جو صبوحی کے طور پر علی الصباح خمار شکنی کے لئے پئے جاتے ہیں۔

[2] ایران میں طوطی نہیں ہوتا۔ یہ ہندوستان کی چڑیا ہے اور شکر خوار سمجھی گئی ہے۔

[3] بابر بادشاہ نے یہ مقبرہ میر محمد معمائی کی تحریک سے بنوادیا تھا۔

علاوہ بریں دیوان میں بعض اولاد کے مرنے پر مرثیے بھی موجود ہیں حافظ کی علمی حالت
بھی نہایت عمدہ معلوم ہوتی ہے۔ فارسی غزلوں میں بے تکلف عربی مصرع نظم کئے
ہیں اور معقول و منقول جاننے کا ادّعا بھی کیا ہے:۔

ز حافظان جہاں کس چو بندہ جمع نکرد ۔۔۔ لطائف حکما با کتاب قرآنی

یہ بھی غلط ہے کہ امراء و روساء کے درباروں سے علیحدہ تھے۔ دیوان سے معلوم ہوتا ہے
کہ سلاطین وقت کی مدح سرائی کی ہے اور انعامات بھی حاصل کئے ہیں۔ ہاں گداگری
نہیں کرتے تھے۔ اگر کچھ مل گیا تو شکر ورنہ صبر:۔

شاہ ہرمز ندیدہ و بے سخن صد لطف کرد ۔۔۔ شاہ یزد دیدم و مدحش گفتم و ہیچم نداد
کار شاہاں اینچنیں باشد تو اے حافظ مرنج ۔۔۔ داور روزی رساں توفیق و نصرت شاں دہاد

انکی شاعری کے متعلق یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جب فن شعر کی طرف انھیں توجہ
ہوئی تھی تو اُس زمانے میں سعدی۔ خواجو اور سلمان کے کلام کا چرچا تھا۔ پہلے خواجو کا
کلام پیش نظر رکھا اور شعر کہنا شروع کیا:۔

اُستادِ غزل سعدی است پیش ہمہ کس امّا ۔۔۔ دارد غزل حافظ طرزِ سخنِ خواجو

خسرو اور سعدی کا سوز و گداز دنیائے شعر کو تسخیر کر چکا تھا مگر خواجو اور سلمان نے
جدید ترکیبیں اور شوخ استعارات و تشبیہات کی قوت سے غزل میں بھی نام
پیدا کر لیا۔ پھر زمانہ بھی موافق تھا۔ خواجو شیراز کا ملک الشعراء تھا اور سلمان بغداد
کا۔ غریب خمیرگر کا کہیں ٹھکانا نہ تھا۔ انھیں اُستادوں کے کلام سنے اور کچھ اخذ کیا
مثلاً خواجو کے کلام میں بے ثباتی دنیا کا ذکر ہے یا رندی و مستی کا جوش اور
سلمان کے یہاں بدیع الاسلوبی ہے اور ضلع جگت بھی حافظ کے کلام
کی داغ بیل انھیں پر پڑی ہے اور رفتہ رفتہ طبیعت خداداد نے وہ عمارت
بنا دی ہے جہاں غزل کو خود معراج نصیب ہوتی ہے۔ خواجو کہتے ہیں:۔

خرقہ رہن خانۂ خمار دارد پیر ما   ای ہمہ رنداں مرید پیر ساغر گیر ما

حافظ نے جواب کہا ہے :-

دوش از مسجد سوے میخانہ آمد پیر ما   چیست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما

اہل ذوق جانتے ہیں کہ دونوں مطلعوں میں کتنا فرق ہے ؟ - دوسرا شعر خواجہ کا ہے :-

گر شدیم از بادہ بدنام جہاں تدبیر چیست   ہمچنیں رفتست از روز ازل تقدیر ما

حافظ کہتے ہیں :-

در خرابات مغاں ما نیز ہمدستاں شدیم   کاینچنیں رفتست از روز ازل تقدیر ما

دیکھو یہاں حافظ کتنا پست ہو گئے - نہ خواجو کی طرح تدبیر و تقدیر کا مقابلہ نہ عنوان ادا بے تکلف - خواجو کہتے ہیں :-

تا دل دیوانہ در زنجیر زلفت بستہ ایم   ای بسا عاقل کہ شد دیوانۂ زنجیر ما

حافظ کا شعر ہے :-

عقل اگر داند کہ دل در بند زلفش چوں خوش است   عاقلاں دیوانہ گردند از پئے زنجیر ما

یہاں بھی حافظ کا شعر پھیکا ہے اور خواجو کا شعر شوخ - دل دیوانہ تھا یا عاقل وہ پھنس گیا اور حسن و عشق کا طلسم کامل ہو گیا - اب جو کیفیت پیدا ہو گئی ہے وہ اہل عقل کو بھی اپنی طرف کھینچ رہی ہے - حافظ نے عاقلوں کے دیوانہ ہونے کی وجہ بالتصریح بیان کر دی - والکنایۃ ابلغ من التصریح - اسی طرح سلمان سے موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دیوان ازل نے کسی کو محروم نہیں رکھا - خواجہ صاحب کہتے ہیں :-

گل رفت ای حریفاں غافل چرا نشینید   بے بانگ رود و چنگے بے یار و جام و بادہ

سلمان کا شعر کہیں اچھا ہے :-

سوداے زہد خشکم بر باد دادہ حاصل　　مطرب بزن ترانہ ساقی بیار بادہ

معلوم ہوتا ہے کہ اسطرح غزلیں بظاہر ابتدائی مشق کی ہیں ورنہ جب سے خداداد مقبولیت کا دَور شروع ہوا رنگ ہی کچھ اور ہو گیا بلکہ جو خصوصیات انکی غزلوں میں پیدا ہو گئے اُن کا اجتماع کسی ذات میں بھی آجتک ممکن نہ ہوا۔ مثلاً **شیرینی کلام** اور **فصاحت خداداد** میں **روزمرہ** اور **محاورات** کی چاشنی دیکے شعروں کو دلکش بنا دیا ہے اور انکے اشعار میں **جوش** اس قدر ہوتا ہے کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود صاحب معاملہ ہیں اور اپنی بیتی سنا رہے ہیں۔ مثلاً معشوق کی یاد میں ایک وجد کی حالت طاری ہوتی ہے اور کہتے ہیں :۔

در نمازم خم ابروے تو ام یاد آمد　　حالتے رفت کہ محراب بفریاد آمد

یا مثلاً نشہ کی ترنگ آئی ہے اور شوق پیدا ہوتا ہے کہ مرتے دم تک یہی حالت رہے۔ کہتے ہیں :۔

زاں پیشتر کہ عالم فانی شود خراب　　مارا بجام بادۂ گلگوں خراب کن

غریبوں کے ستانے کا انجام دکھاتے ہیں :۔

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات　　با دردکشاں ہرکہ درافتاد برافتاد
پھیرا　چوٹ کھا گیا

یوں تو خواجہ صاحب ہر رنگ میں پُرجوش ہیں لیکن شراب و ساقی کے معاملات میں خدا جانے کتنا بلند ہو جاتے ہیں :۔

بیا تا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرح نو در اندازیم

اگر غم لشکر انگیزد کہ خون عاشقاں ریزد
من و ساقی بہم سازیم و بنیادش براندازیم

چو در دست است رودے خوش بزن مطرب سرودے خوش
کہ دست افشاں غزل خوانیم و پاکوباں سر اندازیم

خیام کی کائنات پر بھی خواجہ صاحب کا قبضہ ہے اور بوریائے فقیر کو مسند جمشید سمجھتے ہیں بلکہ زمین سے آسمان تک جوشِ مسرّت سے لبریز نظر آتا ہے۔ اس سرشاری کا نتیجہ یہ ہے کہ سوز و گداز حافظ کے کلام میں گویا کہ مفقود ہو گیا۔ وہ اپنے رنگ میں مست ہیں :۔

بنوش بادہ کہ ایّام غم نخواہد ماند　　چناں نماند و چنیں نیز ہم نخواہد ماند

شکوہِ تاج سلطانی کہ بیم جاں درو درج است　　کلاہ دلکش است اما بدرد سر نمی ارزد

یہ وہ مقامات ہیں جہاں خواجہ صاحب کی شخصی سلطنت ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ دم مار سکے۔ سلمان کا شعر ہے :۔

رندی و عاشقی و قلاشی　　ہیچ شک نیست کہ در ما ہمہ ہست

حافظ کہتے ہیں :۔

عاشق و رند و نظر بازم میگویم فاش　　تا بدانی کہ بچندیں ہنر آراستہ ام

جدّتِ ادا کا خاصہ ہے کہ پرانی بات نئے انداز سے کہدی جائے۔ خواجہ صاحب کا یہ رنگ خاص ہے اور جب ادھر متوجہ ہوتے ہیں تو مضمون بالکل اپنا کر لیتے ہیں۔ سعدی سا جگر سوختہ کہہ گیا ہے :۔

ای بلبل اگر نالی من با تو ہم آوازم　　تو عشقِ گُلے داری من عشقِ گُل اندامے

حافظ اسی مضمون کو کہتے ہیں :۔

بنال بلبل اگر بامنت سر یاری است　　کہ ما دو عاشق زاریم و کار ما زاری است

یہاں بلبل سے برابری کا شوق نہیں ہے بلکہ اُسے بھی اپنے حلقۂ ماتم میں شریک کرتے ہیں۔ "تو ہائے گُل پکار میں چلاؤں ہائے دل"۔ اور ایک شعر مقابلہ کا سُنو۔ سلمان کہتے ہیں :۔

شاہد آں نیست کہ دارد خطِ سبز و لبِ لعل   شاہد آں است کہ ایں دارد و آنے دارد

حافظ کا شعر ہے:۔

شاہد آں نیست کہ موئے و میانے دارد   بندۂ طلعتِ آں باش کہ آنے دارد

ذوقِ سلیم خود بتائے گا کہ سلمان کے ایں و آں نے شعر کا زور کتنا کم کر دیا اور حافظ کا علم "بندۂ طلعتِ آں باش" کتنا قوی ہے؟ واقعاتِ عشق بیان کرنے پر آجاتے ہیں تو بدیع الاسلوبی اور بھی موثر ہو جاتی ہے۔ خیال یہ ہے کہ جوشِ عشق کو وصل سے بھی سکون نہیں ہوتا۔ وہی سرمستی رہتی ہے اور وہی ولولے۔ البتہ دونوں عالموں میں فرق ہے۔ ہجر میں جلنا مرنا ہے اور وصل میں لذتِ عشق حاصل کرنا۔ دیکھو کس لطف سے تصویر کھینچی ہے:۔

بلبلے برگِ گلے خوش رنگ در منقار داشت   واندریں برگ و نوا خوش نالہ ہائے زار داشت

معشوق عاشق پر ظلم کرتا ہے پھر پشیمان ہوتا ہے۔ تلافی کرنا چاہتا ہے۔ عاشق سمجھتا ہے کہ یہ کیوں عنایت ہو رہی ہے۔ اس معاملہ کو یوں نظم کیا ہے:۔

آفریں بر دلِ نرم تو کہ از بہرِ ثواب   کشتۂ غمزۂ خود را بہ نماز آمدۂ

غور کرو کس مزے کا طعنہ دیا ہے۔ فلسفیت کا رنگ بھی اسی جوشِ بیان اور بدیع الاسلوبی سے چوکھا ہو گیا ہے۔ اسرارِ کائنات کا معلوم نہ ہو سکنا ایک عام مضمون ہے مگر حافظ جب نظم کرتے ہیں تو یا معلوم ہوتا ہے کبھی یہ خیال آتا ہے کہ جو معلوم ہو جاوے وہ راز نہیں اور جو راز ہے وہ معلوم نہیں ہو سکتا۔ شاعرانہ رنگ میں اس مطلب کے ظاہر کرنے کے لئے ایک لفظ "عنقا" تراش کر لیا ہے جس کے معنی ہیں معلوم الاسم معدوم الجسم۔ اگر مل جائے تو عنقا نہیں اگر عنقا ہے تو ملے گا نہیں۔ عقل کے ذریعے اسرارِ کائنات کے علم حاصل کرنے کی کوشش ایسی ہی ہے جیسے عنقا کے شکار کا شوق کیجئے:۔

عنقا شکارِ کس نشود دام باز چیں   کاینجا ہمیشہ باد بدست است دام را

کبھی مہندس کے مذاق میں جاتے ہیں اور کہتے ہیں :-

آنکہ بر نقش زد ایں دائرۂ مینائی
کس ندانست کہ در گردشِ پرکار چہ کرد

کبھی یہ خیال آتا ہے کہ علم تو نہیں ہو سکتا لیکن ریاضت مرتبۂ شہود تک پہونچا دیگی اور اگر فنا فی المعشوق ہو گئے تو فصل ہی مٹا۔ تلاش کسکی ؟

منصور حلاج بر سر دار ایں نکتہ خوش سراید
از شافعی مپرسید امثالِ ایں مسائل

خواجہ صاحب کا کلام کیفیاتِ عشق سے لبریز ہے اور ہوا و ہوس سے اکثر دُور۔ یہی وجہ ہے کہ بازاری طبائع سے لیکے ارباب حال تک کو ان کے کلام سے لذّت ملتی ہے۔ اہل مجاز کو جو کیفیت ہجر میں پیدا ہوتی ہے اہل حقیقت کو اُس سے زیادہ کوفت فیضانِ غیب کے رُک جانے سے ہو جاتی ہے معشوق کی مختلف ادائیں عاشق کے لئے عجب لذّتیں پیدا کرتی ہیں۔ شاہد حقیقی کا متوالا اُس سے زیادہ لذت تجلّیات کے تنوع اور کثرت میں پاتا ہے۔ عارف کو مصائب و آلام دنیوی میں وہی مزا ملتا ہے جو شاہدان دُنیا کی بیوفائی اور کج ادائی سے اہل دنیا کو ملتا ہے۔ رنج و مسرت شکوہ و شکر۔ صبر اور بیچینی غرض جتنے واردات عشق ہیں حقیقت و مجاز دونوں میں اپنے اثر دکھلاتے ہیں اخلاق رذیلہ سے انسان کو بچاتے ہیں۔ رضا و تسلیم کا مادّہ پیدا کرتے ہیں۔ جان باری جان نثاری اس کا شیوہ ہوتا ہے۔ رشک و رقابت سے کوسوں دُور۔ چھاگل چوڑی دوپٹہ۔ آنچل ہوس بازوں کے لئے چھوٹ جاتا ہے۔ بلکہ ناک نقشہ۔ ملاحت و صباحت پر عاشقِ صادق کی نظر نہیں رہتی حقیقت ہو یا مجاز۔ خدا جانے وہ کس ادا پر مرتا ہے حافظ کہتے ہیں :-

ہزار نکتہ دریں کار و بار و لداری است
کہ نام آں نہ لب لعل و خط زنگاری است

میخانۂ حقیقت کے سرمست شراب کو کیف عشق سمجھتے ہیں۔ ساقی رہبر طریقت ہے۔ پیر مغاں ہے مرشد کامل۔ جام دل ہے اور وہ بھی صنوبری ٹکڑا گوشت کا نہیں بلکہ

ایک لطیفۂ روحانی ہے جو کبھی کاشف اسرار ہوتا ہے کبھی مہبط انوار۔ نشہ و خمار، مطرب و
نغمہ، شیشہ و صراحی، نقل و گزک، یہ سب مدارج عرفان کے نام ہیں۔ بسط کی حالت میں
فیضان غیب ہوتا ہے۔ لطائف باطنی میں انشراحی حالت آجاتی ہے۔ یہی ان کی
بہار ہے۔ نئے نئے حقائق منکشف ہوتے ہیں۔ عجیب عجیب اسرار ظاہر ہوتے ہیں۔
یہی اس بہار کے پھول ہیں اور غنچے۔ پھر بہار بھی وہ جو آنی و فانی نہیں بلکہ ازلی و ابدی ہے۔
اب ذرا اس رنگ میں ڈوب کے حافظ کے اشعار سنو تو دوسرا عالم نظر آئیگا۔ ساقی
کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:۔

دیدمش خرم و خنداں قدح بادہ بدست — واندراں آئینہ صد گونہ تماشا میکرد
گفتم ایں جام جہاں بیں بتو کے داد حکیم — گفت آں روز کہ ایں گنبد مینا میکرد

تصوف کی رضا و تسلیم کبھی کبھی جبریہ کے عقائد سے ملجاتی ہے مگر حقیقت یہ ہے
کہ یہ کیفیت جبر و اختیار دونوں سے بالاتر ہے:۔

برو و دُرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش — کہ ہرچہ ساقی ما ریخت عین الطاف است

اس عالم میں مقام فنا کا نام خرابات ہے۔ سالک عارف باخبر۔ قلندر وہ عارف
جو مرتبۂ تکلیف سے گذر گیا۔ انسان عالم اکبر ہے اگر کامل ہو جائے تو فرشتوں اور
آسمانوں سے بلند تر ہے۔ معشوق کا جلوہ وحدت شہود کا نام ہے۔ خود مٹ جانا وحدت
وجود کے درجے تک پہونچنا ہے۔ عرفان کامل کو کفر کہتے ہیں (کیونکہ علمائے ظاہر کی
نظر میں عارف کامل کافر ہوتے ہیں)۔ اسلام رو اسم ظاہری کا مجموعہ بلکہ ریاکاری
کا مخزن (یہ عارف کی نظر ہے جو علمائے ظاہر کے نام نہاد اسلام پر پڑ رہی ہے)۔
نتیجہ یہ ہے کہ علما کی برائیاں۔ واعظوں کی پردہ دری سب کچھ
کی جاتی ہے کیونکہ وہاں استدلال کا زور ہے۔ دلیل ہٹی اور دعوی ضعیف ہوا۔
یہاں عین الیقین اور حق الیقین کا مرتبہ ہے جو مٹانے سے نہیں مٹتا:۔

آنہمہ شعبدہ ہا عقل کہ می کرد آنجا   سامری پیش عصا و ید بیضا می کرد

مختصر یہ کہ خواجہ صاحب کا بیشتر کلام حقیقت و مجاز دونوں میں یکساں خوش رنگ ہے اور مذاق سلیم کا تقاضا بھی ہے کہ ہوسناکی اور گندہ دہنی سے عشق کے ایسے احساس لطیف کو پاک رکھے۔ البتہ یہ کہنا درست نہیں کہ حافظ کا ہر شعر روحانیت میں ہے۔ بعض مدارس میں ہنسی آتی ہے جب ایسے شعر مقام معرفت میں کھینچ کے لائے جاتے ہیں جیسے:۔

احمد اللہ علی معدلۃ السلطان   احمد شیخ اویس حسن ایلخانی

اور احمد سے مراد حضور سرورکائنات لئے جاتے ہیں اور اویس سے اویس قرنیؓ اور حسن سے حسن بصری۔ پھر سکوت طاری ہوتا ہے۔ پوچھو کہ ایلخانی کیا؟ کہا جاتا ہے کہ بیحد بلند درجہ معرفت کا۔ سچ کہا ہے کہ "شعر مرا بمدرسہ کہ برد" شاید اسی افراط و تفریط سے متاثر ہو کے محمد بن محمد دارابی نے لطائف غیبیہ لکھی جس میں ثابت کیا ہے کہ حافظ کے (۱) بعض اشعار بے معنی ہیں (اگرچہ یہ بھی زبردستی ہے۔ ہاں! استعارات بعیدہ ضرور ہیں) مثلاً:۔

ماجرا کم کن و باز آ کہ مرا مردم چشم   خرقہ از سر بدر آورد و بشکرانہ بسوخت

اور (۲) بعض محض رندی و ہوسناکی کی تعلیم دیتے ہیں مثلاً:۔

ہزار آفریں بر مئے سرخ باد   کہ از روے ما رنگ زردی برد

اور (۳) بعض اشاعرہ کے رنگ میں ہیں اور جبریت کی تعلیم دیتے ہیں مثلاً:۔

در کوی نیکنامی مارا گذر ندادند   گر تو نمی پسندی تغییر کن قضارا

بہرحال یہ تنقید بھی افراط و تفریط سے خالی نہیں ہے اور مثالیں اکثر ناقص ہیں۔

اب ہم بخوف طول اتنا اور کہتے ہیں کہ

حسد چہ می بری ای سست نظم بر حافظ قبول خاطر و لطف سخن خداداد است

اس کلام کی مقبولیت اتنی ہے کہ لوگ اس سے **فال** لیتے ہیں اور حضرت خواجہ حافظؒ کو لسان الغیب اور ترجمان الاسرار سمجھتے ہیں۔ کسی کام کا قصد ہوا اور دیوان کھولا۔ جس شعر پر نظر پڑی وہی حالت آئندہ کا ترجمان تھا۔ ملّا مگس نے شاہ اسمعیل صفوی کو حافظ سے خلاف کر دیا اور چاہا کہ حافظیہ کو مسمار کرا دے۔ بادشاہ نے دیوان کھولا تو یہ شعر نکلا :۔

جوزا سحر نہاد حمائل برابرم یعنے غلام شاہم و سوگند میخورم

بادشاہ خوش ہوگیا اور ملّا مگس کا کہنا نہ مانا۔ اب کی ملّا نے دیون کھولا تو نکلا :۔

ای مگس حضرت سیمرغ نہ جولانگہ تست عرض خود میبری و زحمت ما میداری

خوش اعتقادوں کا خیال ہے کہ ہمیشہ صحیح فال نکلتی ہے اور روزانہ ہزاروں فالیں دیکھی جاتی ہیں۔ اگر اتفاق بھی مان لیا جائے تو عجیب اتفاق ہے کہ بار بار حسب مراد ظاہر ہوتا ہے :۔

ـــــ خواجہ صاحب نے قصائد اور مثنویاں بھی نہایت عمدہ کہی ہیں مگر

خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست

ملا نور الدین عبد الرحمٰن جامی خراسان کے ایک قریہ جام میں ۲۳ شعبان ۸۱۷ھ کو پیدا ہوئے اور علوم و فنون میں اس حد کا کمال حاصل کیا کہ ہر اہیں صاحب تصنیف ہوگئے اور اپنے اہل عصر میں نہایت معزز اور ممتاز رہے۔ کی ؟ حسین میرزا آخری چراغ تیموری خاندان کا انکا قدر دان تھا۔ سلسلہ تصوف یہاں عبید اللہ الاحرار نقشبندی سے بیعت تھی۔ سلطان روم نے انکے کمالات

کی شہرت سن کے اپنے یہاں بلایا مگر یہ ہرات سے نہ گئے یہانتک کہ ۱۸ محرم ۸۹۸ھ کو انتقال ہوگیا۔ نظم میں خمسہ نظامی کے طور پر سات مثنویاں نظم کیں جو ہفت اورنگ کہلاتی ہیں۔

(۱) **سلسلۃ الذہب** میں سات ہزار دو سو شعر ہیں اور سلطان حسین کو نذر کی گئی ہے۔ زبان صاف اور سلیس ہے۔ پہلے حصہ میں اعتقادیات ہیں۔ دوسرے میں عشق حقیقی و مجازی کی بحث ہے اور تیسرے میں سلطان و حکما وغیرہ کے قصص و روایات ہیں۔

(۲) **سلامان و ابسال** میں ایک تخئیلی قصہ نظم ہے۔ بحر مولانا روم کی مثنوی کی ہے جس کے مقابل کسی طرح نہیں آسکتی۔ تخئیلی شاعری محاکات پر غالب آجاتی ہے لیکن جہاں تصویر کھینچ گئی ہے خوب ہے اور جدت ادا میں ڈوبی ہوئی مثلاً ایک باغ و نہر کا منظر دکھایا ہے:—

نو درختاں شاخ در شاخ اندرو ۔۔۔ در نوا مرغان گستاخ اندرو
میوہ در پاے درختاں ریختہ ۔۔۔ خشک و تر با یکدگر آمیختہ
چشمۂ آبے بزیر ہر درخت ۔۔۔ آفتاب و سایہ گردش لخت لخت الخ

(۳) **تحفۃ الاحرار** وعظیہ اور اخلاقیہ نظم ہے معلوم ہوتا ہے کہ مخزن الاسرار نظامی کے جواب میں کہی گئی ہے۔

(۴) **سبحۃ الابرار** میں حقائق تصوف بیان کئے گئے ہیں اور اخلاقی تعلیم دی گئی ہے۔

(۵) **لیلیٰ و مجنوں** میں وہی مشہور عرب کا افسانہ ہے جو ان دونوں ناموں سے وابستہ ہے۔ انداز بیان ذیل کے اشعار سے معلوم ہوگا:—

چوں صبح ازل ز عشق دم زد ۔۔۔ عشق آتش شوق در قلم زد
از لوح عدم قلم سر افراشت ۔۔۔ صد نقش بدیع پیکر انگاشت
ہستند افلاک زادۂ عشق ۔۔۔ ارکان بزمیں فتادۂ عشق
بے عشق نشاں ز نیک و بد نیست ۔۔۔ چیزیکہ ز عشق نیست خود نیست

(۶) خرد نامۂ سکندری) بوستان کے رنگ و بحر میں ہے۔ کہیں کہیں سکندر نامے کا تتبع بھی کیا ہے مگر دونوں سے بہت پست ہے۔ ایک ساقی نامہ اس کا بھی نقل کیا جاتا ہے تاکہ اندازۂ طبیعت ہو جائے:—

بیا ساقیا ساغر مے بیار	فلک وار دور پیاپے بیار
از اں مے کہ آرائش دل دہد	خلاصی ز آلائش گل دہد
بیا مطربا عود بنہادہ گوش	بیک گوشمال آور اندر خروش
خروشی کہ دل را بہوش آورد	ندا نا پیام سروش آورد

(۷) یوسف زلیخا بیشک ان کی مثنویوں میں بے نظیر ہے اور مقامات بزم جس لطف سے بیان کئے ہیں اس کا مثل فارسی لٹریچر میں مشکل سے ملے گا۔ تاریخی اعتبار سے واقعہ بہت سے قصص و روایات کا مجموعہ ہو گیا ہے لیکن شاعری کی قوت اور حسن ادا کی دلکشی ہر کمزوری پر غالب ہے۔ بعض مقامات پر مقتضیات فطرت اس شان سے نظم ہو گئے کہ ضرب المثل ہو گئے ہیں مثلاً:—

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد	بسا کیں دولت از گفتار خیزد

اکثر ابواب کی ابتدا براعت استہلال سے کی ہے جو نہایت موثر ہوتی ہے اور افتتاح کلام میں شان پیدا کر دیتی ہے مثلاً جناب یوسف صدیق علیہ السلام کا خواب میں شمس و قمر کو آپ کو سجدہ کرتے دیکھنے کا حال جہاں لکھا ہے اس کی ابتدا یوں کی ہے:—

خوش آں کز بند صورت باز رستہ	ز سحر چشم بند[1] آں چشم بستہ
دلش بیدار و چشمش در شکر خواب	ندیدہ کس چنیں بیدار در خواب
بپوشیدہ ز نا پائندہ دیدہ	ولے بکشودہ با پائندہ دیدہ الخ

---

[1] دنیا کا وجود اہل معنی کی نظر میں وہمی خیالی ہے جیسے کسی نے نظر بندی کر دی ہے۔

کبھی کبھی ایسے مواقع پر اخلاقی سبق بھی نہایت عمدہ دیتے ہیں مثلاً اسی واقعہ کے بعد برادران یوسف کے حسد اور مشاورت کا حال یوں شروع کیا ہے :-

چو آید مشکلے پیش خردمند — وزاں مشکل فتد در کارِ او بند

کند عقل دگر با عقل خود یار — کہ تا در حلِّ آں گردد مددگار

زیک شمعش نگیرد نورِ خانہ — فروزد شمع دیگر در میانہ

ولے ہست ایں سخن در راست بیناں — بصد بر راستی بالا نشیناں

نہ در کجرو حریفان بد اندیش — کہ گردد از دو کجرو کجروی بیش الخ

ایک مقام پر عشق مجازی و حقیقی کا فرق دکھایا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ مجاز بھی حقیقت پر تو حقیقت ہے۔ اسی طرح اور مسائل بھی عمدہ طور سے حل کئے ہیں اگرچہ مخالفوں نے یہ بھی کہا ہے کہ جامی نے نظامی اور خسرو کے خزانوں کو بیدردی سے لوٹ لیا ہے[1] اور ممکن ہے کہ بعض توارد خلاف امید بھی ہو گئے ہوں مگر یہ تنقید خود بیدردی سے خالی نہیں ہے۔ افسوس یہ مقام طول چاہتا ہے مگر کتاب کو مختصر کرنا ہے لہذا قلم روکا جاتا ہے۔ مثنویوں کے علاوہ دیوان غزلیات وغیرہ بھی ہے جسکے تین حصے ہیں ابتدائی کلام کا نام فاتحۃ الشباب ہے۔ وسط عمر کا واسطۃ العقد اور آخر عمر کا خاتمۃ الحیات۔ انکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا جامی کا قلم بیجا خوشامدوں میں آلودہ نہیں ہے۔ ہر صنف میں یا حقانیت و عرفان ہے یا واردات عشق و نصائح بعض غزلیں حافظ کے جواب میں کہی ہیں جو بیحد پست ہیں لیکن بیشتر غزلیں کیف سے لبریز نظر آتی ہیں مثلاً :-

طرف باغ لب جو لبِ جام است اینجا

ساقیا خیز کہ پرہیز حرام است اینجا

---

[1] انکی ہجو کے اشعار صفحہ (۱۵۲) میں دیکھو۔

شیخ در صومعہ گر مست شد از ذوقِ سماع
من و میخانہ کہ ایں حال مدام است اینجا
لب نہادی بلبِ جام و ندانم منِ مست
کہ لبِ لعلِ تو یا بادہ کدام است اینجا
میکشی تیغ کہ سازی دلِ ما را بدو نیم
تیغ بگذار کہ یک غمزہ تمام است اینجا (کافی)

وحدت الوجود کے رنگ میں بھی غزلیں کہی ہیں اور شوخیِ ادا سے مزہ بھر دیا ہے:۔

خوباں ہزار و از ہمہ مقصودِ من یکیست | صد پارہ گر کنند بہ تیغم سخن یکیست
آنجا کہ لعلِ دلکشِ شیریں دہد فروغ | یاقوت و سنگ در نظرِ کوہکن یکیست

بعض اشعار سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شعرائے عرب کے کلام کا ترجمہ کر دیا ہے مثلاً عمر بن الفارض کا شعر ہے:۔

شربنا علی ذکر الحبیب مدامۃ | سکرنا بہا من قبل ان یخلق الکرم

جامی کہتے ہیں:۔

بودم آں روز من از طائفۂ دُرد کشاں | کہ نہ از تاک نشاں بود و نہ از تاک نشان (انگور بونے والا)

میرے ایک قابل دوست نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ میرے نزدیک جامی کی غزلیں حافظ سے بھی اچھی ہیں مگر افسوس کہ مجھے اس وقت تک اس رائے سے متفق ہونے کا موقع نہ ملا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ جامی اس دور کے خاتم الشعرا ہیں۔

خاتمہ

اب شعرائے تیموریہ کا حال ختم کیا جاتا ہے۔ ناظرین نے ملاحظہ کر لیا ہو گا کہ نثر و نظم دونوں پر کس قدر انقلاب ہوا۔ نثر میں سادگی کم ہونے لگی اور مقفی و مسجع

تحریریں پسند آنے لگیں جن میں مرادف و مکرر فقرات کی کثرت ہے اور جتنے زیادہ
طریقوں سے ایک ہی مطلب ادا ہوتا ہے اُتنا ہی کلام مقبول ہوتا ہے۔ عربی سے
اقتباسات اور شاعری کے خصوصیات سے نثر کی زینت شروع کر دی گئی ہے۔
نظم میں محاکات کم ہوتی جاتی ہے اور تخییل بڑھتی جاتی ہے۔ بلادِ اسلام تباہ ہو جانے
سے ایرانیوں پر تاتاریوں کا غلبہ ہے۔ عشق کے میدان میں آکے خود مظلوم بنتے ہیں
اور ترک و تاتاری ظالم معشوق بنائے جاتے ہیں۔ اُنھیں کے ظلم سہتے ہیں۔ اُنھیں سے
شکوے اور شکایات ہیں۔ تصوف کا رنگ بھی پورا غالب ہو گیا ہے اور اہلِ ذوق نے
مجاز سے حقیقت کی طرف قدم بڑھا کے بازاری باتوں سے کنارہ کشی کی ہے۔ ہوا و
ہوس کی بنیاد اُکھاڑ ڈالی ہے اور عشقِ خالص کے کیفیات سے لذت اندوزی کی جاتی
ہے۔ مضامینِ جدیدہ پر نظمیں کم ہو گئی ہیں بلکہ ایک ہی خیال یا مسئلہ بار بار مختلف اسلوبوں
میں کہا جاتا ہے۔ اس سے حافظ وغیرہ بھی مستثنیٰ نہیں۔ ضلع جگت بھی شروع ہو گیا
مگر خوش مذاق ہاتھوں میں ہے۔ اس سے فارسی شاعری شاید نہ بگڑنے پائے۔
وعظیات و اخلاقیات کا چرچا ہے۔ رزمیہ نظمیں مفقود ہو گئیں۔ بزمیہ مثنویاں عروج
پر آگئیں۔ البتہ اس عہد کے آخر میں ایک رند بلا نوش فغانی نام شیراز سے قدم باہر
نکالتا ہے اور چاقو پتا ناچھوڑ کے شاعری کے نشتر تیار کرتا ہے مگر کوئی اُسے پوچھتا نہیں۔
وہ تو اپنے رنگ میں بکتا ہے اور اُس نازک خیالی کا سنگِ بنیاد نصب کرتا ہے جس پر
آنے والے شعرا بڑی بڑی عمارتیں بنائیں گے لیکن نہ سلطان حسین کے یہاں قدر ہوتی
ہے نہ ملا جامی کی نظر میں سماتا ہے بلکہ اگر کوئی مہمل شعر سنائی دیتا ہے تو کملائے فن کہہ دیتے
ہیں کہ یہ فغانیہ ہے یعنے فغانی کے رنگ کا۔ آخر یعقوب والی تبریز اس کی حمایت
کر کے بابا کا خطاب دیتا ہے اور بابا فغانی طرزِ جدید کی نازک خیالیاں شعر میں
رکھاتا ہے۔ آخر عمر میں شراب و کباب چھوڑ کے مشہد مقدس میں اعتکاف

فغانی

کرتا ہے اور ۹۲۵ھ میں مرجاتا ہے۔ چند شعر اس کے بھی سن لو:—

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست ۔ بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

انکہ میگوئی چرا جامے بجانے می خری ۔ این سخن با ساقئی ماگو کہ ارزاں کردہ است

تصوف کا رنگ دیکھو:—

مشکل حکایتے است کہ ہر ذرہ عین اوست ۔ اما نمیتواں کہ اشارت باو کنند

مقصود صحبت است زگل ورنہ بوئے گل ۔ انصاف اگر بود ز صبا میتواں شنید (سونگھ سکتے ہیں)

از فریب نقش نتواں خامۂ نقاش دید ۔ ورنہ در این سقف رنگیں ہیچ کس در کار نیست

اپنے معاصرین کے کلام سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ اگر تیموریہ کے عہد آخر میں نہ ہوتا تو عرفی
اور فیضی وغیرہ کے ساتھ اس کا ذکر کیا جاتا اور حقِ تنقید بھی ادا ہوتا۔

ہلالی

اسی طرح اور ایک شاعر ہلالی استرابادی پیدا ہوا۔ یہ چغتائی ترک سادہ گوئی
میں بے نظیر تھا اور مضمون آفرینی بھی سلاست زبان کے حدود میں کرتا تھا۔
امیر علی شیر کے دربار میں گیا اور یہ مطلع پڑھا:—

چناں از پا فگند امروز آں رفتار قامت ہم
کہ فردا بر نخیزم بلکہ فردائے قیامت ہم

امیر خوش ہوا اور تقرب عطا کیا۔ ایک بار عبداللہ ہاتفی نے کہیں کہہ دیا کہ
ہلالی غزل اچھی کہتا ہے۔ مثنوی کہنا ذرا مشکل ہے۔ فوراً شاہ و درویش نظم
کرنی شروع کر دی جس میں اس واقعے پر بھی اشارہ کیا ہے:—

مدعی چوں مذاق شعر نداشت ۔ مثنوی را بہ از غزل پنداشت

آنکہ نظم غزل تواند گفت ۔ مثنوی را چو دُر تواند سفت

غرض مثنوی تمام کر کے بدیع الزمان تیموری کو نذر دی اور انعام لیا۔ علاوہ اسکے دو مثنویاں
اور نظم کی ہیں۔ لیلیٰ مجنوں اور صفات العاشقین۔ جب عبداللہ والیِ خراسان ہوا

توسیف اللہ نے اُس پر تشیع کا الزام لگا کے قتل کرا دیا۔ "سیف اللہ کشت" تاریخ ہے (۱۰۳۳ھ)۔ ایک صاف غزل اس کی سن لو:۔

عجب شکستہ دل و زار و ناتواں شدہ ام — چنانکہ ہجر تو میخواست آنچناں شدہ ام
تو آفتابی و من ذرہ۔ ترک مہر مکن — کہ در ہوائے تو ام۔ گر بہ آسماں شدہ ام
بگفتگوے تو افسانہ گشتہ ام ہمہ جا — بجستجوی تو آوارۂ جہاں شدہ ام
دلم ز شادی عالم گرفتہ است ولے — غمے کہ از تو رسیدست شادماں شدہ ام

ازاں شدست ہلالی دلم شگاف شگاف
کہ ناوک غم واند وہ را نشاں شدہ ام

یہ طریقہ اُس رنگ کی پیش بندی کرتا ہے جسے دَور صفویہ قبول کریگا۔

باب دہم

صفویہ

صفی
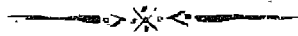
شیخ صفی الدین اردبیلی ایک مشہور خاندان سادات کے سجادہ نشین تھے۔ انکی اولاد میں سلطان حیدر پیدا ہوئے جنکے مرید سرخ رنگ کی ٹوپی بارہ گوشہ کی پہنتے تھے۔ یہ لوگ قزلباش کہلانے لگے یعنی "سرخ سر"۔ ان کے بیٹے

شاہ اسمعیل

شاہ اسمعیل صاحب سطوت ہوئے۔ سلطان حسین مرزا کا زمانہ تھا کہ ۷۰۰ آدمی لیکے آذربائیجان پر چڑھائی کی اور فتح پائی۔ پھر اپنی جماعت کو بڑھا کے شروان پر حملہ کیا اور وہاں بھی ظفریاب ہوئے۔ اسی ہنگامے میں شیبانی خاں نے زور پکڑا اور سلطان حسین کی وفات ہو جانے سے خاندان تیموریہ کو مغلوب کرکے ہرات پر قبضہ کرلیا۔ بدیع الزماں پسر سلطان حسین کو سلطنت عثمانیہ میں پناہ لینی پڑی اور وہیں زندگی کے دن پورے ہوگئے۔ شاہ اسمعیل نے ازبکوں اور ترکمانوں کا خاتمہ کرنا شروع کیا یہانتک ۲۵ سال کی لگاتار کوشش کے بعد حکومت صفویہ کی مستقل بنیاد ڈال دی۔ اس انقلاب کا یہ نتیجہ ہوا کہ سارے ایران کی ایک متحدہ سلطنت اور ایک متحدہ قوم بن گئی جو آجتک باقی ہے۔ لطف یہ ہے کہ تیموریہ کا زوال صفویہ کے عروج کا باعث ہوا مگر فاتحوں کو تیموریوں کے ساتھ ہمیشہ خلوص رہا۔ ظہیر الدین محمد بابر شاہ کو شاہ اسمعیل صفوی برابر مدد دیتے رہے بلکہ اگر یہ کمک وقتاً فوقتاً نہ پہونچتی تو تیموریوں کی عظمت ہندوستان میں قائم نہ ہوسکتی۔ غرض ۹۳۰ھ میں شاہ اسمعیل کا انتقال ہوا اور انکے بیٹے شاہ

[1] ہلالی استرآبادی نے مثنوی شاہ و درویش اسی کو نذر دی تھی دیکھو صفحہ ۲۵۰۔

شاہ طہماسپ

طہماسپ تخت نشین ہوئے۔ انھوں نے بیحد قوت حاصل کر لی اور حدود سلطنت کو بھی اچھی طرح وسیع کر دیا بلکہ ہندوستان بھی فوجیں بھیج کے خاندان سوریہ کا خاتمہ کرا دیا اور ہمایوں کو دوبارہ تخت سلطنت پر بٹھلا دیا۔ انکے بعد انکا بیٹا اسمعیل مرزا ۹۸۴ھ میں بادشاہ ہوا۔ صاحب مجمع الفصحا نے اس دور کے ظلم و ستم کی شکایت لکھی ہے انکے بعد انکے بیٹے شاہ عباس اعظم تخت پر متمکن ہوئے۔ یہ ایسے

شاہ عباس اعظم

صاحب اقبال نکلے کہ علاوہ پورے ایران کو زیر نگیں کر لینے کے آرمینیہ و عراق کو بھی مسخر کر لیا۔ ملک کی آبادی و سرسبزی کے لئے یہ عہد ہر ملک میں یادگار ہے۔ اکثر معاصر بادشاہ اس زمانے میں "اعظم" کا لقب بالاستحقاق پا گئے تھے۔ ایلی زبتھ انگلستان میں اور اکبر ہندوستان میں جو کچھ رعایا کی بہبودی کے لئے کر رہے تھے وہ تمام باتیں تاریخ میں آجتک سنہرے حرفوں سے لکھی ہوئی ہیں۔ شاہ عباس بھی کسی سے کم نہ نکلے۔ معابد و مدارس آباد کئے۔ صنعت و حرفت کو ایسی ترقی دی کہ ایران کے قالین وغیرہ آجتک سلاطین عالم کی بارگاہوں کو زینت دینے کے لئے جاتے ہیں۔ کاروانسرائیں اس شان کی کھولیں کہ مسافروں کی مہمانداری بڑے کروفر کے ساتھ سلطنت کی طرف سے ہوا کرتی تھی۔ مختصر یہ کہ تاریخ ایران میں اس سے زیادہ زرخیز اور خوشحال دور کوئی نہیں ملتا۔ ۴۴ سال کی سلطنت کے بعد شاہ عباس نے ۱۰۳۸ھ میں انتقال کیا اور شاہ صفی بادشاہ ہوئے

شاہ صفی ثانی و شاہ عباس ثانی

پھر شاہ عباس ثانی۔ غرض تقریباً ڈھائی سو برس اس خاندان کی حکومت نہایت اطمینان سے رہی۔ آخری فرماں روا اس سلسلے کا سلطان حسین صفوی ہے جس کا جلوس اُسکے باپ شاہ سلیمان کے بعد ۱۱۰۶ھ میں ہوا تھا۔ اس سلطنت میں بڑے بڑے علمائے شیعہ علمی خدمتیں کر رہے تھے لیکن یہ عہد علمی اعتبار سے جتنا زبردست ہے پولیٹکل حیثیت سے اُتنا ہی پست ہے۔ ایک شخص میرویس نام

سلطان حسین مرزا صفوی

قلعۂ قندھار کا کوتوال تھا۔ اس نے اپنے بیٹے محمود خاں کو ایک لشکر دیکے معین کیا کہ جب بُلاؤں چلے آنا۔ ایک دن گرگین خاں قلعہ دار شکار پر گیا اور میر ویس نے محمود خاں کی فوج بُلاکے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ گرگین خاں جب واپس آیا تو اُسے بھی قتل کر ڈالا۔ یہ واقعہ ۱۱۱۹ھ کا ہے۔ شاہ حسین صفوی نے میر ویس کی سرکوبی کرنی چاہی مگر جسے بھیجا وہی قتل ہوا۔ اور میر ویس مستقل وارث بن گیا۔ اسکے بعد محمود خاں والئی قندھار ہوا۔ اس نے اتنی قوت پیدا کر لی کہ اصفہان پر ۱۱۳۴ھ میں ایک زبردست حملہ کر دیا اور شاہ حسین اور اُنکے اعوان و انصار کو (محرم ۱۱۳۵ھ میں) قتل کر ڈالا۔ شاہ طہماسپ

شاہ طہماسپ آخر

پسر شاہ حسین اس غدر کے عالم میں اصفہان کے باہر نکل گیا اور قزوین میں بادشاہ ہوگیا۔ اس کے ملازموں میں سے ایک شخص نادر قلی نہایت جوانمرد تھا۔ اس نے بڑے بڑے کارنمایاں کرنے شروع کئے اور رفتہ رفتہ خراسان فتح کرکے سلطنت قائم کی اور اپنا نام طہماسپ قلی رکھا۔ اُدھر اشرف شاہ والئی اصفہان (محمود خاں کا بیٹا) بھی قتل ہوا اور شاہ طہماسپ پھر اصفہان میں فرمانروائے ایران کی حیثیت سے تخت نشین ہوگیا۔ طہماسپ قلی نے اپنی قوت روزانہ بڑھانا شروع کی۔ آخر ۱۱۴۴ھ میں شاہ طہماسپ کو مقید کر کے اُس کے پسر چار ماہہ شاہ عباس کو تخت پر بٹھایا اور خود مہمات سلطنت سرانجام دینے لگا۔ چار برس کے بعد یہ پردہ بھی ہٹا دیا اور ۱۱۴۸ھ میں اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا اور نادر شاہ افشار لقب اختیار کیا۔ سکے کے ایک رخ پر تاریخ جلوس الخیر فیما وقع بخط طغرا کندہ کی گئی اور دوسری طرف لکھا گیا:۔

شاہ عباس آخر

نادر شاہ افشار

سکہ بر زر کرد نام سلطنت را در جہاں ۔۔۔ نادر ایران زمین و خسرو گیتی ستاں

مگر کسی دل جلے نے "لاخیر فیما وقع" کو مادہ تاریخ قرار دیا اور نادر نے طغرائی عبارت موقوف کرا دی۔ بعض مورخین کہتے ہیں کہ یہ شعر کندہ کر لیا تھا:۔

نادرم در ملک ایراں تا درم بہر دیار لافتیٰ الاّ علی لاسیف الاذوالفقار

نادر شاہ کے فتوحات وفترات کا ذکر طول محض ہے۔ عراق سے ہندوستان تک
اس کی سطوت کا ڈنکا بجتا تھا اور ہر شخص قہرمانِ نادری سے کانپتا تھا آخر

بیک گردشِ چرخ نیلوفری نہ نادر بجا ماند و نے نادری

امرائے دربار اسکے ظلم و ستم سے عاجز آگئے اور پانچ سردار ایک شب کو اس کے
خوابگاہ میں ورانہ چلے گئے اور (۱۱۶۰ھ میں) قتل کر ڈالا۔ اسکے بعد علی قلی خاں
تختنشین اور عادل شاہ لقب اختیار کیا اور اپنے چھوٹے بھائی ابراہیم عادل شاہ
میرزا کو نصف سلطنت دیکے اصفہان کا بادشاہ بنایا مگر ورانداز وں نے دونوں
بھائیوں میں لڑائی کرا دی ابراہیم شاہ غالب ہوا اور عادل کی آنکھوں میں ابراہیم شاہ
سلائی پھروا دی۔ امرائے خراسان نے سلطان حسین صفوی کے نواسے اور
نادر شاہ کے پوتے شاہرخ میرزا ابن رضا قلی خاں کو ۱۱۶۵ھ میں قلعہ قلات سے
لاکے خراسان کا بادشاہ بنایا۔ اُدھر اعیان دولتِ اصفہان ابراہیم میرزا
سے ناراض ہو گئے۔ شاہرخ کو موقع مل گیا اور ابراہیم کو معزول کرکے خود وہاں کا شاہرخ میرزا
بھی بادشاہ ہو گیا۔ اسکے بعد تاریخ ایران کشت وخون سے بھری ہوئی ہے اور تمام
علمی مشاغل یکقلم موقوف نظر آتے ہیں۔ اطمینانی حالت دوبارہ چند سال کے
بعد ۱۲۰۰ھ میں پیدا ہوئی جب محمد شاہ نے سلطنت قاچاریہ کی بنیاد ڈالی اور
ایران نظم ونسق ترتیبی حالت میں قائم کیا۔

تاریخ ادب کے لئے عہد صفویہ[۱] کو کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ یہ ایک
مذہبی دَور تھا جس میں بیشتر تصانیف فقہ واصول اور علم کلام وغیرہ میں ہوئے۔

---

[۱] سلاطین صفویہ خود بھی شاعر تھے۔ شاہ اسمعیل۔ شاہ طہماسپ اور شاہ عباس
وغیرہ کا کلام مجمع الفصحا میں دیا ہوا ہے۔

اکثر کتابیں تاریخ و تفسیر میں بھی لکھی گئیں مگر فنون لطیفہ خصوصاً فن شعر کی کساد بازاری رہی اور بہترین شعرا ہندوستان چلے گئے جہاں دربار تیموریہ (مغلیہ) میں انکی بڑی وقعت ہوئی۔ بہر کیف چند مصنفین جن کا تعلق دربار صفویہ سے رہا ہے ذکر کئے جاتے ہیں :۔

شفائی

شفائی حکیم شرف الدین حسن نام۔ انکا عروج شاہ اسمٰعیل کے زمانے میں ہوا بلکہ بادشاہ خود ملنے کے لئے انکے گھر پر گیا۔ جناب میر باقر داماد بھی ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ اصفہان ان کا وطن تھا اور وہیں فن طبابت میں مشغول رہتے تھے۔ مثنوی نمکدان حقیقت کو حدیقۂ سنائی کی بحر میں نظم کیا ہے جس میں بقول مولانا شبلی تصوف کے معرکہ آرا مسائل بیان کئے ہیں۔ ایک دیوان غزلوں کا بھی چھوڑا ہے جو بقول صاحب مجمع الفصحا "شیریں" ہیں اور اکثر فغانی کی بحروں میں کہی ہیں۔ رنگ طبیعت ملاحظہ ہو :۔

بدوستی تو خصمند عالمے با من　　ہزار دشمن و یکدوست مشکل افتادست
ز گرد باد بیابان ہمرہی نمی آید　　غبار کیست که دنبال محمل افتادست

یہ شعر خوب کہا ہے :۔

دیدی که خون ناحق پروانه شمع را　　چنداں اماں نه داد که شب را سحر کند

ایک حالت نظم کی ہے :۔

شفائی را تمام عمر در راه تو می بینم　　بکوئیت میرود یا از سر کوے تو می آید

نمکدان حقیقت سے بھی چند اشعار منتخب کئے جاتے ہیں جن میں انسان کو بحیثیت اشرف المخلوقات مخاطب کیا ہے :۔

ای تو آئینۂ تجلی ذات　　نسخۂ جامع جمیع صفات
در نمود تو ذات مستور است　　ذات مخفی صفات مذکور است

جز تو کس قابلِ امانت نیست ویں امانت بجز خلافت نیست
بتو از ملکِ ماہ تا ماہی نام زد شد خلیفۃ اللہی
ہرچہ در آسمان گردان است در تو چیزے مقابلِ آنست
آنکہ جوئیش آشکار و نہفت خویشتن را بہ پردۂ تو نہفت
اندریں پردہ باید ش نگری کہ خودش آیندہ نیست پردہ دری
ہم متاعی و ہم خریداری با خودت ہست طرفہ بازاری

شرف جہان قزوینی۔ ان کے باپ قاضی جہان نہایت باوقار شخص تھے شرف جہان
قاضی جہان کے نانا سید سیف الدین کا سلطان الجائتو کے زمانے میں بڑا عروج
تھا۔ ریاست و حکمرانی سب کچھ نصیب تھی۔ شرف جہان خود نہایت قابل شخص تھے
اور معقولات میں میر غیاث الدین منصور کے شاگرد تھے۔ رفتہ رفتہ شاہ طہماسپ
کے دربار میں رسائی ہوئی اور گویا سیاہ و سفید کے مالک ہوگئے۔ کربلائے معلی میں انکی
بنوائی ہوئی نہر آجتک موجود ہے۔ غزل گوئی میں انھیں خاص کمال تھا اور واقعات
و واردات عشق کی صاف اور دلکش الفاظ میں تصویر کھینچدیتے تھے :۔

بہر جا میروم اول حدیث نیکوال پرسم
کہ حرفِ آں مہِ نامہرباں را درمیاں پرسم
زمد ہوشی نفہمم ہرچہ گوید آں پری با من
چو از بزمش روم مضمونِ آں از دیگراں پرسم

ایک اور واقعہ کہتے ہیں :۔
زحمت چہ میکشی پئے درمانِ ما طبیب! ما بہ نمیشویم و تو بدنام میشوی
ایک مسلسل غزل میں اُس کیفیت قلب اور پریشانی کا اظہار کیا ہے جو معشوق کے
سفر کرتے وقت پیش آسکتی ہے :۔

از تو نمانده تاب جدائی دگر مرا | بہرِ خدا مرو بسفر یا ببر مرا
تا وعدہ کرد تا نکنم عزم ہمرہی | آں مہ چو دید وقت سفر در گذر مرا (راہ ۱۲)
گر قصدِ آں نداشت کہ گردم زغم ہلاک (معشوق کا لفظ بچا گیا) | بہر چہ کرد از سفرِ خود خبر مرا
عزمِ سفر نمودہ و ترسم کہ در دو روز | سازد بعشق شہرۂ شہرِ دگر مرا
قاصد اسباد چوں شرف از خویشتن رود | آگہ مکن ز آمدنش پیشتر مرا

ایران میں انکی طرز فغانی کی طرز سے زیادہ مشہور و مقبول ہوئی۔ اسی وجہ سے خیال بندی رفتہ رفتہ مٹنے لگی۔

وحشی

وحشی دورۂ صفویہ کے غزل گویوں کا سرتاج ہے۔ کرمانشاہ کے قریۂ بافق کا رہنے والا۔ اکثر یزد میں زندگی بسر کرتا تھا اسی سے یزدی مشہور ہو گیا زندگی شاہدان بازاری کے عشق میں کاٹی اور دم بھی نکلا تو شراب پیتے پیتے" (آتشکدہ) مرتے وقت یہ شعر نظم کئے:۔

زِ شبہائے دگر دارم تب غم بیشتر امشب | وصیت می کنم" باشید از من باخبر امشب"
مگر در من نشانِ مرگ ظاہر شد کہ می بینم | رفیقان را نہانی آستیں بر چشمِ تر امشب

صاحب آتشکدہ لکھتے ہیں کہ تین مثنویاں نظم کیں۔ مخزن اسرار کی بحر میں خلد بریں شیریں و خسرو کے مقابل ناظر و منظور۔ اور ایک اور مثنوی اسی بحر میں فرہاد و شیریں نظم کی جو ناتمام رہ گئی۔ غزلیں نہایت رنگین کہی ہیں اور واردات عشق کے نظم کرنے میں بے پناہ ہے۔ قصائد شاہ طہماسپ اول کی مدح میں نظم کئے ہیں اور ائمہ اہلبیت کا بھی مداح ہے۔ اکثر قدما کی بحروں میں خامہ فرسائی کی ہے مگر چونکہ واقعہ گوئی کا عادی ہے اور قصیدہ میں قوت تخیل کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے لہذا پھیکا پڑ جاتا ہے بعض تخیلی اشعار بہاریہ نقل کئے جاتے ہیں جو محاکات سے عاری ہونے کی وجہ سے بدرنگ ہو گئے ہیں۔ ملاحظہ ہوں:۔

تازہ آئینۂ ایام بروزنگ ملال — آرد از قوس قزح ابر بہاری صیقل

روز و از رشتۂ باران بسر سوزن برق — ابر بر قامت اشجار بصد گونہ حلل

پنجۂ تاک ز سرمای سحر می لرزد — لالہ از بہر ہمیں کردہ فروزاں منقل

غزلیں البتہ بیحد رنگین ہیں اور گذری ہوئی سناتے ہیں:۔

امروز یار عذر جفا ہاے رفتہ خواست — عذرے کہ او نخواست تبسم نہفتہ خواست

من بندۂ نگہ کہ بصد شرح و بسط گفت — حرف عنایتے کہ تبسم نگفتہ خواست

معشوق سفر پر تیار ہے ۔ وحشی اپنے دل کی داستان سناتا ہے ۔ ذرا شرف جہان کی غزل سے بھی مقابلہ کر لینا:۔

یاراں! خدا ترا! بسوے او گزر کنید — باشد کش ایں خیال ز خاطر بدر کنید

از حال ما چنانکہ در او کارگر شود — آں بے محل سفر کن ما را خبر کنید

منعش کنید از سفر و درمیان منع — اغراق در صعوبت رنج سفر کنید

گر خود شنید جاں ز من و مژدہ از شما — ور نشنود مباد کہ اینجا گزر کنید

وحشی گر ایں خبر شنود وای بر شما — از آتش زبانہ کش او حذر کنید

دیکھا کیا بیقراری ہے اور کتنا سوز و گداز۔ مجازی عشق کے حالات اس سے زیادہ پُر تاثیر نہیں ہو سکتے۔ چاند دیکھنے کے لئے لوگ کس شوق میں جمع ہوتے ہیں ۔ وحشی کی وارفتگی استہلال کی بھی اجازت نہیں دیتی۔ وہ اپنے عالم میں ہے اور اسی عالم کے چھٹنے کی آخری تاریخ اور پہلی تاریخ کے حساب لگا رہا ہے:۔

بازم از نو خم ابروئے کسے در نظر ست — سلخ ماہ دگر و غرۂ ماہ دگر ست

ہجر کی حالت سنو:۔

مارا دو روزہ دوری دلدار میکشد — زہر ست ایں کہ اندک و بسیار میکشد

یہی وارفتگی تھی جس نے واسوخت نظم کرادی ورنہ اس صنف کو دنیا میں کوئی بھی

نہ جانتا۔ غزل کے چند مصرعے دردِ دل بیان کرنے کو جب کافی نہ ہوئے تو بند کے بند کہہ ڈالے اور بعد کو کوئی شاعر تقلید تک بھی پوری طور سے نہ کرسکا:-

دوستاں حالِ پریشانئ من گوش کنید — داستانِ غمِ پنہانئ من گوش کنید
قصۂ بے سروسامانئ من گوش کنید — گفتگوئے من و حیرانئ من گوش کنید
شرحِ ایں قصۂ جانسوز نگفتن تا کے
سوختم سوختم ایں راز نہفتن تا کے

روزگارے من و دل ساکنِ کوئے بودیم — ساکنِ کوئے بتِ عربدہ جوئے بودیم
دین و دل باختہ دیوانۂ روئے بودیم — بستۂ سلسلۂ سلسلہ موئے بودیم
کس دراں سلسلہ غیر از من و دل بند نبود
یک گرفتار ازیں جملہ کہ ہستند نبود

نرگسِ غمزہ زنش اینہمہ بیمار نداشت — سنبلِ پُرشکنش ہیچ گرفتار نداشت
اینہمہ مشتری و گرمیِ بازار نداشت — یوسفے بود و لے ہیچ خریدار نداشت
اوّل آنکس کہ خریدار شدم من بودم
باعثِ گرمیِ بازار شدم من بودم

عشقِ من شد سببِ خوبی و رعنائیِ او — داد رسوائیِ من شہرتِ زیبائیِ او
بسکہ کردم ہمہ جا شرحِ دلآرائیِ او — شہر پُر گشت زغوغاے تماشائیِ او
ایں زماں عاشقِ سرگشتہ فراواں دارد
کے سر و برگِ منِ بے سروساماں دارد الخ

ولی دشت بیاضی

ولی دشت بیاضی[1] بھی وحشی کا معاصر ہے اور اُسی کے رنگ میں کہتا ہے۔

---

[1] قائن ایک صوبہ ایران کا ہے۔ اسکے مضافات میں ایک قریہ ہے جہاں کی مٹی سفید ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے دشت بیاض کہلاتا ہے۔

وہی شاہدانِ بازار کا عشق ہے جس کی کیفیتیں دکھائی گئی ہیں :-

تا چند زِ من رمیدہ باشی | با غیرِ من آرمیدہ باشی
بھر تو شنیدہ ام سخنہا | شاید کہ تو ہم شنیدہ باشی

یہ شعر نہایت پُر تاثیر اور کیف میں ڈوبے ہوئے ہیں :-

خوش آنکہ با تو دہم شرح مشکلِ خود را | بگریہ اُفتم و خالی کنم دلِ خود را
بدُورِ تو کہ یا رب نصیب دشمن باد | بدان رسیدہ کہ راضی کنم دلِ خود را
(رسیدہ ام)

دو شعر اور سُنو :-

چوں بد و نیکِ منِ سوختہ خرمن پُرسند | آہ اگر انچہ بدِل کردہ ام از من پُرسند
سببِ نالہ چہ پُرسی زدِلِ لائق نیست | کہ زِ ماتم زدگاں باعثِ شیون پُرسند

ملّا محتشم کاشی

ملّا محتشم کاشی کا نام تذکروں میں نہایت اعزاز سے لیا گیا ہے۔ اوحدی کا خیال ہے کہ "سلطنتِ شاعریش از قاف تا قاف رسیدہ بود" وصاحب آتشکدہ بھی "سرآمدِ شعرائے فصاحت شعارانِ روزگار" لکھتے ہیں۔ شاہ طہماسب کے دربار میں ان کا بڑا عروج تھا اور وحشی وغیرہ کے ہمعصر تھے۔ ابتدائی زندگی انکی بھی عشق بازی میں گذری ہے۔ اور جلالیہ و نقل عشاق میں اپنے حالاتِ عشق نظماً اور نثراً لکھے ہیں (آتشکدہ)۔ شعر گوئی کا شوق بھی ابتدائے عمر سے معلوم ہوتا ہے اسی لئے دیوان کے دو جز و کر دئے ہیں، صبائیہ اور شبابیہ۔ رنگ طبیعت کا اندازہ ان اشعار سے ہو جائیگا :-

ہزار نالۂ جانسوز کردہ ام امشب | عجب شبے بغمت روز کردہ ام امشب
شب مرا تو سیہ کردۂ و من تا روز | دعائے بد بہ بد آموز کردہ ام امشب

برائے خاطرِ غیرم بصد جفا کشتی | ہمیں برائے کہ ای بیوفا کرا کشتی
چو من ہلاک شوم از طبیب شہر بپرس | کہ درد کشتت مرا یا تو بیوفا کشتی

حقیقت یہ ہے کہ محتشم کی غزلوں کا رنگ تو بیشتر وہی ہے جو دورِ صفویہ میں رائج تھا یعنے واردات عشق بیان کرنا مگر بیان میں نہ جوش ہے نہ سوز و گداز اسی وجہ سے کسی قدر کلام پھیکا رہتا ہے۔ البتہ قصیدہ گوئی میں ان کا پایہ کسی قدر بلند نظر آتا ہے مگر وہ بھی ایران کے اندر ورنہ عرفی وغیرہ کے مقابلے میں لانا ہی بیکار معلوم ہوتا ہے کیونکہ نہ تو شوکت الفاظ ہے اور نہ طبیعت زوردار۔ ہاں! تمہیدیں نئی نئی ایجاد کی ہیں مثلاً:۔

دہندۂ کہ بہ گُل نکہت و بہ گِل جاں داد   بہر کہ ہرچہ سزا بود حکمتش آں داد

بعرش رتبۂ عالی بفرش پایۂ پست   ز روئے مصلحت ورای مصلحت ہاں داد

دو کشتیِ متساوی اساس را در بحر   یکے رساند بہ ساحل دگر بطوفاں داد

دو سالک متنا بہ سلوک را در عشق   یکے نوید بوصل و دگر بہ ہجراں داد[1]

اسی طرح گنوائے جاتے ہیں اور آخر میں کہتے ہیں:۔

چو بادشاہیِ اقلیم صورت و معنی   زیادہ دید ز شاہاں بہ میرِ میراں داد

اصل کمال ان کا مرثیہ گوئی میں ہے۔ واقعات کربلا ایک خاص طرز میں نظم کئے ہیں۔ بعض بند نقل کئے جاتے ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ واقعی اس سانحۂ ہوشربا سے ان کے دل پر چوٹ لگی ہے۔ جبھی دل ہلانے والے شعر نکل رہے ہیں:۔

باز ایں چہ شورش است کہ در خلقِ عالم است   باز ایں چہ نوحہ و چہ عزا و چہ ماتم است

باز ایں چہ رستخیزِ عظیم است کز زمیں   بے نفخ صور خاستہ تا عرشِ اعظم است

گویا طلوع میکند از مغرب آفتاب   کاشوب در تمامیِ ذرات عالم است

گر خوانمش قیامتِ دنیا بعید نیست   ایں رستخیزِ عام کہ نامش محرم است

در بارگاہِ قدس کہ جائے ملال نیست   سرہائے قدسیاں ہمہ بر زانوئے غم است

---

[1] یہ شعر اوپر کے شعر کا تقابل بہت اچھا ظاہر کرتا ہے۔

جن و ملک برآمدیاں نوحہ میکنند — گویا عزائے اشرف اولادِ آدم است

خورشید آسمان و زمین نورِ مشرقین

پروردۂ کنارِ رسولِ خدا حسین

امام حسین علیہ السلام کی شہادت کا اثر کائنات پر ایک اور بند میں یوں نظم کیا ہے:۔

چوں خونِ حلقِ تشنۂ او بر زمیں رسید — جوش از زمیں بذروۂ عرشِ بریں رسید

نخلِ بلندِ او چو خسیاں بر زمیں زدند — طوفاں بآسماں زغبارِ زمیں رسید

بادِ آں غبار چوں بمزارِ نبی رسانید — گرد از مدینہ بر فلکِ ہفتمیں رسید

یکبارہ جامہ در خمِ گردوں بہ نیل زد — چوں ایں خبر بہ عیسیٰ گردوں نشیں رسید

پُر شد فلک ز غلغلہ چوں نوبت خروش — از انبیا بحضرتِ روح الامیں رسید

کرد ایں خیال وہم غلط کار کاں غبار — تا دامنِ جلالِ جہاں آفریں رسید

ہست از ملال گرچہ بری ذاتِ ذوالجلال

او در دلست و ہیچ دلے نیست بے ملال

حقیقت یہ ہے کہ واقعۂ کربلا کی عظمت ان خیالات سے بیحد بلند ہے اور کسی شاعر کے امکان میں نہیں کہ اُس حزن و ملال کا پورا اندازہ کرسکے جو اس سانحۂ جانکاہ کی وجہ سے کائنات پر طاری ہوئے۔ صواعق محرقہ علامہ ابن حجر مکی میں لکھا ہے کہ قتل حسینؑ کی وجہ سے آسمان سرخ ہوگیا تھا اور آفتاب کو ایسا شدید گہن لگا تھا کہ تارے دکھائی دیتے تھے۔ بلکہ لوگوں کو خیال ہوا کہ قیامت برپا ہونیوالی ہے۔ علامہ ابن جوزی نے اسی آسمان کی سرخی کے بارے میں لکھا ہے کہ غضب کی حالت میں چہرہ سرخ ہو جاتا ہے اور ذات اقدس الٰہی چونکہ جسمیت سے منزہ ہے لہذا قتل حسینؑ پر اُسکے غضب کی تاثیر سرخیٔ افق کی صورت میں ظاہر

ہوئی - علاوہ بریں یہ بھی نقل کیا ہے کہ ملک شام میں جو پتھر اُٹھایا جاتا تھا خون
تازہ جوش مارتا ہوا نکلتا تھا - اور ایسے ہی بکثرت روایات شاعر کے پیش نظر ہیں
جن پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے اعتقاد رکھتا ہے اور اُسی جوش مذہبی میں مرثیہ
کہتا ہے - ہم پیشتر لکھ چکے ہیں کہ مرثیہ کے خصوصیات میں سے یہ ہے کہ اپنے جوش
قلب کی سچی تصویر کھینچے - مرنے والے کی عظمت اور خصوصیات ایسے الفاظ میں ظاہر
کرے کہ دوسرے بھی متاثر ہو جائیں - صحن عالم میں جو چیز ہو اُسے شریک غم کرلے -
اور سارے عالم کو مرنے والے کا سوگوار بنالے یہ سب امور اس واقعہ ہائلہ میں
علی وجہ الکمال موجود ہیں - کیونکہ اہل اسلام کی نظروں میں خود یہ دن ہولناک
اور اندوہناک معلوم ہوتا ہے مقتول کی عظمت ایسی ہے کہ سب کے قلوب متاثر
ہیں - عالم بھر حقیقت میں سوگوار ہے - ایسی حالت میں مرثیہ ضرور پُر تاثیر ہو جائیگا
بشرطیکہ شاعر سلیقۂ نظم درست رکھتا ہو اور فصاحت و بلاغت کے مقامات کی
پوری رعایت کرتا ہو - کسی شاعر نے داب نظم اور نتیجہ مرثیہ کو خوب ایک شعر میں
ادا کر دیا ہے :-

وہ یہ بھی ہو فصاحت بھی ہو توصیف بھی ہو
دل بھی محظوظ ہوں رقت بھی ہو تعریف بھی ہو

سحابی

سحابی استرابادی - جرجانی الاصل شوستر میں پیدا ہوا اور نجف اشرف
میں متوطن ہو گیا - شاہ عباس اعظم کا ہمعصر ہے اور فن شعر میں خیام ثانی ہے ۱۰۱۲ھ
اس کی تاریخ وفات لکھی ہے (مجمع الفصحا) - اسکی رباعیاں اس دور کی بہترین
یادگار ہیں - خیام کے وقت سے یہ صنف شعر محض تفنن طبع کے کام میں آتی تھی سحابی نے

لے دیکھو صحیح ترمذی - روایات ابن عباس وام المومنین ام سلمہ وغیرہ اور
صواعق ابن حجر متعلق احادیث فضائل عاشورہ -

اسے پھر معراج کمال تک پہونچا دیا۔ علاوہ غزلوں کے سترہ ہزار رباعیاں اسکی تصنیف سے بتائی جاتی ہیں۔ مولانا شبلی نے بھی کئی ہزار رباعیاں اسکی ملاحظہ کی ہیں۔ بعض مقامات پر خیام سے بھی سبقت لے گیا ہے۔ مثلاً خیام سراسر جبر کا قائل ہے حالانکہ اسلام نے اعتدالی حالت پر اعتقاد رکھا ہے۔ لا جبر ولا تفویض بل الامر بین الامرین۔ نہ بالکل مجبوری ہے نہ مطلق العنانی شعرا کے لئے یہ مقام نہایت نازک ہے۔ مولف نے یہ مسئلہ یوں سمجھا ہے :۔

یہ دل کے ولولے ہیں جو مجبور کرتے ہیں　　　ہاں جبر اگر کریں تو بڑا اختیار ہے

سحابی ذات واجب تعالیٰ کو خیر و شر اور جبر و اختیار دونوں سے بلند سمجھتا ہے۔ وہاں سے جو چیز آتی ہے حالت اطلاق میں آتی ہے۔ یہ ہمارے تعلقات ہیں جو اُسے لذت یا الم قرار دے لیتے ہیں۔ کہتا ہے :۔

عالم بخروش لا الٰہ الا ہوست　　　غافل بگماں کہ دشمن است او یا دوست

دریا بوجود خویش موجے دارد　　　خس پندارد کہ ایں کشاکش با اوست

اخلاقی تعلیم بھی بہت بلند دیتا ہے۔ نیکوں سے ملنا تو ضرور ہے مگر بدوں سے دور رہنا ناگوار ہے وہ شلیگل وغیرہ کی طرح چاہتا ہے کہ بدکاروں سے ارتباط بڑھا کے اُنھیں ہدایت کا راستہ دکھایا جائے :۔

نے با ہر کس نکو ست میباید بود　　　بد را ہم مغز و پوست میباید بود

کارے سہل است دوست بودن با دوست　　　با دشمن نیز دوست میباید بود

حقیقت کی جستجو میں بھی معمولی عارفوں سے اتنا بلند جاتا ہے کہ تصوف کو بھی ایک قسم کی رسم پرستی سمجھتا ہے۔ چاہتا ہے کہ اس سے بھی آزاد ہو کے رہے۔ اس کا عالم وصال اور یہی کیفیت کا ہے :۔

از ہر دو جہاں زیادۂ میخواہم　　　از پردہ بروں فتادۂ می خواہم

صوفی تو بکار خویش رو کایں رہ را　　پا بر سر خود نہادہ ٔ می خواہم

اسکی جویائی نہ مرشد کی محتاج ہے۔ نہ راہبر کی۔ یہ اپنے ہی وجود کو راہبر بھی سمجھتا ہے اور مطلوب بھی۔ اسکو مطلوب کی تلاش میں کہیں جانا ہی نہیں:-

آنم کہ ندارم بد و عالم کامے　　نا یافتہ جز پیکر وجود آرامے

گر خلقِ جہاں جملہ چو من بودندے　　لازم نشدے رسولے و پیغامے

اس کا جوش اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ ایک تو گمراہ ہونے کا کھٹکا ہی نہیں اور اگر ہے بھی تو مطلوب ہی سے کہتا ہے کہ اگر میں کھو جاؤں تو تو خود ڈھونڈ نکال تاکہ ہر رنگ میں تیرا ہی نظر آؤں۔ ہاں! اگر تو نے جستجو نہ کی تو پھر کھو جاؤنگا:-

گم گردم اگر تو جستجویم نکنی　　آئینہ صفت روی بر ویم نکنی

در حقِ خود از لطفِ تو گفتم بسیار　　یارب یارب دروغ گویم نکنی

شیخ بہائی

شیخ بہائی۔ حضرت شیخ بہاء الدین عاملی شاہ دولت صفویہ کے زمانے میں عالم جلیل القدر تھے اور پایہ تخت میں شیخ الاسلام کا مرتبہ رکھتے تھے۔ درویشی اور سیاحت کی طرف رغبت ہوئی تو تیس برس اسی میں صرف کر دئے اور حج و زیارات عتبات عالیات سے بار بار مشرف ہوئے۔ انھیں سفروں میں ایک بار ایک روز جہاز پر رہنے کا اتفاق ہوا۔ اُس دن ایک مختصر مثنوی مولانا روم کی بحر میں نظم کر ڈالی۔ اور مولانا کو آخر میں یاد بھی کیا:-

قُم و زمزم لی باشعارِ العجم　　کی تروحَ الرُّوحَ من ہمٍّ و غم

وابتدأ منہا ببیتِ المثنوی　　للحکیمِ المولویّ المعنوی

بشنو از نے چوں حکایت میکند　　و ز جدائیہا شکایت میکند

اس مثنوی کا نام **نان و حلوا** ہے۔ اس میں دنیوی لذات کا روحانی لذات سے مقابلہ کیا ہے اور اچھا کیا ہے۔ اشعار عربی میں بھی ہیں اور فارسی میں بھی معشوق

کی تخلیل میں چند شعر نقل کئے جاتے ہیں :-

از درم ناگہ در آمد بے حجاب   لب گزاں وز رخ برافگندہ نقاب
کاکلِ مشکیں بدوش انداختہ   وز نگاہے کارِ عالم ساختہ
یکدمک بنشست بر بالین من   رفت و باخود برد عقل و دین من
گفتمش کے یمنت اے خوش خرام   قال نصف اللیل لاکن فی المنام

مولانا روم کے مقابلے میں تو ان چند اوراق کا ذکر بیکار ہے۔ البتہ یہ اقتباسات اس امر کو ثابت کرنے کے لئے گئے ہیں کہ اُس زمانے کے علما بالکل خشک نہ تھے بلکہ شاعری کا پورا ذوق رکھتے تھے۔ جناب شیخ کا ۱۰۳۰ھ میں انتقال ہوا اور مشہد مقدس میں مدفون ہوئے فارسی نثر میں کئی کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں سے جامع عباسی پنج بابی فقہ میں بہت مشہور ہے۔ عربی تصانیف بہت ہیں اور نہایت عمدہ۔

ملا حسن کا ملا حسن کاشی کا ہفت بند منقبت امیر المومنین علیہ السلام میں بہت مشہور ہے یہ بھی اسی دور کی یادگار ہے۔ تخلیل کے ساتھ اعتقادات شامل ہیں اور احادیث مناقب کی تلمیحیں نہایت خوشگوار ہیں مثلاً :-

ساقی کوثر نہ چنداں مدح باشد مر ترا   اے ز تو دریاے فطرت کان گوہر یافتہ
با خدا و مصطفےٰ رائے تو یکرو داشتہ   وز خدا و مصطفےٰ شمشیر و دختر یافتہ
با صفاے گوہرِ پاکِ تو رضوان سالہا   خاکِ خجلت بر جبینِ آبِ کوثر یافتہ

یہ ہفت بند ایران و ہند میں بیحد مقبول ہے اور تبرکاً لوگ روزانہ پڑھتے ہیں زبان اسکی نہایت شیریں اور سلیس ہے اور استعارات وغیرہ اتنے پیچدار نہیں کہ کلام کو بدمزہ کر دیں۔

شانی تکلو شانی تکلو کا عروج شاہ عباس اعظم کے دربار میں ہوا۔ اُسنے ایکبار یہ مطلع پڑھا۔

اگر دشمن کشد ساغر و گر دوست   بطاقِ ابروے مستانۂ اوست

بادشاہ نے آسے سونے میں تلوا دیا۔ آخر عمر میں مشہد مقدس کا مجاور ہوگیا اور ۱۰۲۳ھ میں رحلت کی۔ غزل گوئی میں زمانے کا رنگ غالب ہے وہی واقعات عشق مجازی کا نظم کرنا اور شیریں ادائی سے زبان کو دلکش بنالینا:۔

دیگران را در گرفتار ے شریکِ ما مکن

مُدّعا گر شہرتِ حسن است یک رسوا بس است

غرض دَورۂ صفویہ میں جتنے اقسام کی شاعری ظہور میں آئی اُن سب کے نمونے ہم اس باب میں ذکر کر چکے ہیں لیکن سرزمین ایران کے نازک خیال ایران میں اس زمانے میں قیام نہ کرسکے اور ہندوستان چلے گئے۔ ان کے یہاں نازک خیالی فلسفہ طرازی۔ مثال بندی۔ سوز و گداز اور تصوف کی بہترین مثالیں ہیں مگر چونکہ نشو و نما ہندوستان میں ہوئی اور وہیں یہ اسالیب کامیاب ہوئے لہذا ان سب کا ذکر آئندہ باب میں کیا جائیگا۔ صفویہ خاندان کے سلاطین اور شہزادے بھی شاعر اور مصنف تھے خصوصاً شہزادہ سام میرزا کا تذکرۂ سامی نہایت معتبر ہے اور اکثر مصنفاتِ حال میں اُس سے استناد کیا گیا ہے۔ اشعار بھی نہایت صاف کہے ہیں چنانچہ بعض بہت مشہور ہیں مثلاً

سام میرزا

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم　　شادم از زندگئے خویش کہ کارے کردم

اسی طرح القاص میرزا پسر شاہ اسمعیل اول۔ مصطفےٰ میرزا پسر زادۂ شاہ طہماسب اول۔ بہرام میرزا برادر شاہ طہماسب وغیرہ بھی شاعر تھے۔ شاہ اسمعیل بانئے دولت صفویہ خود بھی نہایت خوشگو تھے اور خطائی تخلص کرتے تھے۔ طبیعت کا اندازہ اس شعر سے ہو جائیگا:۔

بے ستوں نالۂ زارم چو شنید از جا شد　　کرد فریاد کہ فرہاد دگر پیدا شد

شاہ عباس اعظم کے اشعار بھی مشہور ہیں۔ شاہ طہماسب انکے باپ عادل تخلص

کرتے تھے۔ آخری سلاطین صفویہ کا ذوق بھی شعر و شاعری کی طرف تھا مگر عرفی نظیری وصائب وغیرہ کا ہندوستان چلا آنا یا تو اس سبب سے تھا کہ اکبر و جہانگیر وغیرہ کے درباروں میں قدردانی زیادہ ہوتی تھی یا اختلاف مذاق شعری تھا جس نے ایسے کاملوں کو وطن سے ہٹا دیا کیونکہ ایران نازک خیالی میں کمال پیدا کئے بغیر سادگی کی طرف مائل ہو چکا تھا اور ہندوستان میں اس رنگ کو حد کمال تک پہونچنا تھا۔ اگرچہ نتیجہ یہاں بھی بالآخر یہی ہونے والا تھا کہ سادگیِ ادا کو ان ترکیبوں پر ترجیح دیجائے مگر اُس کے اسباب دوسرے تھے نہ یہ کہ سرے ہی سے ایک رنگ لطیف و دلکش کو خیرباد کہہ دینا۔

نثر میں ہم کہہ چکے ہیں کہ مذہبی کتابیں بکثرت لکھی گئیں اور اساطین علمائے شیعہ کی محنتیں ٹھکانے لگیں۔ علامہ محمد باقر مجلسی (المتوفی سنہ ۱۱۱۱ھ) فارسی تصانیف (علاوہ بحار الانوار وغیرہ کے) حیات القلوب (حالات انبیا میں) جلاء العیون (حالات ائمہ اثنا عشر میں) عین الحیات (مواعظ میں) حق الیقین (علم کلام میں) مذہبی معلومات کے نشر کرنے میں کامیاب ہوئیں۔ میر باقر داماد فلسفہ وغیرہ میں اپنے وقت کے بوعلی سینا تھے اور ثالث المعلمین[1] کہلاتے تھے۔ انکے والد ماجد امیر شمس الدین محمد الحسینی کا عقد شیخ علی بن عبدالعالی کرکی موسس اساس شیعیہ کی صاحبزادی سے ہوا تھا اسوجہ سے داماد کہلاتے تھے۔ میر محمد باقر کا بھی یہی لقب رہا۔ ملا صدرا مشہور فلسفی انھیں کے شاگرد تھے۔ شاعری میں اشراق تخلص تھا۔ ایک رباعی نعتیہ نقل کی جاتی ہے تاکہ ان کا مذاق سخن معلوم ہو جائے:—

علامہ مجلسی

میر باقر داماد

اے ختم رسل دو کون پیرایۂ تست　　افلاک یکے منبر نہ پایۂ تست
گر جسم ترا سایہ نیفتد چہ عجب　　تو نوری و آفتاب خود سایۂ تست

[1] معلم اول ارسطو ہے اور معلم ثانی ابو نصر فارابی۔

سنہ ۱۰۴۷ھ میں انتقال فرمایا اور عربی میں افق المبین عطیہ نادر کتابیں چھوڑیں۔ فارسی میں ایک رسالہ جذوات اس وقت پیش نظر ہے جس میں حقائق حکمت و معرفت بیان فرمائے ہیں۔ عبارت دقیق ہے اور عربیت سے لبریز۔ نمونہ ملاحظہ ہو:۔

"اوّل مرتبۂ عقول محض کہ انوار عقلیۂ قاہرہ اند و در عرض ایں مرتبہ اشرف و اتم و ابہیٰ و اقدم عقل نخستیں کہ صادر اول و اسبق اشعۂ شرق الا نور الانوار اوست و باصطلاحی او را عقلِ کل گویند۔"

میرزا محمد رفیع واعظ

میرزا محمد رفیع واعظ قزوینی گیارھویں صدی کے آخر میں گذرے ہیں۔ انکی کتاب **ابواب الجنان** مواعظ میں بے نظیر ہے۔ انشا پردازی شیریں ہے۔ قافیہ و وزن کا حسب دستور زمانہ التزام ہے اور استعارات و تخییل سے ہر بیان وابستہ ہے لیکن مضامین کی بنیاد سراسر قرآن و حدیث پر ہے اور حکایات بھی مذہبی روایات ہیں۔ اس کا نمونہ بھی دیکھو۔ اہل قبور کے حال میں لکھتے ہیں:۔

"در زیر پائے ما بیک دو ذرع فاصلہ چہ خبر و چہ صحبت۔ و دریں شگافہائے زہرہ شگاف چہ ولولہ و چہ وحشت است۔ ابنائے جنس ما ہند کہ با خاک تیرہ یکساں گشتہ اند۔ اقران و امثال مایند کہ نالۂ پر حسرت شان بزبانِ حال از فلک گذشتہ۔ گردن کشانند سر بگریبان مذلت کشیدہ۔ سخت مردانند بسنگ صعوبت اجل نرم گردیدہ"

منشی سکندر

منشی سکندر نے تاریخ عالم آرائے عباسی دولت صفویہ کے حال میں شاہ عباس اعظم تک کے زمانے کی لکھی اور انشا پردازی کا نشان بلند کیا۔ ظفر نامہ سے عبارت مشابہ ہے۔ فقرے الجھے بھی ہیں سلجھے بھی ہیں۔ استعارات کا رنگ کہیں گہرا ہے کہیں ہلکا۔ ترکی الفاظ ضرورت سے زائد داخل کر کے غرابت پیدا کر دی ہے۔ بالکل سادگی کہیں نہیں۔ آفتاب برج حمل میں داخل ہوتا ہے

تو یوں کہتے ہیں۔ "آفتاب عالمتاب کہ نیرِ اعظم و منور سازِ عرصۂ عالم است باکوکبۂ نور و اشعۂ جہان آرائے بعجت و سرور قدم بر بساط شرف نہاد" بادشاہ گھوڑے پر سوار ہو کے چلا تو کہتے ہیں۔ "عنان اشہب صبا پیوند بعزم سیر و شکار سواحل رود ہیرمند و انتظام مہمات ضروری خراسان بدالصوب انعطاف داده۔" دریا کا نام ۲

مرزا مہدی

مرزا مہدی خاں نے آخرِ دَور میں نادرشاہ کی تاریخ **جہانکشائے نادری** کے نام سے تصنیف کی اور عالم آرائے عباسی کا چربہ اُتارا اگرچہ زبان زیادہ سلیس ہے اور اُلجھاؤ بھی بہت نہیں ہے البتہ اُنکی دوسری تصنیف **دُرّۂ نادرہ** جو نادر کے واقعات میں ہے غیر مانوس عربی الفاظ اور طویل فقروں سے مملو ہے۔ الفاظ کا انبار ہے اور معانی ندارد۔ اور لفظیں بھی بیچھر۔ زبان کی نزاکت کو چکنا چور کر دینے والی۔ غرض کتاب کی ہیبت نادر کی ہیبت سے کم نہیں غنیمت ہے کہ یہ طرز مقبول نہ ہوئی ورنہ خدا جانے کیا ہو جاتا۔

مختصر یہ کہ عہد صفویہ ہر قسم کی نثر و نظم کے لئے یادگار ہے۔ اگرچہ تیموری عہد کے سے کامل اس عہد میں کم ملتے ہیں اور مذہبی لٹریچر سے قطع نظر کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ دَور بہت ہلکا ہے۔ لیکن تعداد کے اعتبار سے بہت آگے ہے کیونکہ مدت بھی طویل ہے۔ نادرشاہ کے بعد قتل و غارت کا بازار گرم رہا اور علوم و فنون کی ترویج رُک گئی لہٰذا آخری باب قاچاریوں کے حال سے شروع کیا جائے گا۔ خاتمۃ الکلام میں چند مصنفین کا اور ذکر کیا جاتا ہے جن سے تاریخ انشائے عجم کو تعلق ہے۔

آذر آتشکدہ

حاجی لطف علی بیگ آذر۔ خاندان شاملو کے شرفا میں سے تھا۔ عادل شاہ افشار کے زمانے سے شعر کہنا شروع کیا اور کریم خاں زند وغیرہ کی تعریف میں بھی اشعار کہے ہیں ۱۱۳۳ھ میں پیدا ہوا اور ۱۱۹۵ھ میں انتقال کیا۔ فہرست

نادرشاہی اور بعد کے ہنگامے اسے وطن آوارہ کئے رہے۔ اسی دوران میں حج و زیارات وغیرہ سے فراغت کی۔ فن شعر میں میر سید علی مشتاق کا شاگرد رہے۔ قصیدہ گوئی میں کریم خان زند وغیرہ کا مداح ہے۔ غزلیں اچھی کہتا ہے۔ ایک مثنوی یوسف زلیخا بھی نظم کی ہے جو آتشکدہ کے آخر میں نقل ہے۔ نثر میں اس کا آتشکدہ تذکرۂ شعرائے فارسی میں یادگار ہے۔ صاف اور سلیس زبان میں حالات شعرا بالخصوص اپنے ہم عصروں کے حال اچھے لکھے ہیں۔ انتخاب کلام بیشک بہت اچھا نہیں ہے اور اُن شعرائے ایران سے کدورت معلوم ہوتی ہے جو ہندوستان چلے آئے حالانکہ حسب تصریح مجمع الفصحا آتشکدہ خود ہندوستان میں تصنیف ہوا۔ مثنوی یوسف زلیخا میں سے اس مقام سے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں جہاں زنان مصر نے حسن یوسف سے مبہوت ہو کے انگلیاں کاٹ ڈالیں:—

زناں را دست چوں از تیغ شد ریش — زلیخا ایں سخن میگفت با خویش

چہ بودے یارب ایں کج لقمہ خواہا — بجائے کف بریدندے زبانہا

کسے را کاتش عشقے بجان است — زکس تا نیستش رشکے نہان است

چہ آید پائے غیرے در میانہ — کشد آں آتش پنہاں زبانہ

یہ نمونہ اس مثنوی کے بہترین اشعار کا ہے۔ چند اچھے شعر غزلوں سے بھی منتخب کئے جاتے ہیں:—

دم مُردن شدی دمساز چوں من ناتوانے را
مرا گر زندہ کردی کشتی از رشکم جہانے را

بآں درخت زباں یارب از خزاں مرساد
کہ زیر سایۂ خود مرغ بے پرے دارد

مطرب امشب نالہ سر کردہ است نائے میزند
در میانِ نالہ حرف آشنائے میزند

خدمتِ دیرینِ ما بیں ورنہ در آغاز عشق

ہر کرا بینی دم از مہر و وفائے میزند

تذکرہ حیرت اور تذکرہ طاہر محمد تقی خیال اور بوستان خیال

اسی زمانے میں قیام الدین حیرت نے تذکرۂ مقالات الشعرا اور محمد طاہر نصیر آبادی نے تذکرۃ الشعرا تصنیف کئے افسوس کہ یہ موجود نہیں ورنہ کچھ انکے متعلق بھی لکھا جاتا۔ ایک نئی چیز اس زمانے کی اور یادگار ہے محمد تقی خیال نے اسمٰعیلیوں کو ہیرو بنا کے ایک فرضی افسانہ لکھا جس میں بڑے بڑے مسائل فلسفیہ اور علوم عربیہ پر روشنی ڈالی ہے اور ترویج علوم و اعتقادات کا وہ ذریعہ اختیار کیا جسکی تقلید بہتر طریقے سے یورپ میں ہو رہی ہے۔ یہ افسانہ تو جلدوں میں ہے اور بوستان خیال نام ہے۔ اکثر باتیں دور از قیاس بھی درج کر دی ہیں جن کا نہ ہونا ہونے سے بہتر ہے۔ زبان شیریں و دلکش ہے اور اشعار نفیسہ کے جابجا آجانے سے زینت کلام دو بالا ہو گئی ہے۔

باب یازدہم

ہندیہ

فارسی کی وسعت

اس وقت تک جو کچھ بیان ہوا ہے وہ زبان کی اُنھیں لطافتوں تک محدود ہے جنکی نشو و نما سرزمین عجم میں ہوئی۔ اکثر نازک محاورے اور شیریں فقرے اور جملے ایرانی آب و ہوا میں پرورش پاکے فارسی کا جزو بنے۔ کبھی اسم و فعل ملاکے محاورات پیدا کئے گئے جیسے تن زدن (خاموش ہو جانا)۔ دراز کشیدن (پاؤں پھیلاکے لیٹنا)۔ تر آمدن (شرمانا)۔ سرکردن (شروع کرنا)۔ کبھی حرف و فعل کی ترکیب سے جیسے در اُفتادن (لڑنا)۔ بر اُفتادن (شکست کھانا)۔ درگرفتن چراغ (چراغ کا بھڑکنا)۔ اسی طرح اور متعدد ترکیبیں پیدا کی گئیں اور دلکش و دل نشین محاورات ترتیب دیے گئے۔ مثلاً دل تنگی (غمگینی)۔ پا داری (استقلال)۔ برہمی بے ترتیبی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ وسعت زبان بیشتر قوت تخیل کے ذریعے سے ہوئی ہے یا یوں کہنا چاہیئے کہ فارسی زبان کی وسعت کا بیشتر حصہ وہی ہے جو دامن شاعری کے سایہ میں پلا ہے۔ محاکات نے بھی محاورات بنانے میں اچھی خاصی مدد دی۔ تم دیکھتے ہو کہ جب کوئی شخص خاموش جاتا ہے اور ہزار کہو مگر نہیں بولتا۔ اُس وقت جھنجھلاکے اُنگلی اُسکے ہونٹ پر مارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بولتا کیوں نہیں۔ ایرانی نے اسکی تصویر کھینچ کے محاورہ بنالیا "ہرچند انگشت بر لبش زدم۔ حرفے از زبانش برنیامد" اسی طرح جہاں ہم بولتے ہیں کہ جان پر آبنی۔ ایرانی کہتا ہے "کارد باستخواں رسید" سہل بات کو "پیش پا اُفتادہ" کہدیتا ہے۔ بھرم کھل جانے کے مقام پر کہتا ہے "بخیہ از روے کارش اُفتاد" غرض تخیل و محاکات کی قوتوں سے بہت بڑا ذخیرہ کنایوں

اور استعاروں کا تیار ہوا جو کثرت استعمال سے محاورہ کہلانے لگا اور جزوِ زبان بن گیا۔ علاوہ بریں عربوں اور ترکوں کے اثر سے اُن کی زبان کے الفاظ بھی فارسی میں شامل ہوئے جس سے اور بھی وسعت ہوگئی بلکہ عربی الفاظ نے فارسی کا جامہ پہن کے کبھی کبھی ایسا رنگ بدلا کہ عرب کو اپنا مال پہچاننا دشوار ہوگیا مثلاً "شاہد" عربی میں گواہ ہے۔ فارسی میں معشوق۔ یا ارتفاع (بلندی) سالانہ آمدنی ہے یا طاماتٌ (مصائب) طامات۔ مقالات نامشروع ہیں۔ بعض الفاظ کی صورت تک بدل گئی عربی میں محفّہ تھا فارسی میں محافہ ہوگیا۔ یا حاجّ (حج کرنے والا) حاجی کہلانے لگا۔ بعض کے لفظی ترجمے فارسی میں کئے گئے اور رفتہ رفتہ محاورہ بن گئے مثلاً بالراس والعین (بسر و چشم)۔ بنت العنب (دخترِ رز) رطب اللسان (تر زبان) وغیرہ وغیرہ۔

یہ زبان جب فاتحوں اور درویشوں کے ساتھ ہندوستان میں آئی تو اپنے توسع کے اصول و قوانین ساتھ لیتی ہوئی آئی۔ پہلے ہندی الفاظ پر بقاعدہ تفرّس قبضہ کرنا شروع کیا۔ کسی نے کہا:۔

ہندوستانی فارسی

سرِ آں دو چشم گردم کہ چو ہندوانِ رہزن ۔۔۔ ہمہ را بنوکِ مژگاں زدہ بر جگر کٹارہ[1]

شوخ سوسن را بگو دل میبرباید فشقہ ات ۔۔۔ ذاتِ رحیوت است ترسم دستِ بر کھڈگ کند

اسی طرح منتھرا ہندوستان کا مشہور شہر منتورہ[2] ہوگیا۔ جھگڑ۔ جگر[3]۔ جھڑوکہ۔ جروکہ۔ جھجھر جھجھری۔ کھڑکی[4]۔ چوکھنڈی[5] (بالاخانہ) چوگندی۔ جیسلمیر کا پہاڑ۔ جسر میر۔ کہار کہار[6] وغیرہ وغیرہ۔

---

[1] فرہنگ رشیدی میں اسے قتالہ سے مشتق سمجھا ہے حالانکہ کٹارہ خاص ہندی لفظ ہے ۱۲

[2] چوں زند سبزِ منتورہ حرفے از بیاضِ خدِ حسن ۔۔۔ بہر زیب نطق مصحف خوان گل از بر کند

[3] عرفی کہتا ہے:۔ در حیا نشستہ از شبنم گل عرق فشانست ۔۔۔ آں بادکہ در ہند گرآید جگر آید

[4] سیر گشتم ز کھڑکئے ایام ۔۔۔ ہوس سیم و زر نمیدارم

[5] چوکنڈ سے کوہش اگر سایہ افگند ۔۔۔ پیل سپہر شانہ بذرد و بزیرِ آں

[6] چوں کردہ رو بر پالکی گر دیدہ خاور پالکی ۔۔۔ بنشست تا در پالکی نہ چرخ کہار آمدہ

جب مدّت کے بچھڑے ہوئے ملتے ہیں تو تپاک بڑھ جاتا ہے ۔ فارسی زبان جب آرین قوم کے پاس واپس آئی تو ایک صورت یکجہتی کی اور نکل آئی یعنے بعض چیزوں کے ہندی نام ترک کرکے فارسی نام وضع کئے گئے اگرچہ ایران میں بھی انکے نام موجود تھے مگر آریا ورت اپنی فارسی چاہتا تھا مثلاً چمٹا دست پناہ کہلایا ۔ اگرچہ آتشگیر ایران میں نام موجود تھا (اور بے تکلفی اتنی بڑھی کہ دستپناہ گیا یعنے ہندی لباس پہن لیا) ۔ ہاتھوں کی حفاظت کے لئے میدانِ جنگ میں جو چیز پہنتے تھے ہندوستان میں اُس کا فارسی نام "دستانہ" رائج ہوا اور ایرانی اپنی زبان چھوڑ کے ترکی لفظ "قلچاق" بولنے لگے ۔ کپڑوں کے نام تن زیب ۔ جامدانی کامدانی وغیرہ ۔ یا عہدوں کے نام برق انداز ۔ جمعدار ۔ رسالہ دار وغیرہ ہندوستان میں رائج ہوئے ۔ اسی طرح سندِ قبض الوصول ہمارے ملک میں رسید کہلانے لگی اور مُرکّب کا نام روشنائی ہوگیا ۔ تخئیل و محاکات کے زبردست قانون تو موجود ہی تھے ۔ لہذا یہاں بھی ہر روز نئے نئے استعارات و تشبیہات پیدا ہونے لگے جن کی ایرانیوں کو خبر بھی نہ ہوئی اور رفتہ رفتہ جزوِ زبان ہوگئے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کی فارسی ایران کی فارسی سے جدا ہوگئی ۔

دورۂ غزنویہ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ مسعود سعد سلمان کا مستقل قیام پنجاب میں ہوا اور اُنکی نظم و نثر فارسی بیشتر یہیں مرتب ہوئی ۔ فاتحانِ اسلام کے ساتھ ہر عہد اور ہر دور میں علما و فضلا ۔ شعرا و مورخ ۔ اہلِ صنعت و حرفت وغیرہ یہاں آتے جاتے رہے اور انکی فارسی پر ہندوستانی رنگ بھی چڑھتے رہے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کے فارسی لٹریچر کا ارتقاے فطری یہاں کے مذاہب و رواسم ۔ آب و ہوا اور تمدّن سے متاثر ہوکے ہوا اور فطرۃً ہونا بھی یہی چاہئے تھا ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ امریکہ کا انگریزی لٹریچر بالکل انگلستان کے لٹریچر سے جدا ہے بلکہ انگلینڈ ۔ اسکاٹلینڈ

اور آئرلینڈ کے لٹریچر خود یکساں نہیں مگر فن تنقید ہر ایک کے ساتھ انصاف کرتا ہے۔ ہمارے ملک کی فارسی کے لئے بہت بڑی بدنصیبی تھی کہ جب کسی نے تنقید کی تو یہاں کے لٹریچر کو ایران کی فارسی کا جزو سمجھ کے کی اور اعتراضات رکیکہ کا انبار لگا دیا۔ حالانکہ یہ رویہ اختیار کرنا تنقید کی منقصت اور نقاد کی کوتاہ نظری کا ثبوت دیتا ہے۔ ہم نے یہ باب اسی لئے جدا کر دیا کہ ایک دورۂ ہندیہ قائم کرکے یہاں کی فارسی کا تدریجی ارتقا دکھا سکیں اور جن ایرانی شاعروں کو ایرانیوں نے ہندی کہہ کے حقیر کر دیا ہے اُنھیں بھی شامل کر لیں کیونکہ اُنکی نشو ونما یہاں کے ماحول میں ہوئی اور جو کچھ اُنھوں نے تصنیف کیا وہ ہندوستانی فارسی کی ارتقائی تدریج کا ایک جزو مستقل ہے۔

منہاج السراج

اگرچہ ہندوستان میں شاعری کا سلسلہ غوریوں ہی کے وقت سے شروع ہو گیا اور نثر میں منہاج السراج[۱] نے تاریخ **طبقات ناصری** تصنیف کر کے ناصر الدین محمود کو غالباً ۶۵۸ھ میں نذر دی لیکن مسلسل تاریخ شعر خلجیوں کے وقت سے شروع ہوتی ہے اور امیر خسرو دہلوی پہلے ہندی نژاد ہیں جنھوں نے فارسی میں نظم و نثر لکھنے کو قلم اُٹھایا۔

امیر خسرو

امیر صاحب ۶۵۱ھ میں پٹیالی (ضلع ایٹہ) میں پیدا ہوئے۔ انکے والد سیف الدین ترکوں کے مشہور قبیلۂ لاچین سے منسوب تھے اور فتنۂ چنگیز خانی میں ہندوستان چلے آئے تھے جب خسرو نے ہوش سنبھالا تو درسیات پڑھنے کے لئے بٹھائے گئے۔

---

[۱] منہاج کی ولادت ۵۸۹ھ میں بمقام جوزجان متصل بلخ واقع ہوئی اور ابتدائی عمر شاہان غور کی ملازمت میں باپ دادا کی طرح گذری ۶۲۴ھ میں ہندوستان آیا اور سلطان ناصر الدین قباچہ کی ملازمت کی۔ شمس الدین التمش کا غلبہ ہو جانے پر اُسکی سرکار سے متوسل ہوا اور اُسی کے فرزند کو طبقات ناصری نذر دی۔ اس کتاب میں چنگیز خاں اور ہلاکو خاں کے حملوں کے حال بالتفصیل دیئے ہیں اور بعض واقعات ایسے بھی نقل کئے ہیں جو دوسری کتابوں میں ذرا مشکل سے ملینگے ۱۲

موزونیٔ طبع کے آثار بچپن ہی میں ظاہر ہونے لگے اور کچھ نہ کچھ نظم کرنا شروع کر دیا۔ درسیات عربی و فارسی ختم کرنے کے بعد کشلو خاں (معروف بہ چھجو خاں) کا تقرب حاصل ہوا (یہ زمانہ غیاث الدین بلبن کا تھا) ایک دن اتفاق سے بغرا خاں (پسر بلبن) کے دربار میں بیٹھے تھے اور شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ امیر خسرو نے جو اشعار اپنی خاص دھن میں پڑھے تو شہزادہ نے خوش ہو کے ایک لگن بھر کے روپے عطا کئے۔ چھجو خاں کو یہ عطیہ لینا ناگوار ہوا اور امیر صاحب مجبوراً بغرا خاں کے ساتھ ہو گئے۔ پھر سلطان محمد قاآن (بلبن کے بڑے بیٹے) نے انھیں اپنے شعرائے خاص میں داخل کیا۔ اسی زمانے میں ارغون خاں (نبیرۂ ہلاکو خاں) کی طرف سے تیمور خاں نے لاہور پر حملہ کیا اور فتح و غارت کرتا ہوا ملتان تک آ گیا۔ یہاں سلطان محمد قاآن نے نہایت جوانمردی سے مقابلہ کیا مگر اتفاق سے ایک تیر ایسا کاری لگا کہ جان بحق تسلیم ہو گیا۔ امیر خسرو اور حسن دہلوی بھی اس معرکے میں شریک تھے۔ تاتاری ان دونوں کو قید کر کے بلخ لے گئے جہاں انھوں نے ایک پُر درد مرثیہ میں یہ واقعات نظم کئے۔ دو برس کے بعد دہلی واپس آئے اور بلبن کے دربار میں مرثیہ پڑھا تو کہرام مچ گیا اور بادشاہ کو روتے روتے بخار آ گیا جس سے جانبر نہ ہوا۔ بلبن کے انتقال کے بعد خلاف وصیت کیقباد پسر بغرا خاں کو امرائے دولت نے تخت پر بٹھا دیا۔ یہ عیاشی میں مصروف ہو گیا۔ بغرا خاں نے جو سنا تو بنگال سے دہلی کی طرف چلا۔ کیقباد نے باپ کا مقابلہ کیا۔ آخر صلح ہوئی اور کیقباد دہلی واپس آیا۔ امیر خسرو نے کیقباد کے کہنے سے یہ واقعات ایک مثنوی میں نظم کئے جس کا نام قران السعدین ہے۔ یہ تصنیف ۳۶ برس کی عمر کی ہے اور سال اختتام ۶۸۸ھ کیقباد کے بعد اس کا کمسن بچہ شمس الدین کیکاؤس (۶۸۹ھ میں) بادشاہ ہوا مگر اُسے قید کر دیا گیا اور جب خاندان میں کوئی دعویدار نہ رہا تو ملک فیروز شائستہ خاں نے جلال الدین خلجی لقب اختیار کر کے سلطنت پر قبضہ کیا۔ اس کا جاہ و جلال

علم دوستی کے ساتھ تھا اور بڑے بڑے کملاے روزگار ایران سے آکر جمع ہوگئے تھے۔ بلکہ ہر فن کا کامل دربار میں موجود تھا۔ اس چہل پہل میں امیر خسرو بھی داخل کئے گئے جنہیں **امیر** کا خطاب عطا ہوا اور امرائے دولت کا لباس خلعت میں ملا۔ امیر صاحب نے جلال الدین کے فتوحات پر ایک مثنوی نظم کی جس کا نام **تاج الفتوح** ہے۔ آخر جلال الدین کو اُسکے بھتیجے علاء الدین نے قتل کراکے سلطنت حاصل کی مگر باوجود اس بے رحمی اور بد عنوانی کے کاملین فن کی پرورش نہایت سیر چشمی سے کرتا رہا۔ علاوہ علما و حکما کے شعرا بھی کثرت سے تھے مگر امیر صاحب کے سامنے سب گرد تھے۔ **خمسہ نظامی** کا جواب اسی عہد میں نظم کیا اور آخری کتاب **ہشت بہشت** سانشہ میں ختم ہوئی۔ غرض خلجیوں نے امیر صاحب کی بڑی قدردانی کی یہانتک کہ قطب الدین مبارک کے نام پر جب مثنوی نہ سپہر ۱۸ اشہ میں معنون کی تو اُس نے ہاتھی کے برابر روپئے تول کے انعام میں دئے۔ خلجیوں کے بعد غیاث الدین تغلق کا زمانہ آیا تو وہ امیر صاحب کا سب سے زیادہ قدردان نکلا اور ایسا خوش کیا کہ اپنے نام پر **تغلق نامہ** لکھوالیا جس میں اُس کی سلطنت کے تفصیلی واقعات درج ہیں۔ تغلق جب بنگال گیا تو خسرو ہمراہ گئے اور وہیں رہ گئے۔ قضائے کار انکے مرشد خواجہ نظام الدین اولیا کا انتقال ہوگیا۔ یہ سُن کے بیقرار ہوگئے اور روتے ہوئے دہلی واپس آئے۔ یہاں آکے سیاہ کپڑے سوگ میں پہن لئے اور چھ مہینے قبر کی مجاوری کر کے ۷۲۵ھ میں رحلت کر گئے اور پائین پا دفن ہوئے۔

امیر صاحب کا اگرچہ سلاطین و امرا کے درباروں سے تعلق رہا مگر طبیعت ہمیشہ فقر و تصوف کی طرف مائل رہی۔ خواجہ نظام الدین کہا کرتے تھے کہ "امید ہست کہ خدا در روز جزا مرا بسینۂ سوزان این ترک بخشد"۔ ایک دفعہ خواجہ صاحب لب دریا ہندوؤں کی عبادت اور اشنان کا تماشا

دیکھ رہے تھے کہ زبان سے نکلا :-

ہر قوم راست دینے راہے و قبلہ گاہے

خواجہ صاحب ٹوپی ذرا ٹیڑھی دئے ہوئے تھے - خسرو نے برجستہ کہا :-

من قبلہ راست کردم بر طرف کج کلاہے

حقیقت یہ ہے کہ امیر خسرو سے زیادہ جامع شاعر[1] شائد ہی کوئی ہوا ہو - مثنوی (رزمیہ و صوفیہ دونوں) - قصیدہ - غزل - قطعہ - رباعی - مستزاد - مرثیہ - غرض ہر صنف کو نظم کیا ہے اور نہایت خوب نظم کیا ہے - ہندوستان کا تو ذکر کیا - ایرانی شعرا بھی عزت سے یاد کرتے ہیں - شیخ سعدی کے دل پر انکے کلام کا اچھا اثر تھا (اگرچہ ملاقات کے لئے شیراز سے دہلی یا بنگال آنا ثابت نہیں) ملا جامی کہتے ہیں کہ خمسۂ نظامی کا جواب خسرو سے بہتر کسی نے نہیں کہا - خود کہتے ہیں کہ مثنوی میں نظامی غزل میں سعدی - مواعظ و حکمیات میں سنائی و خاقانی - قصائد میں کمال اسمٰعیل و رضی نیشاپوری کی تقلید کرتا ہوں - انکی شاعری کے خصوصیات مجملاً یہ ہیں کہ جس اتباع کا دعوی کیا ہے وہ بالکل صحیح ہے مگر تشبیہات و استعارات جدیدہ اکثر پیدا کئے ہیں اور قدما کی طرز سے جدائی اختیار کی ہے - غزلگوئی میں نازک خیالی - واقعہ نگاری - واردات عشق کا ذکر سب کچھ موجود ہے بلکہ فن موسیقی میں کمال[2] ہونے کی وجہ سے بحریں اس قدر مناسب اختیار کی ہیں کہ کلام کا اثر دو چند ہو جاتا ہے خصوصاً واقعہ نگاری تو بیحد موثر ہوتی ہے - اب ہم ہر صنف کے نمونے نقل کرتے ہیں :-

قصیدے میں قوت تخیل زائد درکار ہوتی ہے اور مطالع و مخالص بالخصوص

---

[1] ایک مثنوی میں خسرو نے شہاب سے اصلاح لینے کا اقرار کیا ہے مگر یہ استاد صاحب بالکل غیر معروف ہیں اور انکے حالات کہیں نہ مل سکے - [2] موسیقی میں اس قدر کمال تھا کہ ایرانی و ہندوستانی سروں کو ملا کے متعدد دلکش راگ ایجاد کئے اور اپنے زمانے کے کامل کلاونت گوپال کو اپنے کمال کا قائل کرا دیا (دیکھو شعر العجم جلد دوم)

جدّت ادا دیکھی جاتی ہے۔ پَو پھٹنا۔ نسیم سحری کا چلنا فارسی میں دمیدن صبح کہلاتا ہے۔ کھلے مقامات پر اس وقت بھینی بھینی خوشبو بھی آتی ہے۔ ابھی آفتاب نکلا نہیں ہے۔ ممدوح بھی سَیر دیکھ رہا ہے۔ خسرو کہتے ہیں :—

بود پنہاں آفتاب آندم کہ صبح   ہمدمی با بادِ عنبر بو نمود

صبح را گفتم کہ خورشید کجاست   آسماں روئے ملک را چہ نمود

مرثیہ محمد قاآن کا نظم کیا تھا جس کا اثر بیان ہو چکا ہے۔ دیکھو اس صنف کے خصوصیات کو کیونکر نبھایا ہے :—

واقعہ است ایں یا بلا از آسماں آمد پدید   آفت است ایں یا قیامت در جہاں آمد پدید

راہ در بنیادِ عالم داد سیلِ فتنہ را   رخنۂ کاسماں در ہندوستاں آمد پدید

مجلس یاراں پریشاں شد چو برگِ گل ز باد   برگ ریزی[1] گوئی اندر بوستاں آمد پدید

بسکہ آب چشم خلقے شد رواں در چار سو   پنج آبے[2] دیگر اندر مولتاں[3] آمد پدید

جمع شد سیارہ در چشم مگر طوفاں شود   چوں بہ برج آبی انجم را قراں[4] آمد پدید

من نخواہم جز بہاں جمعیت[5] ایں گہ شود

خود محال است ایں کہ نبات النعش پروین کے شود

دیکھو آخری مصرع کتنا نیا ہے۔ خیال یہ ہے کہ جو گھر ماتم خانہ بن گیا وہاں محفل سرور کی امید نا ممکن ہے جیسے نبات النعش کا پروین بننا محال ہے۔ نبات النعش کے سات ستارے پریشان ہیں چار نعش کی شکل ہیں اور تین رونے والوں کے قائم مقام۔ پروین کے سات ستارے یکجا مجتمع ہیں اور خوشۂ انگور سے مشابہ ہیں۔

---

[1] خزاں، پت جھڑ کا موسم۔ [2] اس صوبہ میں پانچ دریا بہتے ہیں اسی سے پنجاب کہلاتا ہے۔ [3] ملتان شہر کا نام۔ [4] علم نجوم کا مسئلہ۔ [5] یعنے سلطان محمد شہید کے وقت کی چہل پہل۔

مثنویاں جن مضامین میں لکھی ہیں نہایت خوب ہیں البتہ ایک بات ہے کہ اصل واقعہ سے ہٹ کے دوسری باتیں بیان کرنے لگتے ہیں اور اُن میں ذرا طول دیدیتے ہیں اس کمزوری کا خود بھی اعتراف کرتے ہیں :-

وصف براگنگونہ فروراندہ ام   کز غرضِ قصہ فرو ماندہ ام

لیکن یہ بات زیادہ تر قران السعدین میں ہے اور مثنوی کا مضمون بھی باپ بیٹے کی لڑائی کو سراہنا جو خود لغو ہے۔ یہ بھی خسرو کا کمال تھا کہ ایسی بے سروپا بات اپنی شاعری کے ابتدائی زمانے میں لطف سے نظم کردی۔ دیکھو بیٹے کی زبان سے استحقاق سلطنت باپ کے مقابلے میں ثابت کرتے ہیں :-

گر بہ گہر تاج ستانِ توام   عیب مکن گوہرِ کانِ توام

در ہوسِ تاج ترا در سر ست   من گُہرم تاج مرا در خور ست

اس کے بعد اُس نے اپنی شجاعت و سطوت کا ذکر کیا ہے۔ باپ کی طرف سے جواب محبت پدری میں ڈوبا ہوا جاتا ہے :-

اے ز نسب گشتہ سزائے[1] سریر   وز پسری ہیچ پدر بے نظیر

گرچہ[2] غبارست ز کارِ توام   سرمۂ چشم است غبارِ توام

گرچہ توانم ز تو ایں پایہ بُرد   از تو ستانم بہ کہ خواہم سپرد

شکر کہ شد زندہ در ایامِ تو   من ز تو و نام من از نامِ تو

پھر محبت پدری کا اظہار کیا ہے جس کو پڑھ کے بیٹے کا دل بھی تڑپ گیا ہے اور دونوں باہم آکے ملے ہیں۔ مولانا شبلی کی رائے ہے کہ نظامی کے مقابلے میں مطلع الانوار میں صاف خامی نظر آتی ہے اور آئینہ اسکندری بالکل پھیکی اور

---

[1] لائق - [2] اگرچہ تیرے مقابلے سے میرے دل پر غبار آگیا ہے مگر چونکہ تو میرا ہی لخت جگر ہے لہذا یہ غبار بھی میرے لئے سرمۂ چشم ہے۔

کمزور ہے۔ ایک رزمیہ نظم بطور نمونہ نقل کی جاتی ہے :۔

بہ گردوں شدہ نای زریں خروش   بدریای لشکر در افتاد جوش

ہزا ہز در آمد بہ ہر دو سپاہ   ردا رو در آمد بخورشید و ماہ

علم سر ز عیوق[۱۵] برتر کشید   سناں چشم سیارہ بر سر کشید

غبار زمیں کلہ بر ماہ بست   نفس را درونِ گلو راہ بست

(پردہ شد)

چناں گشت روی ہوا گرد ناک   کہ سیارہ گم کرد خود را بخاک

لیلیٰ مجنوں میں البتہ زورِ طبیعت دکھایا ہے اور بعض مقامات خوب کہے ہیں کیونکہ خود بھی عاشق مزاج ہیں اور وارداتِ عشق کو خوب سمجھتے ہیں۔ ایک خوبی ان کی مثنویوں میں یہ بھی ہے کہ خاص خاص چیزوں پر بھی نظمیں تیار کی ہیں مثلاً کاغذ کی تعریف۔ میووں کا حال۔ شراب۔ دریا۔ کشتی۔ شمع وغیرہ کا مستقل ذکر کیا ہے حالانکہ اب یہ رنگ یورپ کے لئے مخصوص ہو گیا ہے اور ایشیا میں تقلیدِ محض کی صورت میں جاری ہے۔

غزل کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ اپنے معاصرین میں سب سے بہتر کہتے ہیں اور اسلاف کے لئے لطیف راہیں کھول گئے ہیں خصوصاً سوز و گداز تو اسقدر ہے کہ شاید و باید۔ بقول مولانا شبلی یہ معلوم ہوتا ہے کہ آگ سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ اس میں کبھی معشوق سے اپنا حال کہتے ہیں۔ کبھی اپنی تصویر کھینچتے ہیں۔ کبھی خود اپنے حال پر رحم آجاتا ہے :۔

ماجرای دوست پرسیدی کہ چوں بگذشت حال   ای سرت گردم چہ می پرسی بدشواری گذشت

خسرو است و شب و افسانۂ یار و ہر بار   قدری گرید و پس بر سرِ افسانہ رود

---

[۱۵] آٹھویں آسمان کے ایک ستارے کا نام ہے۔

بحر کا انتخاب کتنا اثر پیدا کر رہا ہے۔ دیکھو:—

دادِ من آں بُتِ طراز نداد　　　پاسخے تیز دلنواز نداد
خواب مارا ببست و باز نکرد　　　دلِ مارا ببُرد و باز نداد
تو چہ دانی نیاز مندی چیست　　　چوں خدایت بکس نیاز نداد

جدتِ اسلوب اتنی شوخ ہے کہ اسکی مثال سعدی کے یہاں بھی دشواری سے ملے گی۔ خیال یہ ہے کہ معشوق کی طرف سے ظلم و ستم ہوتے ہیں اور پھر بھی پیارا ہے۔ خصوصاً اگر تصوف کے رنگ میں دیکھا جائے تو بات کہاں سے کہاں جاتی ہے۔ اب ذرا غزل کی طرزِ ادا کو دیکھو:—

جاں زتن بُردی و در جانی ہنوز　　　درد ہا دادی و درمانی ہنوز
ہر دو عالم قیمتِ خود گفتۂ　　　نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

یا یہ خیال دیکھو کہ لوگ کہتے ہیں کہ تم عاشق کیوں ہوئے معشوق سے کوئی نہیں کہتا کہ وہ دلربا کیوں ہوا۔ سعدی نے یہ حالت خوب نظم کر دی ہے:—

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم　　　باید اول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

اگر بحر مناسب ہوتی تو اس سے بہتر شعر نظم کرنا دشوار تھا۔ خسرو کی جدت پسند طبیعت خود معشوق کو معترض قرار دیکے مناسب بحر میں اور جدید الفاظ میں اس خیال کا اعادہ کرتی ہے:—

جراحتِ جگرِ خستگاں چہ می پُرسی　　　زغمزہ پُرس کہ ایں شوخی از کجا آموخت

عشقِ مجازی کے واردات بھی بکثرت نظم کئے ہیں:—

تو شبینہ می نمائی بہ بر کہ بودی امشب　　　کہ ہنوز چشمِ مستت اثرِ خمار دارد

محاورات بھی نہایت برجستہ نظم ہوتے ہیں:—

گفتم ای دل مرو آنجا کہ گرفتار شوی　　　عاقبت رفت و ہماں گفتۂ من پیش آمد

نازک خیالی اور مضمون آفرینی جو ہندوستان کے حصے میں آنے والی ہے انکے کلام میں بخوبی موجود ہے :—

بہ خانۂ تو ہمہ روز بامداد بود ۔۔ کہ آفتاب تیار رشدن بلند آنجا

میروی و گریہ می آید مرا ۔۔ ساعتے بنشیں کہ باراں بگزرد

صنائع و بدائع کے استعمال کا بیحد شوق ہے اور جہاں سادگی کے ساتھ آجاتے ہیں اچھے بھی ہیں مثلاً تضاد کی مثال :—

خسرو سالے بہن کند بیداد ۔۔ اے بزرگان شہر داد دہید

من درویش را کشتی بغمزہ ۔۔ کرم کردی، الہی زندہ باشی

لیکن تعجب ہے کہ اس فن میں کمال دکھانے کے لئے ایسے صاحب ذوق سے اعجاز خسروی کی ایسی مبسوط کتاب لکھ ڈالی جس میں تمام صنائع میں طویل عبارتیں اور بکثرت اشعار ہیں اور بعض صنعتیں تو ایسی ہیں جنکا فارسی میں آنا ہی ممکن نہیں کاش اتنا وقت کسی دوسرے کام میں صرف کیا جاتا جو سب کے کام آتا۔ اب ہم بغرض اختصار یہ بیان ختم کرتے ہیں۔ کامل اور پر مغز تفصیل شعر العجم جلد دوم میں موجود ہے۔ محض ایک امر اور لکھنا لازم ہے کہ امیر صاحب نے بعض محاورات ایسے بھی نظم کئے ہیں مثلاً "از گرہ تو چہ می رود" یا "آواز کردن" (پکارنا) یا گفتار گفتن" (یوں ہی ایک بات کہدینا) یا "لاکلام کردن (ساکت کردینا) جن پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اہل زبان کے یہاں موجود نہیں۔ اگر یہ اعتراض صحیح ہے تو ہمارا مدعا ثابت ہے یعنے ہندوستان کا مخصوص فارسی لٹریچر تیار ہونا شروع ہوگیا اور علاوہ جدید تشبیہات و استعارات و عناوین و اسالیب کے محاورات و فقرات و کنایات بھی رنگ بدلنے لگے۔ اور جس طرح اردو شاعری کی ابتدا میں خسرو کا نام لیا جاتا ہے۔ اس مخصوص فارسی کے لٹریچر کا آغاز بھی

انھیں کے ذات سے بکمالِ فخر وابستہ کرتے ہیں۔ اب ہم تصانیف کی فہرست لکھتے ہیں۔ ایک ضخیم **دیوان** پانچ حصوں میں ہے (۱) تحفۃ الصغر (۱۶ برس کی عمر سے ۱۹ برس کی عمر تک کا کلام۔ (۲) وسط الحیات (۲۰ برس کی عمر سے ۴۲ برس کی عمر تک کی شاعری)۔ (۳) غرۃ الکمال (۳۴ برس سے ۴۴ برس تک کا کلام)۔ (۴) بقیۂ نقیہ (غالباً ۷۱۵ھ تک کا کلام)۔ (۵) نہایۃ الکمال (۷۲۵ھ تک کے واقعات کا ذکر ہے اور یہی خسرو کا سنِ وفات ہے) علاوہ اسکے **قران السعدین** (بغرا و کیقباد کے حال میں۔ سال تصنیف ۶۸۸ھ) **مطلع الانوار** (تصنیف ۶۹۸ھ بجواب مخزن الاسرار ۳۳۱۰ شعر)۔ **شیریں خسرو** (تصنیف ۶۹۸ھ ۴۱۲۴ شعر)۔ **ہشت بہشت** (ہفت پیکر نظامی کا جواب تصنیف ۷۰۱ھ ۳۳۸۲ شعر)۔ یہ پانچوں مثنویاں **پنج گنج خسرو** کہلاتی ہیں۔ علاوہ بریں **تاج الفتوح** (تصنیف ۶۹۰ھ جلال الدین خلجی کے حال میں)۔ **نہ سپہر** (تصنیف ۷۱۸ھ قطب الدین خلجی کے نام پر)۔ **دول رانی و خضر خاں** (دونوں کے عشق کا قصہ تصنیف ۷۱۵ھ اس میں ۴۲ شعر خود خضر خاں کے ہیں)۔ **تغلق نامہ** (غیاث الدین تغلق کے حالات میں)۔ **افضل الفوائد** (خواجہ نظام الدین اولیا کے ملفوظات)۔ **اعجاز خسروی** (صنائع و بدائع میں)۔ اور دولت شاہ نے دو اور کتابیں ذکر کی ہیں (۱) **مناقب ہند** اور (۲) **تاریخ دہلی**۔ انکے علاوہ ہزاروں اشعار برج بھاشا میں کہے جو نایاب ہیں اور عربی اشعار و عبارات بھی نہایت قابل قدر ہیں۔ پھر فن حساب و موسیقی پر بھی کتابیں لکھنے کا پتہ چلتا ہے۔ واقعی جامع ہو تو ایسا ہو۔

حسن دہلوی

حسن دہلوی۔ نان بائی کا پیشہ کرتے تھے۔ امیر خسرو کو پسند آگئے اور بیحد دوستی ہوگئی اور دونوں یکجان دو قالب معلوم ہونے لگے۔ سلطان محمد قاآن

(معروف بہ خان شہید) کے دربار میں دونوں ہمراہ تھے۔ صنعت غزل پر ان کا بھی احسان ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :—

خلق گویند دل از صبر بجا آور باز ای دل از صبر نشانے دہ اگر جائے ہست
ایکہ نظارۂ دیوانہ نکردی ہرگز قدمے رنجہ کن ایں سوئے کہ رسوائے ہست

شوخیِ طبیعت کا اندازہ دیکھو :—

دو سہ بار با تو گفتم کہ مرا بہیچ بستاں نہ شد اتفاق شاید کہ باین بہا گرانم

عراقی کی مشہور غزل کے جواب میں ایک شعر ملا ہے :—

بتقویٰ نام نیکو بُردہ بودم نکو رویاں مرا بدنام کردند

مولانا شبلی کی رائے ہے کہ "جو سوز و گداز اور جذبۂ و اثر ان کے کلام میں موجود ہے ..... امیر خسرو میں بھی نہیں"۔

جمال الدین دہلوی کا

جمال الدین دہلوی بن حسام الدین نے ایک قصیدہ محمد بن تغلق شاہ کے سامنے پڑھنا چاہا جس کا مطلع یہ تھا :—

الٰہی تا جہاں باشد نگہدار ایں جہانباں را محمد شاہِ تغلق شاہ سلطان بن سلطان را

مطلع سنتے ہی بادشاہ نے قصیدہ پڑھنے سے روک دیا اور کہا کہ میں پورے قصیدے کا صلہ نہ دے سکوں گا۔ یہ کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے گرد روپے کے توڑے نئے اوپر رکھے گئے۔ جب سر کے برابر پہونچ گئے تو انھیں عطا کر دئے گئے۔ افسوس ان کا اور کلام نہ مل سکا ورنہ لکھا جاتا اور تنقید کی جاتی۔

بدر چاچ

بدر چاچ ۔ بدرالدین نام۔ ترکستان کے مشہور شہر چاچ کا رہنے والا ہے۔ کی کمائیں مشہور رہیں۔ ہندوستان میں محمد تغلق شاہ اور دیگر سلاطین کی مدح میں عمر بسر کی۔ طرز شاعری بالکل نرالی ہے۔ استعارات غریبہ سے کلام کو اتنا مُحرّش بنا دیتا ہے کہ بعض وقت سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ تخیل بھی بالکل عجیب ہے۔

غرابے کرد ہمن اندا خت روش آن بیضہائے زر — ربودش از فضا ناگہ عقاب آتشیں پیکر
(راتے) (تارے) (آفتاب)

اسی طرح زہریات میں کہتا ہے :—

زرّیں نقاب شاہد پیروزہ پیرہن — بر داشت تار زلف سیہ از رخ سمن
ہے مہر شاہد یکہ رواں شد بہ گرد خاک — شمشیر تیز در کف و بر فرق سر فگن
گر صادقی تو عشوۂ ایں قرص خور مخور — در مرورہ روی دم ایں زن فگر مزن

خور کے لئے مخور اور زن کے لئے مزن محض لفاظی ہے۔ یہ مذاق نہ کبھی مقبول ہوا۔ نہ ہو سکتا ہے۔ بعض شعر بالکل چیستان ہیں مثلاً :—

برگیر یکے را بدو درچار ویکے کن — کز نہ نود ش جانب دو چل گذرافند[۱]

---

[۱] معنی یہ ہیں کہ مے کو جام میں ڈال تاکہ پانچوں انگلیاں دونوں لبوں تک پہونچیں۔ حل یوں ہو سکتا ہے کہ لفظ "یکے" کے عدد (۴۰) ہیں اور حرف "م" کے عدد بھی (۴۰) ہیں لہذا یکے سے مراد حرف "م" ہے۔ اسی طرح لفظ "دو" کے عدد (۱۰) ہیں اور حرف "ی" کے عدد بھی (۱۰) ہیں لہذا "دو" سے مراد ہے حرف "ی" (یکے + دو = م + ی = مے)۔ لہذا "یکے را بدو" کے معنی ہیں "مے را"۔ دوسرے جزو کا حل یہ ہے کہ چار (۴) عدد ہیں لفظ "جا" کے اور یکے سے مراد ہے حرف "م" حسب صراحت بالا۔ لہذا "چار و یکے" سے مراد ہے "جام" اور "درچار ویکے کن" کے معنی ہیں "در جام کن"۔ دوسرا مصرعہ یوں حل ہوگا کہ لفظ "نہ" کے عدد ہیں (۵۵) اور لفظ "پنج" کے عدد بھی (۵۵) ہیں لہذا "نہ" سے مراد ہے "پنج"۔ اور لفظ "نود" کے عدد ہیں (۶۰) اور لفظ "پنجہ" کے عدد بھی (۶۰) ہیں لہذا "نود" سے مراد "پنجہ" ہے اور "پنجہ" کے معنی ہیں پچاس جو حرف "ن" کے عدد ہیں لہذا "نود" سے مراد حرف "ن" ہے جس کا تلفظ "نون" ہے اور نون عربی میں مچھلی کو کہتے ہیں جو انگلی سے مشابہ ہے لہذا "نود" سے مراد "انگلی" ہے اور "نہ نود" سے مراد پانچ انگلیاں۔ لفظ "لب" میں "ل" کے عدد (۳۰) ہیں اور "ب" کے (۲) اور لفظ "دو" کے عدد (۱۰) ہیں لہذا "لب" قائم مقام (۱۰) کے ہے لہذا "دو لب" قائم مقام (۴۰) کے یعنے چہل یا چل لہذا "دو چل" سے مراد "دو لب" ہے۔ فتدبر۔

مظہر گجراتی کو صاحب مجمع الفصحا شیریں زبان اور نیکو بیان سمجھتے ہیں۔ واقعی کلام نہایت صاف ہے اور آجکل کے ایرانی مذاق سے ملتا جلتا ہے:۔ مظہر گجراتی

اگر بہار بد نیست و گر بہشت بکار | بہار من رخ تست و بہشت من دیدار
مرا چو بوے تو یابم بہار نبود دوست | مرا چو روے تو بینم بہشت نا ید کار
اگر بہار گل و سرو و یاسمن دارد | تو یاسمن بری و سرو قد و گل رخسار
خنک کسیکہ نہد بخت نیک در بر او | ز روے و موے تو ماہ منیر و مشک تتار

ان شاعروں کے عروج کی خاص وجہ یہ ہے کہ سلاطین و امرا بھی سخنگو اور سخن سنج ہوتے تھے چنانچہ دورۂ مغلیہ قائم ہونے سے پیشتر ہندوستان کے اس طبقے میں نظم و نثر کا چرچا کافی طور سے تھا۔ محمد تغلق۔ فیروز شاہ بہمنی۔ یوسف عادل شاہ۔ سلاطین شرقیۂ جونپور وغیرہ شعر کہتے تھے اور بعض نے کتابیں بھی لکھی تھیں۔ چنانچہ بعض سلاطین کے اشعار لکھے جاتے ہیں:۔

فیروز شاہ بہمنی (المتوفی ۸۲۵ھ):۔ فیروز شاہ بہمنی

در آتش مردہ فکر زائل نکنی | اندیشہ بہر خیال ہائل نکنی
ایں نقد خزینۂ دماغ است بکوش | تا صرف بجنسہاے باطل نکنی

یوسف عادل شاہ عثمانی خاندان کا ترک تھا۔ سلطان مراد کے بعد بلاد روم سے بھاگ کے ہندوستان آیا اور بہمنیوں کا اثر مٹا کے سلطنت عادل شاہی بیجاپور میں قائم کی اور وہیں ۹۱۶ھ میں انتقال کیا۔ ایک شعر اسکا اسوقت یاد ہے:۔ یوسف عادل شاہ

مرا ز بادہ بجائے فراغ ہیچ | سبو سبو دہ و خم خم۔ ایاغ ہیچ ہیچ

اسمٰعیل عادل شاہ کا تخلص وفائی تھا اور یوسف عادل شاہ کی طرح یہ بھی شاعر تھا۔ سال وفات ۹۴۱ھ۔ اسمٰعیل عادل شاہ

نظام شاہ بانی نظام شاہیۂ دکن۔ سپہری تخلص کرتا تھا۔ رنگ طبیعت نظام شاہ

ملاحظہ ہو :-

خالت خلیل و چہرہ گلستانِ آتش است | خطت سیاہیئے کہ بدامانِ آتش است
پیش رخِ تو دیدہ سپہری بہم نزد | آتش پرست ہیں کہ چہ حیرانِ آتش است

بابر بادشاہ

بابر نے سلطنت مغلیہ (تیموریۂ ہند) کا بنیادی پتھر ہندوستان میں رکھا اور شعر و شاعری کا مذاق ساتھ لایا۔ علاوہ بابر نامہ کے جو ترکی میں لکھا تھا بعض اشعار بھی مشہور ہیں۔ ایک شعر یاد ہے :-

نوروز و نو بہار و می و دلبرے خوش است | بابر بعیش کوش کہ دنیا دوبارہ نیست

ہمایوں

ہمایوں کی مصیبت کی داستان صفحات تاریخ کو آجتک حسرت ناک بنائے ہوئے ہے۔ جب شیر شاہ سے شکست کھا کے بھاگا تو شاہ طہماسپ صفوی کو یہ شعر لکھ کے بھیجے :-

خسروا عمر لیست تا عنقاے عالی ہمتم | قلۂ قافِ قناعت را نشیمن کردہ است
روزگارِ سفلۂ گندم نمائے جو فروش | طوطئ طبع مرا قانع بہ ارزن کردہ است
دشمنم شیر است و عمرے پشت بر من کردہ بود | حالیا از روے خصمی روے بر من کردہ است
دارم از شہ التماس اکنون کہ تا با من کند | آنچہ با سلمان علیؑ در دشت ارزن کردہ است

ایک رباعی اور یاد ہے جو اسی شاہ طہماسپ کو لکھی تھی :-

گشتیم بجاں بندۂ اولادِ علیؑ | ہستیم ہمیشہ شاد با یادِ علیؑ
چوں سرِّ ولایت از علیؑ ظاہر شد | کردیم ہمیشہ وردِ خود نادِ علیؑ

سلہ مشہور ہے کہ سلمان فارسیؓ پر دشت ارزن میں ایک شیر نے حملہ کیا تھا اور امیر المومنین علیہ السلام نے انکو بچایا تھا اور شیر کو قتل کیا تھا۔ صفویہ چونکہ سادات تھے اور ہمایوں تاتاری تھا لہذا یہ التماس نہایت پر لطف ہے۔ سلہ لفظی معنی ہیں "پکار علیؑ کو" کتب معتبرہ میں ہے کہ رسول مقبولؐ کو حکم الہی ایک جنگ میں پہونچا تھا کہ علیؑ کو مدد کے لئے پکارو اور الفاظ روایت یہ تھے "نادِ علیاً مظہر العجائب ۔ تجدہ عوناً لک فی النوائب ۔ کل ہم و غم سینجلی ۔ بولایتک یا علی یا علی یا علی" ارباب معرفت ابتک مصیبت میں پڑھکے خدا سے کشائش طلب کرتے ہیں —

اکبر اعظم

اکبر اعظم کا عہد عروج انشائے عجم کا زمانہ تھا۔ دربار اہل کمال سے مملو تھا اور عربی۔ فارسی۔ سنسکرت۔ برج بھاشا۔ لاطینی۔ یونانی وغیرہ کے بہترین علما اقطارِ عالم سے سمٹ کے آگئے تھے۔ خود بھی اگرچہ جاہل تھا لیکن شعر سے مناسبت رکھتا تھا۔ ایک رباعی اس کی بھی درج کی جاتی ہے :۔

دوشینہ بکوئے میفروشاں	پیمانۂ مے بہ زر خریدم
امشب ز خمار سر گرانم	زر دادم و دردِ سر خریدم

دیکھو مشہور محاورہ کتنا بے تکلف اور خوبصورت نظم ہو گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی موقع کے لئے ایجاد ہوا تھا۔ اُدھر ایران میں **شاہ عباس** تربیت اہل علم کر رہا تھا اِدھر **اکبر** اور مقابلے میں **اکبر** ہی غالب آتا تھا۔ آپس میں نوک جھونک بھی رہتی تھی۔ کسی شاعر نے شاہ عباس کی تعریف میں کہا :۔

زنگی بسنان و تیر و خنجر نازد	رومی بسپاہ و خیل و لشکر نازد
اکبر بہ خزینۂ پُر از زر نازد	**عباس** بہ ذوالفقار حیدرؑ نازد

فیضی نے اکبر کی طرف سے جواب دیا :۔

فردوس بہ سلسبیل و کوثر نازد	دریا بہ گہر۔ فلک بہ اختر نازد
عباس بہ ذوالفقار حیدر نازد	کونین بذاتِ پاک **اکبر** نازد

اکبر پر آفتاب پرستی کا الزام لگایا گیا کیونکہ دین الٰہی میں آفتاب کی خاص عظمت ملحوظ تھی۔ کسی شاعر نے اسکی تخئیلی وجہ بھی خوب نظم کی :۔

قسمت نگر کہ در خور ہر جوہر عطاست	آئینہ با سکندر و با **اکبر** آفتاب
او میکند معائنۂ خود در آئینہ	ایں میکند مشاہدۂ حق در آفتاب

بیرم خاں

بیرم خاں خانخاناں اسی دربار کا درۃ التاج تھا اور تربیت اہل کمال کا دل دادہ۔ اس کے قصائد و غزلیات کا دیوان مشہور ہے۔ ایک مطلع امیر المومنین

علیہ السلام کی تعریف اس وقت یاد ہے جس سے قوت شاعری کا کسی قدر اندازہ ہو جاتا ہے :-

شہے کہ بگذرد از نہ سپہر افسرِ او　　　اگر غلامِ علیؑ نیست خاک برسرِ او

عبدالرحیم خانخاناں

رحیمی عبدالرحیم خانخاناں کا تخلص تھا جس کا دور بیرم خاں کی معزولی کے بعد شروع ہوا۔ یہ شاعری سے مناسبت فطری لئے آیا تھا اور قدردانی اہل کمال میں سلاطین وقت سے بڑھا ہوا تھا۔ بہار ترکمانوں کا یادگار ہندوستان میں آکے "ممدوح[1] شعرا اور محسود امرا" ہو جائے۔ تفضل خدا نہیں تو کیا ہے! احمدآباد میں ایک عظیم الشان کتبخانہ اور لٹریچر میں بیش بہا اضافے آجتک یادگار ہیں۔ چند منتخب اشعار غزلوں کے لکھے جاتے ہیں۔ دیکھو کلام میں کتنا مزا ہے :-

بجرمِ عشق تو ام میکشند و غوغائیست　　　تو نیز بر سرِ بام آ کہ خوش تماشائیست
غمت مباد! چہ می پرسی از حکایتِ من　　　دلِ تو طاقتِ ایں گفتگو کجا دارد

"غمت مباد!" "خدا تجھے کوئی غم نہ دے" کتنی محبت بھری دعا ہے۔ اس کی لذت اہل ذوق سمجھ سکتے ہیں۔ ایک اور تصویر دیکھو معشوق کی نظر تڑپتے ہوئے عاشق پر پڑ جانا مآل زندگی ہے بلکہ کل محنتیں سوارت ہیں :-

بہاے خونِ من و صد ہزار ہمچو من است　　　کہ من بخون طپم و قاتلم نظارہ کند

اور "صد ہزار ہمچو من است" کا لطف تو بیان ہی نہیں ہو سکتا۔ اللہ رے محبوب کی عظمت اور شانِ بے نیازی!

حکیم ابوالفتح

حکیم ابوالفتح گیلانی (المتوفی ۹۹۷ھ) بھی خانخاناں کی طرح شعرا کا گروہ قائم کئے ہوئے تھا اور علما و فضلا کی تربیت میں مصروف تھا۔ عرفی اور حیاتی گویا اسی کے ساختہ و پرداختہ تھے اور جدید رنگ جو ہندوستان میں فارسی شعرا

---

[1] از مجمع الفصحا۔

کے لئے مخصوص ہوگیا اسی کا پھیلایا ہوا ہے۔ نثر میں سادگی کو ترجیح اسی نے دی اور رقعات چار باغ مصنفین عصر میں اس رنگ کو پھیلانے کا باعث ہوئے۔

خان زمان

خان زماں بھی امرائے دربار اکبری سے تھا اور تربیت اہل علم میں کسی سے پایہ کمی کا نہ رکھتا تھا خود بھی شعر کہتا تھا اور **سلطان** تخلص تھا۔ غزالی کو دکن سے یہ رباعی لکھ کے اور ہزار روپیہ زادراہ بھجوا کے اسی نے بلایا تھا:۔

اے **غزالی** بحق شاہِ نجف　　　　که سوے بندگان بیچوں آے
چونکہ بے قدر گشتۂ آنجا　　　　سرخود را بگیر و بیروں آے

"سرخود را بگیر" کے معنے ہیں کہ "فوراً چلا آ"۔ نیز ہزار روپیہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اسے لے لے کیونکہ غزالی کا سر یعنے پہلا حرف "غ" ہے جس کے عدد ہزار ہیں۔ غزالی نے یہاں آ کے مثنوی نقش بدیع نظم کی اور فی شعر ایک اشرفی صلہ میں لی۔ **القتی** یزدی بھی اسی کا ملازم تھا اور انعام و اکرام پاتا رہتا تھا۔

خان اعظم

خان اعظم عزیز میرزا کوکلتاش ہفت ہزاری اکبر کا برادر رضاعی تھا اور فن تاریخ اور سخن سنجی میں ید طولےٰ رکھتا تھا۔ ایک مطلع اس کا بھی یادگار ہے:۔

گشت بیمار دل از رنجِ غمِ تنہائی　　　　اے طبیبِ دلِ بیمار چہ میفرمائی

یہاں بھی نکتہ سنجوں کا مجمع رہتا تھا۔ بدخشی وفہمی وغیرہ اسی دربار کے منوسلین میں سے ہیں بلکہ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ فیضی اور ابوالفضل اسی کی سفارش سے داخل دربار ہوئے۔

اب ہم دربار اکبری کے مخصوص اہل کمال کا حال درج کرتے ہیں تفصیل انشاء اللہ آئندہ علیحدہ کتاب میں دیجائیگی کیونکہ ہندوستان میں جو کچھ فارسی لٹریچر میں شائع ہوا ہے اُس کی تاریخ مستقل طور سے لکھنے کا ارادہ ہے۔

فیضی

فیضی فیاضی یمنی الاصل تھا۔ اسکے دادا ناگور میں آئے اور ایک عربی النسل
خاندان میں شادی کی جس سے شیخ مبارک پیدا ہوئے فیضی ان کا بڑا بیٹا ہے (ولادت
۹۵۴ھ) باپ خود صاحب کمال تھے اور چار جلدیں تفسیر قرآن کی تفسیر کبیر کے
انداز پر لکھی تھیں جس کا نام منبع العیون ہے۔ بیٹا بھی کمالات میں باپ سے کم
نہ نکلا اور علوم متداولہ میں دستگاہ کامل پیدا کی۔ فن شعر بظاہر خواجہ حسین مروی[1] سے
سیکھا تھا۔ ابتدائی زمانہ اپنے والد اور دونوں بھائیوں ابوالفضل اور ابوالخیر کے ساتھ
نہایت صعوبت میں گذرا۔ ان لوگوں پر کبھی مہدوی ہونے کا الزام تھا کبھی شیعہ
ہونے کا۔ عبدالنبی اور مخدوم الملک اپنے تعصب مذہبی کی وجہ سے انھیں بیحد
ستاتے رہے[2] آخر شیخ مبارک کا کمال بااثر ہوا اور چند امرائے دولت اس خاندان کے
طرفدار ہوگئے۔ بادشاہ سے سفارش کی اور ۹۷۴ھ میں بڑے احترام سے شیخ مبارک اور
ابوالفیض فیضی حاضر دربار ہوئے اور رفتہ رفتہ اتنا رسوخ ہوگیا کہ دونوں متعصب دشمنوں
کو پست کر دیا۔ فیضی کو طبابت اور شاعری کا شوق تھا اور علمی مشاغل کی وجہ سے
کوئی سرکاری کام لینا نہیں چاہتا تھا مگر پھر بھی بچ نہ سکا۔ شہزادہ دانیال کا معلم
ہوا۔ پھر آگرہ۔ کالنجر اور کالپی کا صدر رہا۔ ۹۹۶ھ میں ملک الشعرا کا خطاب پایا۔
عجب اتفاق تھا کہ خطاب ملنے سے دو چار دن پیشتر کہہ چکا تھا:۔

آں روز کہ فیضِ عام کردند　　مارا ملک الکلام کردند
از بہر صعودِ فکرت من　　آرائشِ ہفت بام کردند
مارا بہ تمام در ربودند　　تا کارِ سخن تمام کردند

---

[1] علاء الدین سمنانی کے خاندان سے تھے معقولات مولانا عصام سے اور منقولات علامہ ابن حجر مکی سے پڑھے تھے۔ اکبر کے حکم سے سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ نظم کرنا شروع کیا تھا کہ ۹۷۶ھ میں انتقال ہوگیا۔

[2] تفصیل کے لئے شعرالعجم جلد سوم دیکھو۔

ایک سال بعد بادشاہ کے ہمراہ کشمیر گیا اور قصیدۂ کشمیر یہ نظم کیا جسکا مطلع یہ ہے:-

ہزار قافلۂ شوق میکند شبگیر — کہ بار عیش کشاید بخطۂ کشمیر

سنہ ۹۹۹ھ میں ممالک دکن کی طرف بطور سفارت گیا اور اپنے خدمات نہایت قابلیت سے انجام دیئے۔ سنہ ۱۰۰۱ھ میں واپس آیا اور بادشاہ کے اصرار سے خمسۂ نظامی کا جواب نظم کرنا شروع کیا چنانچہ خود کہتا ہے :-

"اسامیِ کتب خمسہ این است - اول مرکز ادوار کہ اکثرے در نتجور گفتہ شد - دوم سلیمان وبلقیس کہ پیش ازیں ہفت سال در لاہور بنیاد کردہ بود - سوم نل دمن کہ تمام شد - چہارم ہفت کشور کہ در احوال ہفت اقلیم گفتہ خواہد شد - پنجم اکبر نامہ کہ آں ہم جستہ جستہ وقتے گفتہ بود"

ان میں سے دو کتابیں نل دمن اور مرکز ادوار تمام ہوگئیں اور ابوالفضل کا دعویٰ ہے کہ سب پوری ہوگئیں۔ علاوہ بریں عربی میں سواطع الالہام قرآن مجید کی بے نقط تفسیر لکھی۔ انشائے فیضی کو اُسکے بھانجے نورالدین محمد عبداللہ نے جمع کیا اور لطیفۂ فیضی نام رکھا۔ ایک دیوان غزلیات وغیرہ کا طباشیر الصبح نام چھوڑا اور ایک دیوان غیر مکمل مقاصد الشعرا تذکرۂ شعرا میں لکھنا شروع کیا تھا معلوم نہیں کہ کیا انجام ہوا۔ مہابھارت[1] کے دو فن فارسی میں ترجمہ کئے۔ لیلاوتی حساب میں ہے۔ اس کا ترجمہ بھی فارسی میں کیا۔ اسکے علاوہ اور کتابیں بھی تصنیف کی ہیں جن کی تفصیل نہیں معلوم۔ صاحب مآثر الامرا نے تعداد تصنیفات ایک سو ایک لکھی ہے۔

---

[1] رامائن کا ترجمہ جو فیضی کی طرف منسوب ہے مولانا شبلی کے نزدیک بدایونی نے نثر میں ترجمہ کیا اور مسیحائی پانی پتی نے بعد کو اُسے نظم کر ڈالا۔

غرض یہ صاحب کمال ضیق النفس میں مبتلا ہوا جیسا کہ خود کہتا ہے :-

دیدی کہ فلک بمن چہ نیرنگی کرد   مرغ دلم از قفس شب آہنگی کرد
آں سینہ کہ عالمے درو می گنجید   تا نیم نفس برآورم تنگی کرد

بیماری روزانہ بڑھنے لگی اور فیضی کو زندگی سے مایوسی ہوگئی۔ کہا کرتا تھا :-

گر ہمہ عالم بہم آید بجنگ   بہ نشود پائے یکے مور لنگ

آخر صفر ۱۰۰۴ھ میں انتقال کرگیا۔ تخلص اس کا فیضی بھی تھا اور فیاضی بھی
چنانچہ خود کہہ گیا ہے :-

زیں پیش کہ سکہ ام سخن بود   فیضی رقم نگیں من بود
اکنوں کہ شدم بعشق مرتاض   فیاضی ام از محیط فیاض

فیضی ایک عالم آدمی تھا اور عالمانہ زندگی بھی بسر کرتا تھا۔ عبدالقادر بدایونی کو
اس سے بیحد عداوت تھی مگر فضل و کمال کا قائل تھا۔ لکھتا ہے کہ فیضی

"درفنون جزئیہ از شعر و معما و عروض و قافیہ و تاریخ و لغت و طب
والنشا عدیل در روزگار نداشت"

نثر میں سادہ نویسی مرغوب تھی اور مطالب کو تکلفات و تصنعات
کے پھندے میں نہیں پھنساتا تھا۔ نظم میں قوت خداداد تھی خصوصاً
غزلیں اور مثنویاں لاجواب تصنیف کی ہیں نل دمن کے بارے میں
بدایونی کی رائے باوجود مخالفت و عصبیت کے یہ ہے :-

"در الحق مثنوی است کہ دریں سہ صد سال مثل آں بعد از
امیر خسرو شاید در ہند کسے دیگر نگفتہ باشد"

فخریہ، عشقیہ اور فلسفیہ مضامین جس جوش میں نظم کرتا ہے وہ اُسی کے لئے مخصوص ہے[1]
نل دمن میں جس شان کا فخریہ لکھا ہے مشکل سے وہ انداز بیان اور شکوہ و دبدبہ دوسرے
مقام پر ملے گا۔ بعض اشعار ملاحظہ ہوں :-

امروز نہ شاعرم حکیمم ۔۔۔ دانندۂ حادث و قدیمم
ہر موی زمن تمام گوش است ۔۔۔ خاموشی من لب پرخروش است
تا تازہ و تر زنم رقم را ۔۔۔ در بادہ کشیدہ ام قلم را
ایں شیشہ نہادہ ام برآں طاق ۔۔۔ کانجا نرسیدہ دست عشاق
ایں بادہ کہ جوشد از ایاغم ۔۔۔ خونیست چکیدہ از دماغم
صد دیدہ بورطۂ دل افتاد ۔۔۔ کیں موج گہر بہ ساحل افتاد

اسی زور میں پورے چار ہزار شعر کی مثنوی کہی ہے اور ہر مقام پر ایک ہی جوش اور سرشاری ہے۔ عشق کی بیماری کا علاج کرنے ایک شخص آیا ہے۔ مریض کہتا ہے:-

نشتر چہ زنی رگ جنوں را ۔۔۔ آگاہ نۂ تپ درون را

یہ معلوم ہوتا ہے کہ طبیب کی تشخیص اگر باطل کر سکتا ہے تو مریض عشق اور وہ بھی اہل عشق کے وادی میں ورنہ صوفیہ کے شعرا سے اس کا رنگ بالکل جدا ہے۔ یہاں پاکبازی کے جوہر ہیں اور حسن ازل کے ساتھ روابط۔ یہ تغزل و حقیقت در افسونست

---

[1] خسرو اور فیضی وہ ہی شخص ہندوستان ایسے نظر آتے ہیں جن کے کمال کا اعتراف ایرانیوں نے بھی کیا ہے۔ صائب کہتا ہے :-
ایں آں غزل کہ فیضی شیریں کلام گفت ۔۔۔ خود در دیدہ ام خلیدہ و در دل نشستہ است
علی نقی کمرہ کہتا ہے :-

مرا افگند بہ نظم امورم پرتو فیضی ۔۔۔ ابوالفیض آں گزین اکبر و شیخ کبیر من
اگر ہستم حجیر اندر سخن او ہست خاقانی ۔۔۔ وگر من منجیر آستانش او مجیر من
کی ام با او رسد در شاعری دعوی ہم چشمی ۔۔۔ کہ در ایں خانقاہم من مرید او ست پیر من

اور فلسفہ کا مجموعہ ہے اور زورِ کلام تلدمن سے زائد۔ مثلاً منزلِ تسلیم میں آکے شکوۂ و شکایت کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور مصائب یہ سمجھ کے جھیلے جاتے ہیں کہ ہماری ترقیِ مدارج انھیں امتحانات پر منحصر ہے۔ مصیبت اور زحمت وہ آگ ہے جو نفسِ انسانی کو تپا کے طلائے خالص بنا دے گی۔ یہ مصائب خود خدائے پاک نے ہمارے امتحان کے لئے نازل کئے ہیں۔ یہ مصیبت نہیں بلکہ عینِ رحمت ہے۔ دیکھو کس شان سے کہتا ہے :—

روے کشادہ باید و پیشانئ فراخ — آنجا کہ لطمہائے یداللہ میزنند

خدا کے ہاتھ کے طمانچے ۱۲

ایک اور غزل میں کہتا ہے :—

عشق تا پائے بیفشرد در اندیشۂ ما — ہمہ معشوق شد او و زرگ و ریشۂ ما

از تفِ بادۂ ما بال ملائک بگداخت — وائے آں روز کہ برقے جہد از شیشۂ ما

دیکھو روزِ الست کی کیفیت کا انجامِ کار سے کتنا نفیس تقابل ہے۔ شکوہِ نظم اور سلاست زبان اتنے نازک مسائل کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے کہ شاید دوسری حیثیت میں عالم ہی بدل جائے۔ "ہمہ اوست" کا رنگ ملاحظہ ہو :—

عجب ترا ز دلِ فیضی ندیدہ ایم طلسم — کہ ہم گہر بود و ہم محیط و ہم غواص

مصائبِ عشق کا فلسفہ بیان کرتا ہے کہ یہ درد خود مصیبت خیز ہے اور اسکے توسط سے جو بلائیں آتی ہیں وہ بھی عاشق پر موثر ہوتی ہیں اور دوسری زحمتوں سے اس کا تعلق ہٹ جاتا ہے لہذا عاشقِ صادق کا اُدھر خیال ہی نہ جانا چاہئے :—

در دشتِ آرزو نبود بیم دام و دو — راہے است ایں کہ ہم ز تو خیزد بلائے تو

"بارِ امانت" اٹھانے کا تہیہ کرتا ہے تو خود عشق سے مدد کا جویا ہوتا ہے اور اسی کی برکاتِ روحانی اور اجازت سے فیض پاتا ہے :—

اے عشق! رخصتے است کہ از دوشِ آسماں — بر دوشِ خود نہم علمِ کبریائے تو

اجازت ۱۲

چند شعر اور مختلف مضامین کے سنو اور غور کرو کہ اس کی طبیعت کتنی جدت آفرین ہے۔ دوسرے بھی "عشق اول در دلِ معشوق پیدا میشود" کہہ چکے ہیں اور رسم پرستی کو منع کر چکے ہیں:۔

گر نہ لیلی ہوسِ ہمرہیِ مجنوں داشت — ناقہ را بیہدہ در راہ گرانبار چہ کرد

آنکہ می کرد مرا منعِ پرستیدنِ بت — در حرم رفتہ طوافِ در و دیوار چہ کرد

عشق صبر و خرد و ہوش ز فیضی بربود — و ز دِ رہ بیں کہ بآں قافلہ سالار چہ کرد

ہوس پرستی کا رنگ اسکے یہاں نہ ڈھونڈھنا۔ یہ عالم حقیقت میں سراسیمہ پھر رہا ہے اور مجازات سے کوسوں دور پہونچگیا ہے۔ ہاں کیفیاتِ عالمِ فانی بھی کبھی بیان کر دیتا ہے اور لطفِ ادا کو باقی رکھتا ہے بلکہ نیچرل مضامین کو خوش سلیقگی کی وجہ سے وہی جامہ پہناتا ہے جو نیچر کے موافق ہے۔ احمد آباد کے حالات نظم کئے ہیں:۔

منم کہ کشتۂ گجراتیانِ بیدادم — خرابِ عشوۂ خوبانِ احمد آبادم

سہی قدے ز سرِ ناز جلوۂ بنمود — کہ ہمچو سایہ بدنبالِ آں بیفتادم

بہر طرف کہ خرامید سروِ آزادے — غلامِ او شدم و خطِ بندگی دادم

چو رشکِ گلشنِ فردوس احمد آباد است — از و بیاد ا بروئے گلشنِ چوں آدم

مرثیہ کا رنگ بھی مذاق سلیم کے موافق ہے۔ اپنے تین برس کے بچے پر بین کرتا ہے:۔

اے روشنیِ دیدۂ روشن چگونۂ — من بے تو تیرہ روز، تو بے من چگونۂ

ماتم سرا است خانۂ من در فراقِ تو — تو زیرِ خاک ساختہ مسکن چگونۂ

بر خار و خس کہ بستر و بالینِ خوابِ تست — اے یاسمین عذار سمن تن چگونۂ

فیضی کے کلام میں خسرو کی طرح سے مخصوص محاورات و خیالات پائے جاتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی لٹریچر ہندوستان کے ماحول میں اپنے ارتقا کے راستے پیدا کرکے ایک دوسری صورت حاصل کرنے والا ہے۔

عرفی

عرفی جمال الدین سید محمد بن زین الدین علوی شیراز سے سید ھا فیضی کے پاس آیا اور رہنے سہنے لگا۔ پھر کچھ ناراض ہوگیا اور حکیم ابوالفتح گیلانی سے دوستی پیدا کی اور علمی مباحثات کا یہ اثر ہوا کہ خوش گوئی اور خوش فکری میں روز بروز ترقی کرنے لگا۔ ابوالفتح کے انتقال کے بعد خانخاناں کی صحبت میں داخل ہوا اور بڑے بڑے انعام حاصل کئے مگر طبیعت میں خودداری اس قدر تھی کہ بیجا خوشامد اور چاپلوسی سے کراہت کرتا تھا۔ صاحب مآثر رحیمی لکھتے ہیں کہ "ہندوستان کے درباروں میں تسلیم و کورنش وغیرہ کا طریقہ جاری ہے اور ہر شخص پر اُس کی پابندی لازم ہے مگر عرفی نے کبھی اس کا خیال نہ کیا۔ جس طرح جی چاہا محفل امرا میں گیا اور سب نے اُس کی خاطر کی" شہزادہ سلیم سے بیحد محبت تھی مگر جب کوئی قصیدہ اُسکی بلکہ اکبر کی تعریف میں نظم کیا تو اپنی تعریف کے اشعار بھی شامل کر دئے تاکہ فی الجملہ مساوات قائم رہے۔ اگر کبھی کچھ ابوالفتح یا خانخاناں سے طلب کیا تو یہ کہہ کے کہ صلۂ دوستی طلب کرتا ہوں نہ کہ صلۂ شعر۔ یہی وجہ ہے کہ سوائے ان دو ممدوحوں کے یا چند قصائد جہانگیر و اکبر کی تعریف میں نظم کئے ہیں یا بزرگانِ دین کی تعریف میں۔ جہانگیر سے محبت کا شہرہ اس قدر ہوا کہ ۹۹۹ھ میں حاسدوں نے زہر دیکے اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا اور زیادہ سے زیادہ ۳۶ برس کی عمر پاکے لاہور میں پیوندِ خاک ہوگیا۔ چند روز بعد ایک فقیر قبرستان میں آکے اسکی ہڈیاں اپنے بھائی کے صندوقے میں نکال لے گیا اور نجف میں دفن کر دیا۔ عرفی نے ایک قصیدے میں امیر المومنین علیہ السلام سے عرض کیا تھا:۔

بکاوش مژہ از گور تا نجف بروم　　　اگر بہند ہلاکم کنی وگر بہ تتار

عجیب اتفاق ہے کہ ہند میں انتقال ہوا اور قبر سے ہڈیاں نکل کے نجف گئیں۔ اسی خلوص اور حسن اعتقاد پر نظر رکھ کے مُلّا رونقی ہمدانی نے اس واقعے کی تاریخ نظم کی جس میں اس شعر کی طرف بھی اشارہ کیا ہے:۔

بیگانہ گوہرِ دریائے معرفت عرفی — کہ آسماں پئے پروردنش صدف آمد
بکاوشِ مژہ از گور تا نجف بروم — زدہ است تیرِ دعائے کہ بر ہدف آمد
رقم زد از پئے تاریخ رونقی کلکم — بکاوشِ مژہ از [۹۹۹] گور تا نجف آمد

فنِ شعر کے متعلق عرفی کے حاسدوں کی کوئی انتہا نہیں۔ صاحبِ آتشکدہ اگرچہ ناراض ہیں مگر اتنا ضرور کہتے ہیں کہ

"الحق در مراتب کمالات گوے سبقت از معاصرین ربودہ ....
در قصیدہ ہرچند طریقۂ تازہ کہ خارج از طریقۂ شعرائے سابق بود
اختیار کردہ واقعاً بسیار خیالاتِ خوب و عباراتِ مطلوب دارد"

ایک اور صاحب مثنوی اور قصیدے میں گرائے دیتے ہیں اور غزل میں استاد مانتے ہیں :—

عرفی ما در غزل استاد بود — خانۂ خراب و دہ اش آباد بود
مثنویش رنگ فصاحت نداشت — کانِ نمک بود و ملاحت نداشت

صاحب مجمع الفصحا نے بالکل متروک کر دیا کہ "سیاقِ اشعارش پسندِ اہلِ عہد نیست"
لیکن قبولِ عام ایسی چیز ہے کہ بدایونی ایسے دشمن نے بھی اعتراف کیا ہے کہ
"اس کا کلام گلی گلی اور کوچے کوچے میں کتب فروش بیچتے پھرتے ہیں
اور اہلِ عراق و ہند تبرکاً لیتے ہیں"

مخالفین میں ابو الفضل کی تنقید پُرمغز ہے اور ہر فقرہ غور کے قابل ہے :—
"شنا سنگی از ناصیۂ گفتارِ او می تابد و فیض پذیری از سخن او ہویدا۔
از کوتاہ بینی در خود نگریست بہ پاستانیان زبانِ طنز کشود و غنچۂ
استعدادِ او نشگفتہ پژمرد"

ممکن ہے کہ عرفی کی جوانا مرگی نے اُس حد تک کامل الاستعداد نہ ہونے دیا ہو

جو ابوالفضل کو مطلوب ہے۔ اور بعض مخالفین کے خیال کے موافق "استعارہ خنک" کا عیب بھی باقی رہ گیا ہو لیکن ذوقِ فطری اور قوت خدا دادنے جو معراج اس دور کے شعراء میں اسکے کلام کو دی ہے شاید دوسرے کو نصیب نہ ہو سکی۔ استعارات و تشبیہات جدیدہ بکثرت پیدا کئے جن سے زبان کو وسعت ہوئی اور اسکے مخصوص فلسفیانہ خیالات کے ادا کرنے کے قابل ہوئی۔ مثلاً ایک قصیدۂ نعتیہ میں نعمتوں کو خضر کہدیا ہے۔ یہ تشبیہ "خنک" سمجھی گئی ہے اور ہو بھی سکتی ہے کیونکہ وجہ شبہ لطافت کے لئے بظاہر کافی نہیں ہے۔ رسول اللہ صلعم سے مخاطب ہو کے کہتا ہے:—

اے آب حیات ازلبِ تو خضرِ نعم را ۔۔۔ من ہم بخجالت لب خجلت نکشایم

حالت یہ ہے کہ عرفی کو گناہ بخشوانا ہیں اور گناہ "ہلاکت معنوی" ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ رسول اللہ صلعم کی برکت سے حیات ابدی ملجائے مگر گناہوں کی زیادتی دیکھ کے ایسا شرمندہ ہوتا ہے کہ براہ راست درخواست بھی نہیں کرسکتا۔ مجبوراً فقیرانہ بھیس بدل کے صدا لگاتا ہے کہ اے ممدوح تیری بارگاہ ایسی جان بخش ہے کہ نعمتہائے ہدایت و رسالت بھی حیات ابدی حاصل کرنے کے لئے تیرے لبوں تک آئی ہیں اور یہ ادعا صحیح بھی ہے کیونکہ آپ خاتم الانبیا تھے اور آپکی شریعت ابدالآباد تک باقی رہنے والی ہے۔ اب اس سے بہتر تشبیہ کیا ہو سکتی ہے کہ خضر نے باوجود قوتِ نبوت و ہدایت آب حیات کو پیا اور حیاتِ جاوید حاصل کی مگر شریعت کو حیات جاوید وہاں بھی نہ ملی۔ یہ اُسوقت نصیب ہوئی جب تیرے لبوں سے احکام الٰہی جاری ہوئے۔ لہٰذا ان نعمتوں کو اس زمانے کا خضر کہنا چاہیئے۔ اب عرفی یہ صدا لگاکے خاموش ہوجاتا ہے۔ کریم خود سمجھ سکتا ہے کہ سائل حیاتِ ابدی مانگتا ہے اگرچہ ہلاکت معنوی میں گرفتار ہے۔ ممکن ہے کہ بعض لوگ

جنبش و یدے اور آبِ حیات عرفی کو بھی مل جائے۔

اسی سلسلے میں ایک امر اور یاد رکھنے کے قابل ہے۔ وہ یہ ہے کہ عرفی امراء سلاطین کی مدح کے موقع پر خودداری بہت برتتا ہے لیکن بزرگانِ دین کے مقابلے میں انتہائے لجاجت اور ادب کا لحاظ رکھتا ہے۔ یہاں الفاظ بھی دوسرے ہو جاتے ہیں، خیالات بھی دوسرے۔ خانخاناں اور ابو الفتح سے ہر موقع پر برابری کا دعویٰ ہے۔ مگر بزرگانِ دین کے سامنے بے ادبی سے کوسوں دور ہے۔ اسی قصیدے میں کہتا ہے:-

عرفی مشتاب ایں رہِ نعت است نہ صحراست آہستہ! کہ رہ بر دَمِ تیغ است قدم را

عرفی! دوڑ کے نہ چل! یہ نعت کا راستہ ہے! صحرا نہیں (اہلِ دنیا کی مدح اسکے نزدیک صحرا نوردی ہے جنگل کی سیر کرتا جی بہلاتا ہوا چلتا ہے) اور یہاں سنبھل جا! کہ قدم تلوار کی دھار پر پڑ رہے ہیں! کیونکہ انکے فضائل و محامد فہمِ انسانی سے باہر ہیں، معلوم نہیں کہ واقعی مدح کا حق ادا ہو رہا ہے یا معاذ اللہ! میری تعریف منقصت کی حد تک پہونچ گئی ہے۔ کہتا ہے:-

ہشدار! کہ نتواں بیک آہنگ سرودن نعتِ شہِ کونین و مدیحِ کی و جم را

آگے بڑھ کے کہتا ہے:-

ہر گاہ کہ در مدحِ بلغزم تو ببخشائے کز مدح ندانم من حیراں شدۂ ذم را

شوکتِ الفاظ اور بلندیِ مضامین میں سلاست و عذوبت کا لحاظ رکھتے ہوئے متقدمین سے بلند نظر آتا ہے اور آسمان کے تارے توڑ لاتا ہے۔ خاقانی کے جواب کا مشہور قصیدہ دیکھو اور موازنہ کرو کہ عرفی کس عالم کی سیر کر رہا ہے:-

دلِ من باغبانِ عشق و حیرانی گلستانش ازل دروازۂ باغ و ابد حدِ خیابانش

اسی وجہ سے فیضی کو اسکے بارے میں کہنا پڑا کہ "بہ بلندیِ وفورِ قدرت و ایجادِ معانی

"وبماشیہ الفاظ وسرعت فکر و دقّتِ نظر کسے راچوں او ندیدہ و نشنیدہ" بعض تشبیہیں خاص طور سے ایک مضمون پر مسلسل نظم ہوئی ہیں اور اُن میں حقائق و معارف کے دریا بہا دیئے ہیں۔ مثلاً یہ مسئلہ نظم کرتا ہے کہ مسرتِ عید واجب آتی ہے تو امیر و غریب سب کے لیئے یکساں ہوتی ہے بلکہ شاید صاحبِ عسرت کو زیادہ حظ آتا ہے۔ تمثیل واقعاتِ عالم میں ڈھونڈھتا ہے اور "عید" کا دن اس خیال کے ادا کرنے کے لیئے موزوں نظر آتا ہے۔ شبِ عید بادشاہ اپنے بسترِ مکلف و نرم پر سوتا ہے اور فقیر اپنے ہاتھ تکیہ کی جگہ رکھے ہوئے فرشِ خاک پر یا کنکروں پر گہری نیند سوتا ہے اور دونوں اپنے بستر کو "تکیہ گاہ ناز و نعیم" پاتے ہیں۔ صبح اٹھ کے بادشاہ بھی آرائش و زیبائش کرتا ہے اور فقیر بھی ذرا اپنی ٹوپی جھاڑ کے ترچھی پہن لیتا ہے اور دونوں اپنے اپنے حال میں مطمئن اور مسرور نظر آتے ہیں۔ دیکھو کس لطافت سے یہ مسئلہ حل ہو گیا۔ کہتا ہے :—

صباحِ عید کہ در تکیہ گاہ ناز و نعیم — گدا کلاہِ نمد کج نہاد و شہ دیہیم

اسی طرح اور قصائد بھی مسلسل نظم کئے ہیں اور بڑے بڑے دقیق مسائل حل کئے ہیں۔ یہ طرز اور مقبول بھی ہوئی اور مطلوب بھی۔ عبد الباقی اس کے معاصر کی رائے ہے :—

"مخترع طرزِ تازہ ایست کہ الحال در میانۂ مستعدانِ اہلِ زمان معروف است و سخن سنجان تتبع او می نمایند"

زورِ تخیل اسے نئے نئے محاورے ایجاد کرنے پر مجبور کرتا ہے کبھی "یوسف زار" کہتا ہے کبھی "نشتر خیز" کہیں "حسن آباد" نظم کرتا ہے کہیں "رمز فروش" کہیں کیا کرے اور کیونکر قوت کلام میں پیدا کر کے اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ استعارے تشبیہیں۔ بندشیں عجیب اور غیر مانوس بھی ہو جاتی ہیں مگر شیرینیِ کلام

سب کو سنبھالے ہوئے ہے۔ یہ سب کمالات سہی مگر عرفی کو خود قصیدے سے دلچسپی نہیں۔ کہتا ہے :۔

قصیدہ کار ہوس پیشگاں بود عرفی   تو از قبیلۂ عشقی وظیفہ ات غزل است

غالباً اس سے امرا و سلاطین کی مدح سرائی مقصود ہو کیونکہ "ہوس پیشگی" سے بزرگان دین کی مدح اور وعظیات مستثنیٰ ہیں اور یہیں عرفی کی عظمت مخصوص نظر آتی ہے۔ ایک قصیدہ میں کہتا ہے :۔

گر مردی ہمتی ز مروت نشاں مخواہ   صد جا شہید شو و دیت از دشمناں مخواہ

اس قصیدے کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کامل الاخلاق انسان ہونے کیلئے اس کا فلسفۂ اخلاق کتنا بلند ہے اور کتنی فلسفہ زا طبیعت پائی ہے۔ اسی طرح ایک اور قصیدہ ہے جس کا مطلع یہ ہے :۔

عادت عشاق چیست محفل غم ساختن   حلقۂ شیون زدن ماتم ہم داشتن

اسکے پڑھنے سے اور خاقانی کا قصیدہ "درست عشاق چیست برگ عدم ساختن" کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فلسفۂ تصوف میں کس کی عمیق فکر ہے اور کس کی لطیف؟

صلح کل کا مشرب اس عالم میں آکے عرفی کو اتنا پسند ہے کہ کہتا ہے :۔

ہم ز غبار کنشت عطر کفن ساختن   ہم بہ تبرا زدے دیر سنگ حرم داشتن

خامہ تبرا شی ستم نامہ خراشی گناہ   سادہ و بے لوح زخم بر لوح قلم داشتن

اب ہم قصائد کی تفصیلیں ترک کر کے غزل کی طرف آتے ہیں۔ یہاں بھی جدت پسند طبیعت علیحدہ راستے پیدا کرتی ہے۔ ذوق عرفان کے مزے لینے والا حقیقت و مجاز دونوں رنگوں میں یکتائی کا دم بھر رہا ہے۔ دیکھو کیا کہتا ہے :۔

در دل ما غم دنیا غم معشوق شود   بادہ گر خام بود پختہ کند شیشۂ ما

عالم مجاز کی سیر کا انداز ذیل کے چند اشعار سے معلوم ہو جائے گا کہ صفوۂ دور

کی مسابلہ بندی سے کتنا بلند ہو گیا ہے :-

یارب تو آنگہ وا نہ دلِ خلوتیاں را کاں غنچہ مست ست و در صومعہ باز است
چو برد پیام قاصد کنم ایں خیال و گریم کہ برش حکایت من بکجا رسیدہ باشد
آں چناں مستِ جمال است کہ شب تا بسحر می کشد جام و ز کیفیت مے آگہ نیست

حقائقِ معرفت میں تو وہ امتیازی جگہ حاصل کر لی ہے کہ ہمعصروں میں نظر ہی نہیں آتی۔ چند اشعار اس رنگ کے بھی سنو :-

دو عالم سوختن نیرنگِ عشق است شہادت ابتدائے جنگِ عشق است
دماغ آشفتۂ داریم دل نام کہ سر تا پائے صلح و جنگِ عشق است

اے اجل اجان نہ ہند اہلِ وفا سعی مکن یا برو۔ رخصتِ آں غمزۂ خونخوار بیار
تا چند بز نجیرِ خرد بند تواں بود بے مستی و آشوبِ جنوں چند تواں بود
طغیانِ نازبیں کہ جگر گوشۂ خلیل در زیرِ تیغ رفت و شہیدش نمی کنند

حقائق کا علم حاصل نہ ہونا اہلِ تصوف کے یہاں کا مشہور مضمون ہے اور ہر شخص نے اپنے اپنے رنگ میں یہ مشکل پیش کی ہے۔ عرفی کی طرز ادا دیکھو :-

حدِ کنہ تو بہ ادراک نشا ید دانست ویں سخن نیز باندازۂ ادراکِ من است

حق الحقائق تک فلسفۂ و منطق نہیں پہونچا سکتے اور نہ رسم پرستی اُن حدوں کے نزدیک جاتی ہے۔ ہاں! عارف کا دل کچھ دیکھتا ہے :-

فقیہاں دفترے را می پرستند حرم جویاں درے را می پرستند
برافگن پردہ تا معلوم گردد کہ یاراں دیگرے را می پرستند

ساکنِ کعبہ کجا دولتِ دیدار کجا ایں قدر ہست کہ در سایۂ دیوار ہست
دہ عنانِ تعلق بدست ہر ذرہ برآر دستے و بر دوشِ آفتاب انداز

عشق اگر مردست مردے تاب دیدار آورد ۔۔۔ ورنہ چوں موسیٰ بسے آورد و بسیار آورد

دلم بقبلۂ اسلام مائل افتادست ۔۔۔ صنم تراشِ من از کفر غافل افتادست

دیکھو! اس آخری شعر کو اور غور کرو کہ کس شان کی تصویر ہے - اہل معرفت کو رسم پرست اسلام سے منحرف کہتے ہیں - عرفی کہتا ہے کہ منزل مقصود حق الحقائق ہے اسلام بھی اُسی کو قبلہ بنائے ہے اور میرا دل بھی - دونوں دو مقاموں سے متحرک ہو کے بخطِ مستقیم یا غیر مستقیم مرکز کی طرف جا رہے ہیں "راستے اکثر جدا ہیں حسرت دل ایک ہے" اب ایک جانب سارا اسلام ہے اور اُس کے رواسم وجزئیات اور ایک طرف تنہا عاشق کا دل مگر وہی دل جو پہلے رسم پرستی کی طرف مائل تھا اور اب یہ سمجھا کہ سارے رسم و رواج میرے ہی ساختہ و پرداختہ ہیں پھر ان کی پرستش کے معنی یہ ہیں دل ہی صنم پرست ہے اور دل ہی صنم تراش - لہذا رسم پرستی کفر ہے اب میرا صنم تراش کفر کو ترک کر کے اسلام کے مقابل آ گیا ہے

مثنوی کے متعلق اتنا کہنا ہے کہ معمولی سا مطلع یہ ہے :-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔۔۔ موج نخست است زبحر قدیم

آزاد بلگرامی کہتے ہیں کہ بجائے "موج" کے "مد" کہتا تو خوب تھا - سبحان اللہ ! پھر فرماتے ہیں کہ "فقیر ہم مصراعے برائے بسم اللہ بہم رسانده ام ؎

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔۔۔ تیغ سیہ تاب رسول کریم"

فیصلہ اہل ذوق پر چھوڑا جاتا ہے - ببیں تفاوت از کجاست تا بکجا -

نثر میں ایک رسالہ نفسیہ لکھا تھا جو دستیاب نہیں ہوتا -

غزالی ۔۔۔ غزالی مشہدی کا مختصر حال خان زماں کے سلسلے میں ہو چکا ہے - اکبر کے دربار میں ملک الشعرا ہوا اور ۹۸۰ھ میں انتقال کر گیا - فیضی نے صوری و معنوی تاریخ کہی ہے :-

قدوۂ نظم غزالی کہ سخن — ہمہ از طبع خداداد نوشت

عقل تاریخ وفاتش بدو طور — سنۂ نہصد و ہشتاد نوشت

ابوالفضل کی رائے ہے کہ "بہ بلند فہمی و شیوا بیانی طراز یکتائی داشت و از دلآویز گفتار صوفیہ بہرہ مند" ایک شعر اس وقت یاد ہے جس میں دنیا کی چند روزہ زندگی کی بے مثل تمثیل دی ہے:—

شورے شد و از خواب عدم دیدہ کشودیم — دیدیم کہ باقیست شب فتنہ غنودیم

ایک رباعی بھی معرفت میں درج کی جاتی ہے:—

سلطان گوید کہ نقد گنجینۂ من — صوفی گوید کہ دلق پشمینۂ من

عاشق گوید کہ داغ دیرینۂ من — من دانم و دل کہ چیست در سینۂ من

غزالی کی مایہ ناز تصنیف مثنوی نقش بدیع ہے جس کے انتخاب کے بغیر یہ تذکرہ بالکل ناقص رہیگا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:—

خاک دل آں روز کہ می بیختند — شبنمے از عشق برآں ریختند

دل کہ بداں رشحۂ غم اندود شد — بود کبابے کہ نمک سود شد

دیدۂ عاشق کہ دہد خون ناب — ہست ہماں خوں کہ چکد از کباب

بے اثر مہر چہ آب و چہ گل — بے نمک عشق چہ سنگ و چہ دل

دل کہ ز عشق آتش سودا در او — قطرۂ خونیست کہ دریا در اوست

دو شعر اسکے اور یاد آگئے۔ ملاحظہ ہوں:—

بستر شدہ در کوئے تو خاکسترم امشب — یا سوختہ از آتش دل بسترم امشب

جاں دادم و فارغ شدم از محنت ہجراں — یعنی کہ ز شبہائے دگر بہترم امشب

ایک مثنوی اسرار المکتوم بھی غزالی کی تصنیف سے ہے اور اچھی ہے۔

حزنی

حزنی اصفہانی۔ اصفہان کا رہنے والا ہندوستان میں آگیا۔

فنِ شعر اور اشعارِ قدیم سے خوب واقف تھا مگر "دانش پژوہ" اور "در حکمت ممتنی" کہکے ابوالفضل نے ٹال دیا ہے۔ معلوم نہیں کیا مصلحت تھی۔ سوز و گداز طبیعت میں کوٹ کوٹ کے بھرا ہوا تھا اور کیفیاتِ عشق سے کلام لبریز تھا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں

گر بدل گردم و دیدم کہ درو جائے ہست   غم معاذ اللہ اگر نیست تمنائے ہست

معاذ اللہ کا حشو ہے مگر لطف دیکھو۔ غم کے نہ ہونے سے حذر کرتا ہے اور پناہ مانگتا ہے اور پھر تمنا کے ساتھ پائے تنکیری کا لطف کتنا زیادہ ہے۔ آگے کہتا ہے:۔

در چمن بود زلیخا و بحسرت می گفت   یادِ زنداں کہ درو انجمن آرائے ہست
ناامیدم ز تو امّا بمحبت چہ کنم   کہ میانِ من و رسمِ تقاضائے ہست

زگریۂ جگرم دوش چشم ترمی سوخت   چراغ دیدہ بہ راہِ تو تا سحری سوخت
شد از شہرتِ حسنِ تو آں زماں خبرم   کہ شعلہ در جگر افتاد و بے خبری سوخت

ثنائی

خواجہ حسین ثنائی مشہدی۔ وطن میں زراعت پیشہ اور زمیندار بھی تھا۔ فنِ شعر کی طرف توجہ ہوئی تو دربارِ اکبری تک پہونچگیا۔ خوشگوئی میں بھی فرد تھا۔ ایک شعر میں کہتا ہے کہ معشوق دنیا کی روشنی ہے اور اہل دنیا کی راحت کا سبب۔ جدت پسندی نے عجب تشبیہیں پیدا کر دیں:۔

چو مہرِ فلک دہر گردیدۂ   چو خواب آشنا روئے ہر دیدۂ

چند اشعار اور منتخب کئے جاتے ہیں:۔

مرا بہ بتکدہ چو چوں پیمبرِ بکعبہ بری   کہ بارگوں زدہ نعلم سراغ من غلط است
در حوصلۂ فلک از عشق نگنجید   ہر ذرہ کہ از خاکِ ثنائی بہوا رفت

مختصر یہ کہ شعرائے دربار ایک سے ایک بہتر تھے۔ اب ہم نثر نگاروں کا حال بالاجمال لکھتے ہیں۔

ابوالفضل

ابوالفضل ۔ علامی تخلص۔ شیخ مبارک ناگوری کے دوسرے بیٹے تھے اور فیضی کے چھوٹے بھائی ۹۵۸ھ میں پیدا ہوئے اور درسیات ختم کرنے کے بعد باپ اور بھائی کے ساتھ مصائب میں گرفتار رہے۔ جب خاندان کا ستارۂ اقبال چمکا تو یہ بھی اکبر کے دربار میں پہونچے اور رفتہ رفتہ کل ممالک محروسہ کے وزیر ہوگئے۔ شہزادۂ سلیم (جہانگیر) کو آخر میں شدید عداوت ہوگئی اور یہ دکن کی مہم سے واپس ہو رہے تھے کہ جہانگیر کے ایما سے نرسنگھ دیو نے راہ میں قتل کر ڈالا۔ یہ واقعہ غالباً ۱۰۱۱ھ میں واقع ہوا۔ اکبر کو بیحد صدمہ ہوا اور تھوڑے دنوں کے بعد وہ بھی انتقال کر گیا۔

تصانیف علامی میں اکبرنامہ۔ آئین اکبری اور انشاے ابوالفضل مشہور ہیں۔ **اکبرنامہ** تاریخ ہے اور طویل فقروں اور جملوں میں لکھی گئی ہے۔ **انشاے ابوالفضل** خطوط اور تقریظوں کا مجموعہ ہے۔ جملے اتنے طویل ہیں کہ بعض وقت ایک ایک صفحہ کے بعد جملہ ختم ہوتا ہے۔ عربی الفاظ کی بھرمار ہے۔ مرادفات و تکررات کی کوئی حد نہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ مذاق عصر کے موافق لکھی گئی ہے۔ **آئین اکبری** کی عبارت نادرالوجود ہے۔ مضامین کے اعتبار سے تو تینوں کتابیں اکبر کی ملک گیری۔ نظام سلطنت۔ دول خارجہ سے تعلقات۔ اخلاقی اور مذہبی حالات۔ درباریوں کے تراجم۔ غرض تمام تفاصیل پر حاوی ہیں طرز تحریر میں البتہ ہر ایک کتاب سے جدا ہے۔ استواری تراکیب۔ کفایت الفاظ۔ شیرینی اور فصاحت سب کا لحاظ کیا گیا ہے بلکہ خالص فارسی کے محاورات اور الفاظ بکثرت داخل کیے ہیں۔ اکثر جدید اصطلاحیں بھی بنانی پڑی ہیں۔ اگر اُس زمانے میں یہ رنگ مقبول ہو جاتا تو آج زبان کے صاف کرنے کی اولیت ناصرالدین شاہ اور قاآنی وغیرہ کو نہ ملتی۔ زمانے کی بدمذاقی نے پھر وہی ڈھرا

اختیار کرلیا جس پر آجکل ایران و ہندوستان دونوں ملکوں میں اعتراض ہو رہے ہیں اور مستشرقین یوروپ بھی ناراض ہیں۔ آئین اکبری کا نمونہ ملاحظہ ہو شعرا کی تعریف میں کہتا ہے :۔

"راہے بہ نہا نخانۂ معنی بردہ اند۔ و روشن ضمیر شان تابشگاہ ایزدی فیض۔ لیکن بسیارے گراں مایگی گوہر نشنا شند و بہ آرزوے کمتر خواستہ میفروشند۔ و در ستائش فرومایگاں روزگار بسپرند۔ و بہ نکوہش فرو ہیدہ مردم زبان برآلایند۔ وگرنہ پیوندِ الفاظ بس شگرف باشند چہ جاے دریافت والا معانی"

عبدالقادر بدایونی کو آزاد بلگرامی نے شیخ مبارک کا شاگرد لکھا ہے بدایونی اور فیضی و ابوالفضل سے بھی مستفیض ہونے کا ادعا کیا ہے۔ اکبر کے پیش امام تھے اور شیخ حاتم سنبھلی کے مرید۔ مہابھارت کے کئی اجزا کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ اور بحرالاسما کا بھی سلیس فارسی میں ترجمہ کیا۔ ۱۰۰۴ھ میں انتقال ہوا۔ ان کی منتخب التواریخ جو تاریخ بدایونی بھی کہلاتی ہے آجکل بہت متداول ہے۔ تفصیلی واقعات اکبر کے زمانے کے سلیس فارسی میں لکھے ہیں مگر نہایت تعصب کے ساتھ۔ مولانا شبلی کو انکی عصبیت کی بیحد شکایت ہے اور بجا ہے جس شخص کو اپنے مذاق کے خلاف پایا ہے۔ اُس کی اچھی طرح خبر لی ہے۔ افسوس ہے کہ اس تعصب بیجا نے اُن کی راے کو کسی معاملے میں قابل احترام نہ ہونے دیا۔ ورنہ واقعات کا اچھا مجموعہ ہے۔

جہانگیر بادشاہ کی خوش مذاقی بچپن ہی سے ظاہر تھی۔ بادشاہ جہانگیر بادشاہ ہونے کے بعد اہلِ علم کی قدر دانی میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ خود بھی عاشق مزاج تھا اور شعر و سخن کی طرف مائل۔ طالب آملی اسی کے دربار کا ملک الشعرا

غرض اس کے کلام کا انتخاب بھی جہانگیر نے کیا ہے جس کے متعلق مولانا شبلی کی رائے ہے کہ شاید طالب اس سے اچھا انتخاب خود نہ کر سکتا۔ ایک مرتبہ خانخاناں نے جامی کی مشہور طرح "ابر بسیار است مے بسیار می باید کشید" پر غزل کہی۔ مراد صفوی اور شہزادہ ہم نے بھی غزلیں نظم کیں۔ جہانگیر نے مصرعہ لگا کے فی البدیہہ یہ مطلع کہا:۔

ساغرے بر روئے گلزار می باید کشید ابر بسیار است مے بسیار می باید کشید

پھر جامی کی غزل منگوائی تو سوائے اس مصرع کے کوئی پسند نہ آیا۔ خود تزک جہانگیری میں لکھتا ہے:۔

"ایں مصرع ظاہر شد کہ از مولانا عبدالرحمٰن جامی است۔ غزل او تمام بنظر در آمد۔ غیر ازاں مصرع کہ بطریق مثل زبان روزگار شدہ دیگر کارے نساختہ۔ بغایت سادہ و ہموار گفتہ"

ایک اور واقعہ لکھتا ہے:۔

"روزے ایں بیت امیر الامراء خواندہ شد۔ بگذر مسیح از سر ما کشتگان عشق
یک زندہ کردن تو بصد خوں برابر است۔ چوں طبع من موزوں است
گاہے بے اختیار گاہے بے اختیار مصراعے و رباعی یا بیتے در خاطر
می گذرد۔ ایں بیت بر زبان گذشت:۔

از من متاب رخ کہ نیم بے تو یک نفس
یک دل شکستن تو بصد خوں برابر است

چوں خواندہ شد ہر کس کہ طبع نظمے داشت درین زمین بیتے گفتہ گذرانید۔
ملا علی احمد مہرکن کہ احوال او پیش ازیں گذشتہ بہ نگفتہ بود:۔

اے محتسب ز گریہ پیر مغاں بترس یک خم شکستن تو بصد خوں برابر است"

ان واقعات سے جہانگیر کے مذاق نظم و نثر کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے خصوصاً

نثر کی سلاست زمانے کے رنگ سے بالکل جدا ہے۔ تزک جہانگیری اس کی مبسوط تصنیف اپنے حالات میں ہے اور تاریخی ایمانداری اسقدر ہے کہ اپنی کمزوریاں بھی درج کر دی ہیں۔ شراب خواری اور عیش پرستی کا بھی اقرار ہے۔ بعض وقت غلط سزائیں دیدینے پر بھی افسوس ہے۔ ابوالفضل کے قتل کا ذمہ دار اپنے کو صاف صاف قرار دیدیا ہے۔ غرض یہ خوبیاں اس کتاب کو پایۂ اعتبار تک لے آئی ہیں۔

نور جہاں

نور جہاں بیگم فی الحقیقت عہد جہانگیر کی فرمانروا تھی اور اہل کمال کی قدردان۔ خود بھی شعر کہتی تھی اور شعرا و مصنفین کی محنتوں کی داد دیتی تھی۔ شعر فہمی [illegible] اتنا بڑھا ہوا تھا کہ ایکمرتبہ **طالب آملی** یا **کلیم** کا یہ شعر پڑھا گیا:—

"ز شرم آب شدم کاب را شکستے نیست　　بحیرتم کہ مرا روزگار چوں بشکست

فوراً بول اٹھی "دیخ بست و شکست"

شاہجہاں

شاہجہاں کی علم دوستی بھی کچھ کم نہ تھی۔ بڑے بڑے کملا اور ماہرین فن اسکے دربار میں حاضر رہتے تھے اور انعامات حاصل کرتے تھے۔ عمارات [illegible] (روضہ تاج گنج وغیرہ) اسیکی یادگار ہیں اور رفیع قزوینی و دانش مشہدی وغیرہ اسی کے دربار سے فروغ یافتہ۔ ایک مرتبہ سلطان روم نے شاہجہاں کو لکھا کہ آپ ہندوستان کے بادشاہ ہیں۔ شاہجہاں کیوں لقب اختیار کیا ہے۔ **کلیم** نے اسی وقت ایک قصیدہ نظم کر کے پیش کیا جس میں شاہجہاں کے لقب کی توجیہ نہایت عمدہ کی ہے:—

ہند و جہاں ز روئے عدد ہر دو چوں یکیست

شہ را خطاب شاہجہانی مبرہن است

کہتے ہیں کہ **کلیم** کی قدر دانی اسی وقت سے شروع ہوگئی اور مالا مال کر دیا گیا۔ میر یحیی **کاشی** کی تاریخ بنائے شہر دہلی "شد شاہجہاں آباد از شاہجہاں آباد" بھی اسی عہد کی قدردانی کی بدولت ہے۔

ہمیشہ رکھا ہے کیونکہ غزل کے معنی ہیں "حکایت از معشوق" یعنے معشوق سے باتیں کرنا یا معشوق کے متعلق باتیں کرنا۔ اس نکتہ پر لحاظ کر کے نظیری چاہے عرفی کے رنگ میں فلسفہ گوئی کرے چاہے صائب کی طرح تمثیلات نظم کرے حقیقت کے عالم میں ہو خواہ دنیائے مجاز کے نظارے کر رہا ہو سلاست زبان اور شیریں ادا کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ اس کا خیال ہے کہ غزل کا عنصر خاص "تغزل" ہے۔ اگر یہ نہیں تو کچھ نہیں۔ تصوف کا رنگ دیکھو:۔

توپنداری کہ این قصہ زخود می گویم   گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست

عالم مجاز کی حسن تخئیل پر نظر کرو:۔

نیست لذت ز نظربازیِ بزمے کہ دروست   خندۂ زیرلب و گریۂ پنہانی نیست

تمثیلی شاعری کا اندازہ کرو:۔

شکوہ نقصان داشت فصلے ازمیان انداختم
نرخ ارزاں بود کالا در دکاں انداختم

آں وہد در گریہ پند ما کہ با ما دشمن است
ہر کہ می گیرد شناور را بہ دریا دشمن است

معاملہ بندی کا نمونہ یہ ہے:۔

[illegible] تسلی از و نبود   خرسندش از تغافل و دشنام کردہ ایم

[illegible]

[illegible] آمد و نشناختم   باز بیاید ز سر گیرم رہ بیہودہ را

ایک مسلسل غزل سنو اور اندازہ کرو کہ معاملات حسن و عشق میں اس کی نظر [illegible] ہے:۔

چشم [illegible] سپر و مژگاں تماشا کش نگر
در سینہ دار و آستینے پیراہن چاک کش نگر

وامیکہ زلف انداختہ در گردن سیمینش ببین

خوبیکہ مژگاں ریختہ بر دامن پاکش نگر

شرم از میاں برخاستہ مُہر از دہاں برداشتہ

گفتار بے ترسش ببیں رفتار بیباکش نگر

قصائد میں بھی سلاست اور روزمرّہ کافی طور سے موجود ہے اور دقیق خیالات کو بھی صفائے ادا سے آسان کر دیا ہے۔

شیدا مشہدی

شیدائے مشہدی۔ باپ دادا ایرانی تھے۔ خود فتحپور سیکری میں پیدا ہوا اور جہانگیر کی فوج میں سپاہی کی حیثیت سے زندگی کا آغاز ہوا۔ شاہجہاں کے زمانے میں عروج پایا۔ اس زمانے میں ایک قصیدہ شاہجہاں کی مدح میں نظم کیا جس کا مطلع یہ ہے:۔

چیست والی بادۂ گلگوں بصفا جوہر ے — حُسن را پروردگارے عشق را پیغمبرے

تعجب ہے کہ اتنے لطیف مطلع پر بیچارہ کافر بنایا گیا اور بادشاہ نے حکم دیا کہ ممالک محروسہ سے نکال دیا جائے۔ مگر اس نے ایک قطعہ معذرت میں نظم کر کے پیش کیا جس میں مولانا جامی کا یہ شعر بطور استشہاد مذکور تھا:۔

از صراحی دو بار قلقل مے — پیش جامی بہ از چہار قُل است

شیدا کی معذرت قبول ہوئی بلکہ انعام بھی ملا۔ بعض تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دیوان میں ایک لاکھ شعر تھے اور کلام مشہور بھی ہو گیا تھا۔ خود کہتا ہے:۔

شعر برجستہ شیدا ہمہ جا مشہور است — نیست حاجت کہ بدیوان مرتب نگرید

کلام میں برجستگی ہے اور طبیعت کسی قدر دِقّت پسند بھی ہے۔ مشکل ردیف اور قافیوں میں غزلیں اور قصیدے خصوصیت کے ساتھ صاف ہوتے ہیں۔ مثلاً کہتا ہے:۔

تازہ سازم ہر سحر چوں صبح داغ خویش را

تا قیامت زندہ می خواہم چراغ خویش را

لالہ در گلشن سیہ مست است و نرگس در خمار

تا بکے از مے تہی چشم ایاغ خویش را

گر ترا تکلیف مے خوردن کنم تسلیم کن

باغباں از آب وارد تازہ باغ خویش را

سنہ ۱۰۵۱ھ کے بعد اسکی وفات ہوئی اور کشمیر میں دفن ہوا۔

صائب

صائب مرزا محمد علی اصفہانی بعد فراغت حج آخر عہد جہانگیر میں وارد
ہندوستان ہوا۔ جب کشمیر پہونچا تو ظفر خاں والئی کشمیر سے ملاقات ہوئی اور اسقدر
آپس میں لطف بڑھا کہ صائب اسی کا مداح ہو گیا۔ شاہجہاں نے اپنے زمانے میں
لشکر خاں کو صوبہ کشمیر کی ولایت سپرد کی اور ظفر خاں کو دار السلطنت میں طلب
کر لیا۔ صائب بھی ساتھ آیا اور سفر دکن میں بھی ظفر خاں اور شاہجہاں کے
ہمراہ رہا۔ برہانپور کے زمانۂ اقامت میں صائب کے باپ اصفہان سے آئے
اور بیٹے کو وطن واپس لے جانے کے جویا ہوئے۔ میرزا نے اجازت طلب کی مگر اتفاقاً
سے شاہجہاں نے آگرہ کا قصد کر دیا۔ مجبوراً آپ کو وہاں جانا پڑا۔ سنہ ۱۰۴۲ھ میں ظفر خاں
کو پھر کشمیر کی صوبہ داری ملی اور صائب اپنے ممدوح کے ہمراہ واپس گیا۔ وہاں
پہونچ کر ظفر خاں سے رخصت ہوا اور اصفہان میں سکونت پذیر ہو گیا۔ سلاطین
صفویہ نے بھی اسکی قدر دانی کی۔ آخر سنہ ۱۰۸۰ھ میں انتقال ہوا اور اصفہان میں مدفون
ہوا۔ مولانا شبلی کی رائے ہے کہ "ایران میں شاعری رودکی سے شروع ہوئی اور
میرزا صائب پر ختم ہو گئی" حضرت قاآنی کا استثنا کیا ہے۔ ممکن ہے کہ رائے کسی حد تک
مبالغہ آمیز ہو لیکن اتنا ضرور ہے کہ غزل گوئی میں ایک طرز خاص کا موجد ہے
اور ندرت و فصاحت میں لاجواب ہے۔ ایک مرتبہ یہ مصرعہ پڑھا گیا ہے۔

[illegible] ۔ [illegible] دل شکستن و مردن

چند غیر مربوط الفاظ یکجا ہونے کے سوا اس مصرعہ میں کچھ نہ تھا۔ صائب نے فوراً یہ مصرعہ لگا کے عجب رنگ پیدا کر دیا:—

بقدر ہر سکوں راحت بود بنگر تفاوت را
دویدن، رفتن، استادن، نشستن، خفتن و مردن

کلام کا کمال خاص طور سے تخیل میں ہے۔ معاملہ بندی ہو یا مضمون آفرینی، فلسفہ ہو یا مدح، حقیقت ہو یا مجاز۔ ہر رنگ کی جولا ایک تخیل سی پیدا کر دیتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ فصاحت و سلاست کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا:—

جذبۂ عاشق اثر در سنگ خارا می کند — کوہکن معشوق خود از سنگ پیدا می کند
صحبت ناجنس گردد باعث شہرت مرا — آب را دیدی کہ ماہی را بدام افگندہ است
از سعی کار عشق شود ناتمام بیشتر — پیچد بہ مرغ بال فشان دام بیشتر
چشم بر صنع الٰہی باز کن لب را ببند — بہتر از خواندن بود دیدن خط استاد را

بعض اشعار اس روش خاص سے جدا بھی ہیں۔ نازک خیالی کا انداز ملاحظہ ہو:—

کہ گذشتست از ین بادیہ دیگر کامروز — نبض رہ می طپد و سینۂ صحرا گرم است
چشم عاشق ز تماشائے تو چون سیر شود — ہر نگہ سلسلہ جنبان نگاہ دگر است

معاملہ بندی کی مثال:—

ہم اینجا صلح کن با من۔ چہ لازم — کہ در محشر ز ما شرمندہ باشی

سرمستی کا اندازہ دیکھو:—

عالم بیخبری طرفہ بہشتے بود است
حیف صد حیف کہ ما دیر خبردار شدیم

قصائد نہایت صاف اور سلیس ہیں اور بعض قصیدوں میں تخیل نہایت عمدہ ہے۔ مثلاً ایک قصیدہ امام رضا علیہ السلام کی شان میں لکھا ہے جس کا یہ

مذمت شراب کے بعد کہتا ہے :۔

بگذر ز تاک بد گہر و آب او کہ ہست ہر دانہ ریش خونی فرزند بوتراب[1]

اگرچہ یہی تخلیص نظیری کے یہاں بھی ہے :۔

ازاں شراب کنی در قدح کہ با دصبا ز فیض نکہت او روح داد عیسیٰ را

ہزار کوہ غم از یکدگر فرو ریزد دراں مقام کہ ظاہر کند تجلا را

نہ زاں شراب کہ انگور او شہید کند شہ سریر امامت علیؑ موسیٰ را

طالب آملی

طالب آملی ابتدائے شباب میں ہندوستان چلا آیا اور تلاش معاش میں ادھر اُدھر پھرا کیا مگر جب کوئی صورت نہ نکلی تو میرزا غازی خاں[2] والئی قندھار کے پاس پہونچا اور مقربان خاص میں داخل ہوا ۔ رفتہ رفتہ خلوص نے اتنی ترقی کی کہ غازی خاں کو بجائے ممدوح کہنے کے معشوق کہنے لگا :۔

تکلف نیست معشوق منست او نیست ممدوحم ازاں این شعر عشق آمیز در مدحش سرائیدم

غازی خاں کے بعد پھر ہندوستان آیا اور عبداللہ فیروز جنگ حاکم گجرات کے نام خواجہ قاسم دیانت خاں کا سفارشی خط لیکے احمد آباد گیا اور بہت عزت حاصل کی۔ پھر اعتماد الدولہ[3] تک رسائی پیدا کی اور اُسکے سایہ عاطفت میں زندگی بسر کرنے لگا یہانتک کہ دربار شاہی میں پیش کیا گیا اور ۱۰۲۸ھ میں ملک الشعرائے دربار ہو گیا اور نہایت عزت و احترام سے بسر کرنے لگا ۔ آخر ۱۰۳۶ھ میں جہانگیر سے ایک سال پہلے

---

[1] مشہور ہے کہ مامون رشید نے امام علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام کو انگور میں زہر دیکے شہید کیا تھا اگرچہ مامون کا قاتل ہونا مختلف فیہ ہے۔ [2] یہ بڑا سخن شناس تھا اور خود بھی وقاری تخلص کرتا تھا اور شعر کہتا تھا۔ رنگ طبیعت کا اندازہ ان اشعار سے ہو جائیگا :۔

در عہد تو ما را ہمہ با غیر خطاب است سر پنجۂ مژگان و گریبان عتاب است

گریہ ام گر سبب خندۂ او شد چہ عجب ابر ہر چند کہ گرید رخ گلشن خندد

غازی خاں کی عمر صرف ۲۵ برس کی تھی کہ ایک غلام کے ہاتھ سے مسموم ہوا۔

[3] نور جہاں بیگم کا چچا۔

انتقال کر گیا۔ طالب کی شاعری کا آغاز بارہ تیرہ برس کی عمر سے تھا اور زود گوئی میں اسقدر امتیاز تھا کہ دو تین گھنٹے میں پچاس ساٹھ شعر کا قصیدہ تیار کر لیتا تھا تشبیہات و استعارات میں جدّت و ندرت پیدا کرنا اس کا کام تھا:۔

لب[1] از گفتن چناں بستم کہ گوئی — دہن بر چہرہ زخمے بود و بہ شد
عشق در اوّل و آخر ہمہ وجد است و سماع — ایں شراب است کہ ہم پختہ و ہم خام خوش است
دو لب خواہم یکے در مے پرستی — یکے در عذر خواہیہائے مستی
زغارت چمنت بر بہار منت ہاست — کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند

صائب کے رنگ میں بھی بعض اشعار ملتے ہیں:۔

مرد بے برگ و نوا را سبک از جائے بگیر — کوزہ بے دستہ چو بینی بدو دستش بردار
دشنام خلق را ندہم جز دعا جواب — ابرم کہ تلخ گیرم و شیریں عوض دہم

ہندوستانی فارسی کا اثر بھی اسکے کلام میں ملتا ہے۔ جہانگیر نے شراب کا نام رام رنگی رکھا تھا۔ کہتا ہے:۔

نہ ایم منکر صہبا و لیک می گوییم — کہ رام رنگئی ما نشۂ دگر دارد

کلیم

ابو طالب کلیم ہمدان میں پیدا ہوا اور شیراز میں تحصیل علم کی۔ پھر ہندوستان میں آیا اور شاہنواز خاں کے دربار میں جہانگیر کے زمانے میں باریاب ہوا ۱۰۲۸ھ میں ایران واپس گیا مگر نہایت افسردہ۔ ہندوستان چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا تھا:۔

بہ ایران میرود نالاں کلیم از شوق ہمراہاں — بپائے دیگراں ہمچوں جرس طے کردہ منزل را

۱۰۳۰ھ میں پھر واپس آیا اور میر جملہ کے ذریعے سے شاہجہاں کے دربار میں حاضر ہونے لگا یہاں تک کہ ۱۰۴۴ھ میں ملک الشعرا کا خطاب ملا۔ جب شاہجہاں نے سفر کشمیر کیا تو کلیم بھی ہمراہ تھا۔ وہاں ایسا جی لگا کہ بادشاہ سے اجازت لیکے زندگی بھر وہیں رہا۔ آخر ۱۰۵۵ھ میں

[1] یہ چار شعر جہانگیر نے منتخب کیے اور خوش ہو کے ملک الشعرا کا خطاب دیا (دیکھو توزک جہانگیری)

رحلت کی اور غنی کشمیری نے تاریخ کہی۔ "طور معنی بود روشن از کلیم"۔ فن شعر میں کلیم کا کلام ہر صنف میں موجود ہے بلکہ جزئیات پر بھی نظمیں پائی جاتی ہیں مثلاً انگوٹھی۔ قلمدان۔ کشتی۔ بندوق پر اشعار نظم کئے ہیں۔ یہ خصوصیت اسے مذاق حال کے نزدیک لاتی ہے اور ہمعصروں کی نظر میں اعجوبہ روزگار ٹھہراتی ہے۔ مثنویوں میں ہندی الفاظ بکثرت درج کئے ہیں:—

منہ بر وعدۂ تنبولیان دل — کہ جز خون خوردن از وی نیست حاصل
ز حسن شستۂ دھوبی چہ گویم — ازاں بے پردہ محبوبی چہ گویم

درختوں اور پھولوں کا ذکر کرتا ہے:—

ز موزوناں نظر در یوزہ دارم — کہ وصف مولسری را بر نگارم
گل گڑہل نہ فہمیدست موسم — شگفتہ چوں رخ یار ست دائم
نہال نیمش از بس خوش نسیم است — دل طوبیٰ ز رشک آں دو نیم است

واقعہ نگاری کا بھی شوق تھا شہزادگی کے زمانے میں عالمگیر کا ایک ہاتھی سے مقابلہ ہوا نہایت صفائی سے یہ واقعہ ایک مثنوی میں تحریر کیا ہے (دیکھو شعر العجم جلد سوم)۔ قصائد میں مشکل بندشوں اور پیچدار ترکیبوں سے احتراز کیا ہے اور مبالغہ و حسن تعلیل کو وسعت دی ہے۔ مولانا شبلی کی رائے ہے کہ "قصیدے کی متانت اور بلندی کم ہو گئی ہے اور غزلیت کا رنگ غالب آگیا ہے"۔ فی الحقیقت عرفی و فیضی کے بعد سے یہ صنف پست ہی ہوتی گئی اور زمانے کا مذاق اسے اسی پست مقام پر کھینچتا رہا۔ کلیم تشبیہوں میں جب واقعہ نگاری کرتا ہے تو تخیل کے زور سے حقیقت کو دبا دیتا ہے۔ مثلاً ابر و بہار کا حال کہتا ہے:—

سحاب از تیر باران بہاری — بہ بستاں حملہ گلہا را نشاں کرد
بنوعے آتش گل درگرفتست — کہ بلبل رفت و در آب آشیاں کرد

یہی رنگ رفتہ رفتہ مقبول ہوتا گیا اور ہندوستان کی فارسی شاعری کو ایران کی شاعری سے اتنا دور کھینچتا گیا کہ آخر میں جب موازنہ کیا گیا تو ترکیب الفاظ و تخییل مضامین دونوں کے اعتبار سے دو چیزیں ایک زبان میں پیدا ہو گئیں۔ غزل گوئی میں کلیم کو امتیاز خاص ہے۔ تغزل تو بالکل کم ہے مگر وہی ہندوستان کی پرورش یافتہ چیز جس کا نام مضمون آفرینی ہے اسکے غزلوں میں بکثرت موجود ہے :-

بسکہ زدیدہ ریختم خونِ دلِ خراب را　　گریہ گرفت در حنا پنجۂ آفتاب را

بلکہ یہ جدت طرازی کبھی کبھی مذاق سلیم سے اشعار کو گرا دیتی ہے۔ مثلاً

شراب کہنہ بینوشم بہ بزم او چو بنشینم　　بمن تا نوبت آید دخترِ رز پیرمی گردد

صائب کے رنگ میں تمثیلیہ اشعار کہے ہیں اور اچھے کہے ہیں :-

روشندلاں خوشامدِ شاہاں نگفتہ اند　　آئینہ عیب پوش سکندر نمیشود

قطعِ امید کردہ نخواہم نعیم دہر　　شاخِ بریدہ را نظرے بر بہار نیست

اندھیری راتوں سے گھبراتا ہے اور رنگ تخییل بھر کے کیفیت دکھاتا ہے :-

بعد ازیں تاریکئ شبہا بخود خوش کن کلیم　　شکوہ کم کن در چراغِ اختراں روغن نماند

جنون کا جوش بھی اسی رنگ میں دیکھو :-

اگر بہ بادیہ گردی نمیبرم چہ عجب　　جنونِ من نشناسد ز شہر صحرا را

یہ سب کچھ سہی مگر لطف زبان و محاورہ ہر مقام پر موجود ہے۔ اخلاف اسکو بھی مضمون آفرینی کے پیچھے خیرباد کہدینگے۔

دانش　دانش مشہدی۔ میر رضی نام۔ سلسلہ نسب امام رضا علیہ السلام سے ملتا ہے۔ داراشکوہ بن شاہجہاں سے خصوصیت خاص ہو گئی تھی بلکہ شاہزادے کو اسکا یہ شعر نہایت پسند تھا :-

تاک را سرسبز کن اے ابر نیساں در بہار　　قطرہ تا مے می تواند شد چرا گوہر شود

شہزادہ محمد شجاع کے ساتھ بھی خصوصیت رہی۔ پھر عبداللہ قطب شاہ کے پاس دکن گیا۔ یہاں اسکے باپ میر ابوتراب کا انتقال ہوگیا۔ اسی رنج میں یہ رباعی کہی:۔

دانش مکن اعتماد بر عمرِ دراز   کاید بزیانِ کم بسر عمرِ دراز
گیرم کہ چو عیسیٰ بر فلک بر شدۂ   آید بچہ کار بے پدر عمرِ دراز

آخر ۱۰۶۲ھ میں قطب شاہ کی طرف سے نائب الزیارۃ ہوکے مشہد مقدس چلا گیا اور ۱۰۶۶ھ میں وہیں رحلت کر گیا۔ بعض اشعار درج کئے جاتے ہیں تاکہ رنگ طبیعت کا اندازہ ہو سکے:۔

هر که خندۂ گل سر بدرد می آورد   دماغِ گریۂ بلبل دریں بہار کجاست
تو بہار است ہوا مایۂ عشرت دارد   مفت رندی است کہ مے دارد و فرصت دارد
اے ہما از سرِ ما خاک نشیناں مگذر   سایۂ بالِ تو بدنامیِ دولت دارد

تمثیلیہ رنگ ملاحظہ ہو:۔

مرد دانا بہ ہنر زندۂ اقراں گردد   میوہ رنگیں چو شد از برگ نمایاں گردد
پس از وفات کہ یاد کند بجز غم خویش   چو خون مردہ سیہ پوش شو بماتم خویش

قدسی

قدسی۔ حاجی محمد جان مشہدی ۱۰۴۸ھ میں ہندوستان آیا اور شاہجہاں کے دربار میں باریاب ہوا اور وہیں ملازم رہا۔ سال وفات ۱۰۵۴ھ ہے اور مدفن لاہور۔ قصائد میں اسے یدطولیٰ تھا اور بعض نقادوں کا خیال ہے کہ کلیم نے قصیدہ گوئی میں اسی کا رنگ اختیار کیا تھا۔ انداز کلام ملاحظہ ہو:۔

زبسکہ کوہ کشید ست نم ز ابرِ مطیر   تواں کشید رگ از سنگ ہمچو موز خمیر
چو خاک پیرہن غنچہ باد پیرایاں   کنند رخنۂ دیوار را ز گل تعمیر
سحاب شست لب غنچہ را بچندیں آب   برائے آنکہ زند بوسہ بر رکاب امیر

جدت تخیل اسکے کلام میں ضرور ہے لیکن حقیقت کا پردہ پوش ہو جانا کچھ اچھا نہیں

اس رنگ کا بانی خواہ کلیم ہو خواہ قدسی ایک ایسے اساس کو قائم کر دیتا ہے جو مذاقِ سخن پر بُرا اثر ڈالتا ہے۔ قدسی کے بعض قصائد میں ایک بات اور عجیب ہے وہ یہ ہے کہ بغیر تخلیص کے مدح شروع کر دیتا ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اپنے زمانے کا مسلم الثبوت اُستاد ہے اور شاہجہاں کے حال میں **مثنوی بادشاہ نامہ صاحبقران ثانی** میں تو اکثر مقامات نہایت دلکش نظم کئے ہیں اگرچہ مبالغہ اور "ثبوت" کا رنگ غالب ہے۔ کشمیر کی تعریف میں کہتا ہے:۔

نسیمش ز صنعت بہار آفریں — قلمہائے تخلیش نگار آفریں

چو گلہائے رعنا وریں لالہ زار — خزاں را پس پشت کردہ بہار

زبس ابر پاشیدہ بر خاکش آب — غبارے ندارد ہوا جز سحاب

چو رخسار ساقی ز جام شراب — چمن در گرفت از گلِ آفتاب

شد از عکسِ گل بسکہ خوشبوئے آب — بود چشمۂ آب حوضِ گلاب

جلالائے طباطبائی اور توقیعات کسریٰ

جلالائے طباطبائی[۱] ۔ محمد نام۔ جلال الدین لقب شہزادہ مراد بخش اپسر شاہجہاں کے اہلِ دربار سے تھے اور اسی کے حکم سے نوشیرواں کے اقوال عربی اور فارسی کتابوں سے جمع کر کے مع شرح تالیف کئے جس کا نام توقیعات کسریٰ ہے۔ علاوہ اسکے ایک اور کتاب منشآتِ نثر فتح کانگڑہ کے حال میں لکھی ہے۔ طرز تحریر خوشگوار نہیں ہے۔ عربی الفاظ اور ترکیبیں بکثرت ہیں اور جملے خواہ مخواہ طویل اگرچہ متانت و جزالت بھی موجود ہے۔ جس مقام پر نوشیرواں کے اقوال کی شرح کی ہے وہ متن سے زیادہ مشکل ہو گئی ہے۔

---

[۱] اسمٰعیل بن ابراہیم بن حسن بن علی بن ابیطالب علیہ السلام کا لقب طباطبا ہے اور ان کی اولاد طباطبائی کہلاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ اسمٰعیل بچپن میں قاف کا تلفظ طا کرتے تھے۔ عید کے لئے باپ نے پوچھا کہ تمھیں کون چیز پہننے کی ہو اور چاہیے۔ کہا "طبا طبا" یعنی "قبا قبا"۔ اُس دن سے اُن کا لقب طبا طبا ہو گیا۔

ظہوری

ظہوری ترشیزی۔ ظہورالدین نام۔ ترشیز وطن۔ علوم وفنون میں دستگاہ حاصل کرنے کے بعد دکن آیا اور عادلشاہیوں کے دربار میں داخل ہوا۔ ایک ساقی نامہ برہان شاہ والیٔ احمد نگر کو نذر کیا۔ بادشاہ نے چند ہاتھی نقد وجنس لاد کے انعام میں بھیجے۔ کہتے ہیں کہ جب انعام پہونچا تو ظہوری قہوہ خانہ میں حقہ پی رہا تھا۔ کارپردازان سلطنت نے رسید مانگی تو ایک پرچہ پر لکھ دیا کہ "تسلیم کردند تسلیم کردم"[1]۔ ایک مرتبہ عرفی کے پاس ایک شال بھیجی۔ عرفی نے ہجو میں تین رباعیاں کہہ کے بھیجیں جن میں سے ایک یہ ہے:۔

این شال کہ وصفش نہ حد تقریر است　　آیات رعونت مرا تفسیر است
نامش نکنی قماش کشمیر گزو　　صد رخنہ بکار مردم کشمیر است

ابراہیم عادلشاہ نے ظہوری کی بہت قدردانی کی اور ظہوری کے تصنیفات کی بدولت اُس کا نام بھی آجتک دنیائے ادب میں زندہ ہے۔ ۱۰۲۵ھ میں ظہوری نے وفات پائی اور دکن میں دفن ہوا اور سہ نثر و ساقی نامہ و کلیات غزل و قصائد یادگار چھوڑے۔ نظم میں تقریباً ہر صنف میں کمال فن دکھایا ہے۔ اگرچہ مضمون آفرینی اور استعارہ بندی بکثرت ہے مگر سلاست وفصاحت بدرجۂ کمال موجود ہے خصوصاً مثنوی سے طبیعت کو خاص لگاؤ تھا۔ مثلاً ابراہیم عادلشاہ کی تعریف میں کہتا ہے:۔

کعبۂ اہل دل ابراہیم باد　　قبلۂ نہ چرخ و ہفت اقلیم باد
از مہ نو پشت دستے بر زمین　　پیش قدرش چرخ در تسلیم باد

---

[1] سلطنت مغلیہ میں سلام کرنے کے دو طریقے رائج تھے۔ تسلیم اور کورنش۔ تسلیم کے لئے زمین پر پشت دست رکھتے تھے اور آہستہ آہستہ اٹھا کے پیشانی پر رکھتے تھے۔ کورنش کی ابتدا یوں ہوئی کہ ایک مرتبہ ہمایوں نے اکبر کو کم سنی میں ایک تاج پہننے کو دیا۔ یہ تاج سر سے کسی قدر بڑا تھا۔ اکبر جب باپ کے سامنے تسلیم کرنے کو جھکا تو سر سے تاج گرنے لگا۔ فوراً ہاتھ پیشانی پر رکھ کے جھک گیا اور تاج کو سنبھال لیا۔ ہمایوں نے بیٹے کی محبت میں یہ طریقہ بھی جاری کر دیا۔

همتش ترکیب لفظ کم نخواست　　کاف سرکش[۱] ز اختلاط میم باد

داستاں شد ختم بستانِ رحمتش　　غیرتِ گلزار ابراہیم باد

ساقی نامہ کے اشعار اگرچہ اُسی زمانے کے مذاق میں ہیں اور نیچرل رنگ سے بہت دور ہو گئے ہیں مگر سلاست اور روانی میں بے نظیر ہیں اور شیرینی ادا ہر مقام پر موجود ہے اگرچہ صاحب آتشکدہ کی رائے ہے کہ "حسن زیادے ندارد و اما بفصاحت مشہور شدہ۔"

نثر لکھنے کا طریقہ البتہ مخصوص ہے طویل اور مکرر جملے تکلفات میں جکڑے ہوئے۔ ہر جملے میں بکثرت صنائع وبدائع اور تشبیہات واستعارات وغیرہ ملیں گے مگر نہایت منتقن اور محکم۔ مثلاً کہتا ہے کہ وہ لوگ جنھیں منقولات کے ساتھ تصوف کا بھی ذوق ہے۔ ہمیشہ خدا کی حمد ایک کیف خاص میں کرتے ہیں۔ کہتا ہے: —

"سرود سرایان عشرتکدۂ قال کہ بنورس سرابستان حال کارکام وزبان ساختۂ لشہد ثنائے صانعے عذاب البیان اندکہ نغمہائے شکرین دررگ وپئے نے دوایندہ۔"

یہ جملہ دیباچہ نورس[۲] کے ابتدا میں ہے۔ اس میں علاوہ حروف جارہ وروابط وغیرہ کے تقریباً ۲۲ لفظ ہیں اور صنائع بھی بائیس ہیں بلکہ زائد اگر اسکے بعد کے جملے سے متعلق کر دیا جائے۔ (۱) سرود سرا میں براعت استہلال ہے کیونکہ موسیقی کی کتاب کا دیباچہ ہے۔ (۲) سرود اور سرا میں صنعت اشتقاق ہے۔ (۳) سرود اور عشرتکدہ میں مراعات النظیر ہے۔ (۴) و (۵) نورس میں صنعت تحلیل اور ایہام تناسب ہے۔ (۶) و (۷) سرابستان میں اضافت مقلوب ہے اور مراعاۃ النظیر (۸) و (۹) و (۱۰) قال وحال میں تضاد۔ مبادلۃ الراسین اور سجع ہے۔ (۱۱)

---

[۱] سرکش کاف کے مد کو بھی کہتے ہیں۔ [۲] ابراہیم عادل شاہ ثانی نے ایک کتاب نورس علم موسیقی میں دکنی زبان میں لکھی تھی اور ملک قمی وغیرہ سے اسکا فارسی میں ترجمہ کرایا تھا اور ظہوری سے دیباچہ لکھوایا تھا جو سہ نثر میں نثر اول ہے۔

کار و کام میں تجنیس لاحق ہے۔ (۱۲) کام و زبان میں مراعات النظیر۔ (۱۳)
شہد و عذب و شکرین مراعات النظیر۔ (۱۴) رگ و پے مراعات النظیر۔
(۱۵) و (۱۶) و (۱۷) پے و نے مبادلۃ الراسین۔ تصحیف۔ سجع۔ (۱۸)
شکر و نی ایہام تناسب وغیرہ وغیرہ۔ غرض ظہوری کی ذات پر ان تمام تکلفات
کا اس حیثیت سے خاتمہ سمجھنا چاہئے کہ اس سے بہتر اس رنگ میں کوئی نثر نہیں لکھ سکا
اسی وجہ سے صاحب خزانۂ عامرہ کی رائے ہے کہ ''از جواہر زواہر گزرا یندہ''۔

نعمتخان عالی

عالی۔ میرزا محمد پسر حکیم محمد فتح الدین شیرازی۔ مقام ولادت ہندوستان۔
اورنگ زیب کے زمانے میں پہلے باورچیخانہ کا داروغہ ہوا اور نعمتخان خطاب پایا۔
پھر جواہر خانہ کا داروغہ ہوا اور مقرب خان خطاب ملا۔ اسی عہد سلطنت میں انشاپردازی
کا موقع ملا خصوصاً ظرافت کا جس کو عالمانہ انداز میں لا کے بہت بلند پایہ کر دیا۔
ایک مرتبہ ایک جیغہ زیب النسا بیگم کے یہاں بیچنے کو بھیجا۔ عرصے تک قیمت نہ ملی یاددہانی
کے طور پر لکھا:۔

ای بندگیت سعادت اختر من | در خدمت تو عیاں شدہ جوہر من
گر جیغہ خریدنی است پس کو زر من | ور نیست خریدنی بزن بر سر من

زیب النسا ہنس دی اور جیغہ کے ساتھ پانچ ہزار روپیہ انعام میں دئیے۔ بہادر شاہ
اول کے زمانے میں اور بھی عزت بڑھی اور دانشمند خاں خطاب ملا بلکہ شاہنامہ
تحریر کرنے پر مامور ہوا مگر ۱۱۲۱ھ میں رحلت کر گیا اور وقائع نعمتخان عالی جنگنامہ
نعمتخان عالی مضحکات۔ مجموعہ قصائد و غزلیات وغیرہ یادگار چھوڑے۔
حقیقت یہ ہے کہ دورِ آخر میں نعمتخان عالی نظم و نثر دونوں میں ممتاز ہے جنگنامہ
میں معظم و اعظم پسران اورنگ زیب کی خانہ جنگی کا حال لکھا ہے۔ فقرات اکثر اپنے
زمانے کے مذاق کے موافق طویل ہیں اور مرادفات کی کثرت مگر پختگی ہر مذاقی کو

سنبھال لیتی ہے خصوصاً بے ثباتیِ دنیا اور فلسفیانہ مضامین جہاں ذکر ہوئے ہیں اُن کی متانت و جزالت بعض وقت سہل ممتنع معلوم ہوتی ہے مثلاً ایک مقام پر کہتا ہے :-

"دنیا نمودے است بے بود و بودے است بے وجود۔ عالم ہمہ اسم است بل سراسر طلسم"۔

کاش یہ مذاق اگر اُسی وقت رائج ہو جاتا تو ابتک ہندوستان کی فارسی انشا خدا جانے کہاں سے کہاں پہونچتی۔ وقائع میں اورنگ زیب کے محاربات دکن کا ذکر ہے - رنگ سہ نثر ظہوری سے ملتا جلتا ہے مگر صنائع و بدائع میں زیادہ جکڑا نہیں ہے - البتہ استعارات و تلمیحات و تلمیعات وغیرہ سے ایک خاص شوکت پیدا کر لی ہے - بعض فقرے طنز یہ بھی ہیں۔ خود شیعہ ہے اور شیعوں کا طرفدار۔ اورنگ زیب کی فوج پر زہر خند مختلف مقامات پر کی ہے جس کا اثر ہر شخص پر اُس کے ذوق کے موافق پڑتا ہے۔ مگر یہ طعن چونکہ صاف صاف نہیں ہیں بلکہ توریہ اور ایہام میں مخفی ہیں اس وجہ سے عبارت کسی قدر دقیق ہو گئی ہے - انداز بیان کی مثال ذیل کی عبارت سے واضح ہو جائیگی۔ کہنا اتنا ہے کہ جب صبح ہوئی اور آفتاب نکلا۔ اسکو یوں ادا کرتا ہے:-

"دمیکہ مدرس کشاف[1] صبح در صفہ[2] صدق و صفا چوں قاضی بیضا[3] تفسیر والشمس وضحٰها بخط شعاعی آفتاب بر صفحۂ روزگار نگاشت"

اس کتاب میں جا بجا نظمیں بھی ہیں جو نہایت صاف اور شیریں ہیں اور بیشتر مضحک ایک مقام پر بادشاہ کو خبر ملی کہ فتح ہو گئی لیکن غنیم نے دھاوا کر دیا۔ معلوم ہوا کہ خبر جھوٹی تھی اس کا حال نظم کرتا ہے :-

نوید فتح و ظفر چوں بباد شاہ رسید　　نوائے عیش و طرب تا بمہر و ماہ رسید

---

[1] قرآن مجید کی ایک تفسیر کا نام ہے جس کے مصنف علامۂ زمخشری ہیں - [2] خانقاہ میں ذکر کا مقام - [3] ایک مفسر کا نام جن کی تفسیر بیضاوی مشہور ہے -

ز صدمہ[1] گوش ملائک بر آسماں کر شد — ز بسکہ نعرۂ شاباش و واہ واہ رسید
شگفتگی ز تبسّم بخندہ منجر شد — گذشت باز ازاں ہم بہ قاہ قاہ رسید
بصحبتے شدہ مشغول ہر یکے طرفے — کہ کیف شادیِ شاں زود چوں نگاہ رسید
یکے بہ بحث کہ فالِ بلنست آمدہ راست — تمام شد غمِ دل حالتِ رفاہ رسید

اسکے بعد ہر ایک کے کوچ کا ارادہ مختلف پیرایوں میں دکھایا ہے کہ کوئی اونٹ مانگتا ہے کوئی گھوڑا تیار کراتا ہے :—

یکے نوشت کہ پالاں بدوز اے ظالم — چپیر[2] شگافتم اینست چوب و کاہ رسید

غرض ایک عجیب خلفشار ہے کہ ناگہاں

ز قلعہ گولۂ افتاد اندریں اثنا — کشید نالہ اجل کشتہ کہ آہ ! رسید!
یکے بساں شرر جست و زیر سنگ خزید — یکے چو شعلہ دواں شد کہ تا پناہ رسید
ہنوز بر لب او بود ایں سخن کز دور — گلولۂ دگر آمد بہ بار گاہ رسید
یکے بہ پشتہ بر آمد کہ من ببینم چیست — بلند شد دو سہ گامے بقعرِ چاہ رسید
بجا ست و گرے از جا کہ ہیچو باید دید — ازاں وقوف گلولہ بقتل گاہ رسید
مگر یکے بعقب رفت و دید ہیں طلبید — بدید و گفت شکستے بہ ایں سپاہ رسید
دریں معاملہ بودند تا خبر آمد — کہ چشم[3] زخم عظیمے بفوجِ شاہ رسید

مضحکات میں وقّتِ نظر بہت کرنی ہوتی ہے اور اُسکے عبارات اور مطالب وقائع سے کہیں زائد دشوار ہیں۔ قصائد میں سلاست اور شستگی بہت ہے۔ البتہ مضامین عالیہ کی کمی ہو گئی ہے مگر یہ زمانے کا انقلاب ہے۔ عرفی و فیضی کے بعد سے فلسفیت اور مضامین بلند کا گویا خاتمہ ہی ہو گیا اور قصیدہ گوئی کا مذاق ہی بدل گیا۔ یہی غنیمت ہے کہ استعاروں کی رنگ آمیزی میں حقیقت کو نہیں چھپاتا اور

---

[1] طنز ہے۔ [2] چھپر۔ [3] نظر بد کا اثر۔

کیفیات کو شاعرانہ لہجے میں دلکش بنا کے نظم کر دیتا ہے۔ ایک تشبیب ملاحظہ ہو:۔

کشائشِ گرہِ دل بہیچ باب نشد — ہزار حیف کہ انگور ما شراب نشد

زبیم طعنہ بہ میخانہ گرچہ شب رفتی — عجب کہ جام بدستِ تو آفتاب نشد

شہیدِ عشقِ ترا خلد جا و داں دادند — ولے چہ سود کہ اجرِ یک اضطراب نشد

بہار خواست کہ گل را چو عارضِ تو کنند — شد اینقدر کہ شدا ما بہ آب و تاب نشد

ایک اور تشبیب کے اشعار تمثیلیہ رنگ میں نقل کئے جاتے ہیں:۔

بخلق احسان نمودن موجبِ اجرِ نکو باشد — حنا از دستگیر یہائے مردم سرخرو باشد

صفائے خاطرِ آدم میںمایدسنگ و آہن را — زفیضِ پاکئی طینت ببیں آئینہ رو باشد

غزل گوئی میں ایک خاص سوز و گداز ہے۔ اپنے زمانے کے مذاق کو لئے ہوئے بعض کیفیتیں نہایت دلکش بیان کر دیتا ہے مثلاً

چگونہ خار دل از سیرِ لالہ زار کشم — رخِ تو ہست چرا منتِ بہار کشم

بیک نگاہِ تو جاں دادن آرزو دارم — کہ انتقام فراقت ز روزگار کشم

زبیم خوئے تو تا کے بدل فغان و رزم — اجازتے اکہ دگر نالہ آشکار کشم

ایک غزل میں اپنی بپتی سُناتا ہے اور نازک خیالی سے کلام میں ملاحت پیدا کرتا ہے:۔

عکسِ یارم کہ بیغمائے ندیدن رفتم — سحرِ صبحم کہ بیک آہ کشیدن رفتم

آہ بودم کہ شکستے ہمہ جا پیش آمد — مژدہ بودم کہ بتاراج شنیدن رفتم

جلوہ کرد کہ از حسرتِ دل آب شدم — قطرہ گشتم و آخر بچکیدن رفتم

از سرِ کوئے دلم تا بتماشا گہِ جاں — قدمے بود کہ آنرا بطپیدن رفتم

خاک بودم کہ مگر یار گزارے بکند — گلشنے گشتم و بیہودہ بچیدن رفتم

عالی افسوس کہ دادو ستدِ عمر خطا ست — زرِ قلبم کہ بدشنام خریدن رفتم

ناصر علی سرہندی تخلص علی۔ ابتدا میر سیف خان بخشی صوبہ دار الہ آباد — ناصر علی سرہندی

کی ملازمت میں رہا اور چند سال وہاں بسر کئے پھر سرہند چلا آیا مگر وہاں اطمینان سے رہنے نہ پایا۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک دن شیخ محمد معصوم ایک باغ میں گئے دیکھا کہ ناصر علی تنہا ہے اور شراب نوشی کا سامان سامنے رکھا ہے پوچھا "یہ کیا" کہا کہ "یہ وہ شراب ہے جسے ملائکہ پیتے ہیں"۔ شیخ غضبناک ہو کے واپس آیا اور صوفیوں اور عالموں نے اسکے واجب القتل ہونے کا محضر تیار کیا۔ میر محمد زمان راسخ اپنے رفیقوں کے ساتھ مسلح ہو کے آے اور ناصر علی کو اپنی حفاظت میں دہلی لے گئے ورنہ جان نہ بچتی۔ دہلی میں بھی شغل مے نوشی جاری رہا۔ ایک دن باغ میں بیٹھا ہوا صراحی سے جام بھر رہا تھا اور شراب میں کف پیدا ہو رہا تھا۔ ناصر علی پر کیف طاری ہوا اور یہ شعر کہا:۔

کدامیں مست را امشب سر جنگ است با زاہد   کہ مینا ہم ز جوشِ مے زرہ زیر قبا دارد

کہتے ہیں کہ آخر عمر میں شراب سے توبہ کر لی اور شیخ محمد معصوم کا مرید ہو گیا تھا واللہ اعلم۔ ذوالفقار خاں بھی اسکے خاص قدردانوں میں تھا۔ اول ملاقات میں جو مدحیہ غزل پیش کی اُس کا مطلع آج تک مشہور ہے:۔

اے شانِ حیدری ز جبینِ تو آشکار   نامِ تو در نبرد کند کارِ ذوالفقار

اِس غزل پر انعام میں تیس ہزار روپئے پاسے اور سب تقسیم کر دئے۔ ذوالفقار خاں کے ساتھ بیجاپور اور کرناٹک وغیرہ میں رہا اور اُسی کے ساتھ پھر دہلی واپس آیا۔ اور قلندرانہ زندگی بسر کرنے لگا آخر ۲۰ رمضان ۱۱۰۸ھ کو رحلت کر گیا اور ایک دیوان اور مثنوی بطور یادگار چھوڑی۔ کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ نازک خیالی اور مضمون آفرینی کو حد اعتدال سے بڑھا دیا اور استعارات کی زنجیروں میں آزادی خیال کو جکڑ دیا۔ نزاکت ادا اور سلاست بیان کے خاتمے کے سامان فراہم ہونے لگے "بنوشٹ" ہی "بنوشٹ" باقی رہ گئی۔ لیکن اُستادانہ قوت ان سب باتوں پر جہاں پردہ ڈال دیتی ہے وہاں جدت ادا نقادوں کی نظر کو خیرہ

کرنے لگتی ہے اور شاعر کی عظمت قلوب میں راسخ ہو جاتی ہے۔ انداز کلام ملاحظہ ہو:۔

نیست غیر از عشق دل سوتے منِ افسردہ را　　شعلہ جنبش می دہد نبضِ چراغ مردہ را

عشق از پردہ بر دل آمد و آوازم داد　　بُرد از ہر دو جہانِ دور و بپروازم داد

کسیکہ درد جدائی کشیدہ می داند　　کہ خار خشک رگِ جان شاخ عریان است

بعض اشعار کی تخییل اتنی پیچدار ہوتی ہیں کہ چیستان کی حد تک پہونچ جاتے ہیں:۔

از بسکہ سنگ تفرقہ ہا در سراغ ماست　　چون شیشۂ شکستہ فروغ چراغ ماست

سرت گردم شکایت جوش زد گر دیدن چشمے　　نفس شوخ است مہر تازہ میخواہد زبان اینجا

یہ سب کچھ سہی مگر اپنے رنگ پر ناز ہے۔ مثنوی میں کہا ہے:۔

سخن را آفریدم جان دمیدم　　با قرار خدائی بر گزیدم

السّتے سر زد و از من بلی گفت　　ملش "یا عبد" او "یا ربنا" گفت

صاحب خزانہ عامرہ کا بیان ہے کہ اہل ذوق اس مثنوی کو پڑھتے تھے اور مزے لیتے تھے۔

بیدل

بیدل۔ میرزا عبد القادر عظیم آبادی۔ پٹنہ عظیم آباد میں پیدا ہوئے اور ہندوستان ہی نشو و نما بھی ہوئی۔ آغاز شباب شہزادہ محمد اعظم پسر اورنگ زیب کی ملازمت میں گزرا اور منصب بھی پایا۔ ایک دن شاہزادے نے اپنی مدح میں قصیدہ نظم کرنے کی فرمائش کی۔ میرزا نے انکار کیا اور ملازمت ترک کرکے دہلی چلے آئے جہاں گوشہ نشینی میں بسر کرکے سنہ ۱۱۳۳ھ میں انتقال کیا اور اپنے گھر کے صحن میں دفن ہوئے۔ ترک دنیا کیوجہ سے انکی آخر عمر نہایت عزت سے گزری۔ بڑے بڑے اُمرا انکے چوکھٹ پر آتے تھے اور مستفیض ہوتے تھے۔ آصفجاہ دکن نے ایک مرتبہ شہرۂ کمال سُنکر بُلا بھیجا۔ جواب میں لکھ دیا:۔

دنیا اگر دہند نخیزم زجائے خویش　　من بستہ ام حنائے قناعت بپائے خویش

کلام میں جدید استعارے اور نئے تصرفات بکثرت ہیں بلکہ بعض ایسے ہیں کہ زباندانانِ عجم اُن پر اعتراض کرتے ہیں جیسے "خرام کاشتن" وغیرہ۔ نظم و نثر دونوں مذاقِ تصوف میں زیادہ تر ہیں اور مضامین سے زائد عنوان اداپیچدار اور دقیق ہوتا ہے۔ لیکن بااینہمہ اگر صاف اشعار علیحدہ کر لئے جائیں تو بلند نظری کی کافی سند ہیں۔ نئی نئی بحروں میں بھی اکثر غزلیں نظم کی ہیں مگر استعارہ در استعارہ اور تخییل در تخییل کا رنگ اسقدر غالب ہے کہ کلام اُلجھ کے رہ گیا ہے اور بعض اوقات بالکل چیستان ہو جاتا ہے۔ اگر خدانخواستہ یہ رنگ اور ترقی کرتا تو ہندوستان کے فارسی شاعر محض معمّا گو ہو کے رہ جاتے۔ اب ہم بعض نمونے انکے کلام کے پیش کرتے ہیں۔ نکات میں کہتے ہیں:-

"اگر منکر نبوت ؐ با خطرات جز بہ تعظیم پیش میا و اگر بہ تجلّی ایمان داری

بہ ہیچ جانب بے ادب چشم مکشا"

دیکھو یہ رنگ بالکل ظہوری کے رنگ سے برعکس ہے۔ مطالب بہت زیادہ ہیں اور الفاظ نہایت کم بلکہ قلت الفاظ کی حد اس قدر قابل گرفت ہے کہ بعض اوقات محض مطالب جلیلہ پر اشارے کر دیتے ہیں۔ نظم میں بھی یہی حالت ہے۔ مثلاً کہنا اتنا ہے کہ اس دنیائے فانی میں ہمارا وجود دو عدموں کے درمیان ہے۔ شاعرانہ تخییل میں کہہ سکتے تھے "یعنے میانۂ دو سراب است ہستیم" مگر پیچدار طبیعت استعاروں کی سیڑھیاں بنہائے بغیر مضمون کو قیدِ نظم میں لا ہی نہیں سکتے کہتے ہیں:-

بیدار ئے میانِ دو خواب است ہستیم گرو تخیّلِ دو سراب است ہستیم

پہلا مصرعہ غزالی مشہدی کے شعر کا خلاصہ ہے۔ کہتا ہے:-

شورے شد و از خواب عدم دیدہ کشودیم دیدیم کہ باقیست شب فتنہ غنودیم

یہ خلاصہ مضمون غزالی سے بیحد پست ہو گیا اور جو اپنا خیال تھا وہ اسیر زندان استعارات ہو گیا۔ صاف رنگ کے اشعار اسی غزل کے ملاحظہ ہوں:-

از لطمهٔ دو موج حباب دمیده است — بشکسته طلسم نقش بر آب است ہستیم
مغلوب آفتاب چو شد سایه سایه نیست — اندیشه که در چه حساب است ہستیم
روشن نشد ز نسخهٔ دل جز سواد وہم — مضمون حیرتم چه کتاب است ہستیم
سرمایه وقف غارت و امید محو یاس — یارب چه جنس خانہ خراب است ہستیم

یہ سب کچھ سہی مگر ایک احسان بیدل کا ہندوستان کی شاعری پر یہ ضرور ہے کہ حقائق ومعارف کی طرف قلوب کو متوجہ کر دیا ہے اور "بوس وکنار" اور "معاملہ بندی" وغیرہ سے جو مجازی عشق کے کیفیات ہیں طبیعتوں کو کوسوں دور ہٹا دیا ہے ۔ صفویہ اور ہندیہ دور کے مابہ الامتیاز نتائج میں یہ نتیجہ بھولنے والا نہیں ۔ پیچدار ترکیبیں اور اُلجھی ہوئی ادائیں ترک کرکے یہاں کے شعرا جس میدان میں قدم زن ہو جاتے ہیں وہاں کے مناظر بیحد بلند اور رحق الحقائق کے قریب ہیں ۔ جدید بحروں میں نظم کرکے اگرچہ امیر خسرو کی سلطنت کے ارکان کو اپنے دربار میں بلا یا ہے مگر لطف ادا خسرو ہی کو اولیت اور اولویت کا تاج پہنائے ہوئے ہے ۔ بحر متدارک میں کہتے ہیں :۔

چه بود سرو کار غلط سبقان درِ علم و عمل بفسانه زدن
زغرور و لائل بیخبری ہمه تیر خطا بہ نشانه زدن
اگرم بفلک طلبد ز زمیں وگرم بزمین فگند ز فلاک
بقبول طاعت حکم قضا نتوان در عذر و بهانه زدن

بحر کامل میں کہا ہے :۔

من سنگدل چه اثر برم ز حضور ذکر دوام او — چو نگیں نشد که فرو روم بخود از خجالت نام او
نه دماغ و دیده کشودنے نه سر فسانه شنودنے — ہمه راد بوده غنودنے بکنار رحمت عام او

حزیں محمد علی بن ابیطالب شیخ زاہد جیلانی کی اولاد میں تھے ۱۱۰۳ھ میں شہر اصفہان میں پیدا ہوئے چار برس کی عمر سے تحصیل علم میں مشغول ہوئے اور

حزیں

تھوڑے ہی عرصے میں درجۂ اجتہاد پر فائز ہوگئے۔ فن شعر سے مناسبت خداداد تھی اور
بچپن ہی سے نظم کا شوق ہوگیا تھا۔ باپ چاہتے تھے کہ یہ شوق چھوٹ جائے تاکہ طلب علم
میں ہرج نہ ہو مگر مقتضیات فطرت کا انفکاک محال ہے۔ آخر فن شعر میں بھی کامل ہوگئے
جب نادرشاہ کا حملہ ہوا تو ایران سے بھاگ کے ہندوستان میں آئے اور اپنی سوانحعمری
یہیں تحریر کی۔ لاہور و دہلی میں کچھ عرصے تک رہے مگر یہ شہر ناپسند ہوئے۔ آخر بنارس
آئے اور وہیں کے ہو رہے خود کہتے ہیں :—

از بنارس نہ روم معبدِ عام است اینجا　　ہر برہمن پسرے لچھمن و رام است اینجا

۱۱ جمادی الاولی ۱۱۸۰ھ میں وفات ہوئی اور اپنے روضۂ فاطمان میں دفن کئے گئے
قبر پر یہ اشعار اُنھیں کے خط میں کندہ ہیں :—

حزیں از پائے رہ پیما بسے سرگشتگی دیدم　　سرِ شوریدہ بر بالین آسائش رسید اینجا

روشن شد از وصال تو شبہائے تارِ ما　　صبحِ قیامت است چراغِ مزارِ ما

نثر کی تحریر سادہ اور دلکش ہے۔ واقعات کے بیان میں رنگینی یک قلم ترک کردی ہے
اور استعارات و تشبیہات مانوسہ نے کہیں کہیں عبارت کو زینت دیدی ہے۔ نمونہ کے
طور پر ہم وہ عبارت سوانحعمری کی نقل کرتے ہیں جس سے اُنکی ابتدائی شاعری کا بھی
اندازہ ہو جائیگا :—

"روزے در مجلس والد علامہ مجمعے از مستعدان منعقد بود و مراہم در آں مجلس طلبیدند
واز ہر جا سخنے درمیان بود۔ یکے از حاضران ایں بیت ملا محتشم کاشی را برخواند :—

اے قامتِ بلند قداں در کمند تو　　رعنائی آفریدۂ قدِ بلند تو

بعضے از حضار تحسین بلیغ نمودہ۔ والد مرحوم فرمود کہ دیوان ملا محتشم بنظر من
درآمدہ۔ استاد است اما کلامش بے نمک است و آں مقدار حلاوت کہ تدارک
بے نمکی کند ندارد با آنکہ نمک در سخن شاید گلو سوز تر باشد از حلاوت چنانکہ از ہمیں

مطلعِ بلندِ او ایں معنی مستنبط نو اند شد و دیگر تنہا مصرع آخر درست افتادہ و مصراع اول بطبع مانوس نمی شود چہ "قامت" را در "کمند" افتادہ گفتن با سلیقہ راست نیست۔ اگر لفظِ "قامت" نبودے و گفتے "اے کہ بلند قدان در کمند تو" ایں کلام پسندیدہ بودے۔ حاضران تصدیق نمودند۔ پس متوجہ من شدہ فرمودند کہ میدانم کہ ہنوز از شاعری باز نماندۂ۔ اگر توانی دریں غزل بیتے گفت بگو۔ ہماں لحظہ مرا مطلعے بخاطر رسید و چوں نظرِ ایشاں بمن باز افتاد دریافتند کہ در خاطر چیزے رسیدہ است۔ فرمودند کہ اگر گفتی بخوان و تخجلت مکن۔ پس خواندم :—

صید از حرم کشد خمِ جعدِ بلند تو — فریاد از تطاول شکیں کمند تو

حاضران از جا در آمدند و آفرینہا گفتند۔ تا ایشاں در تحسین بودند مرا بیت دیگر بخاطر رسید و برخواندم :—

شد رشک طور ز آمدنت کوے عاشقاں — بنشیں کہ باد خردۂ جاں ہا سپند تو

دریں مرتبہ والد علامہ از جا در آمد و تحسین کردہ فرمود کہ انچہ گفتم در شعر ملا محتشم نیست و دریں بیت ہست و من بیتے دیگر برخواندم :—

مشکل شدست کار دل از عشق و خوش دلم — شاید رسد بخاطر مشکل پسند تو

حقیقت یہ ہے کہ دورِ آخر کی خاتم شیخ علی حزیں کی ذات ہے۔ ہر صنف میں مذاق سلیم کے حدود قائم کر دیئے ہیں اور برسوں کے بگڑے ہوئے رنگ کو آبدار کیا ہے۔ نثر میں روانی۔ غزل میں سوز و گداز۔ قصیدے میں فصاحت کے ساتھ جزالت۔ مثنوی میں سلاست پھر سے واپس لائے ہیں۔ ہر صنعت کو اسی غرض سے استعمال کرتے ہیں جسکے لئے شریعت شاعری نے نافذ کیا ہے۔ لفاظی اور صنعت گری سے سراسر احتراز ہے۔ دیکھو حسنِ تعلیل کس لطف سے ادا کی ہے :—

جنوں را کار ہا با قیست با مشتِ غبارِ ما — کہ بار بگاہ طفلاں می شود خاکِ مزارِ ما

حقیقت عشق کا بعد فنا قائم رہنا اور اپنے انکار کو ظاہر کرنا ایک موثر طریقے میں نظم کیا ہے اور لفظ "مزار" (زیارت گاہ) سے شہید عشق کی عظمت ظاہر کی ہے۔ یا مثلاً یہ خیال کہ حسن کی کشش تو عاشقان صادق اور ہوس پیشہ لوگوں کے لئے باعتبار صورت یکساں ہے۔ البتہ آلام عشق کا جھیلنا دونوں میں امتیاز کر دیتا ہے۔ اس مضمون کو نہایت دلکش الفاظ میں ادا کرتے ہیں :-

می برد نالۂ مرغاں بگرفتار مرا　　　　نبرد جلوۂ گل جانب گلزار مرا

بیخودی کی لذت کا اظہار ہے اور اگر خودی کا احساس رہے تو حیات ابدی سے بھی انکار :-

حیات از استمارم گر ز خودی بستاندم ساقی　　　　بجاے میفروشم شربت خضر و مسیحا را

اپنی گری ہوئی حالت کا اظہار اور معشوق کے تقرب سے اطمینان :-

گرچہ ما سبزۂ خوابیدۂ ایں گلزاریم　　　　سرما در قدم سرو سرافزاے ہست

دنیا کو چاہے کوئی لذت و عیش کا مقام سمجھے اور یہ خیال صحیح بھی ہو مگر جنکی فطرت میں ذوق عشق داخل ہے اُنکی حالت یہ ہے :-

تہمت آلودۂ عیشیم کہ گلشن زادیم　　　　پروبالے نکشودیم کہ صیاد آمد

صائب کے رنگ میں اخلاقی نصیحت :-

گذشت از خوردہ شبنم گل و ز خمیدہ بر گردوں

بدولت میرسد ہر کس کہ از زر دست بردارد

سعادت ابدی ١٢

دیوان حزیں دیکھنے سے معلوم ہوا ہے کہ ان کی کوشش یہ نہیں کہ خواہ مخواہ طویل غزلیں نظم کریں اور ہر قافیہ کو کسی نہ کسی طرح باندھیں ضرور۔ جتنے شعر کسی زمین میں مزے کے نکل آتے ہیں اُنھیں پر اکتفا کرتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اس وقت کلیات پیش نظر نہیں ورنہ مثنوی اور قصائد کے بارے میں بھی لکھا جاتا۔

غالبؔ دہلوی۔ نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں عرف میرزا نوشہ

لہ تفصیلی حالات "یادگار غالب" مولفہ شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی میں ملیں گے۔

۱۲۱۲ھ میں بمقام اکبرآباد پیدا ہوئے۔ پانچ برس کے تھے کہ انکے والد ماجد عبد اللہ خاں ایک جنگ میں کام آگئے اور نصر اللہ خاں چچا نے پرورش کا بار اپنے ذمّے لیا۔ نو برس کے تھے کہ وہ بھی مر گئے اور عرصے تک نہایت فقر و افلاس میں زندگی کاٹنی پڑی۔ بہادر شاہ ظفر کے دربار میں رسائی ہونے سے چھ سو روپیہ سالانہ بطور وظیفہ مقرر ہوا۔ آخر میں واجد علی شاہ اودھ نے بھی پانچسو روپیہ سالانہ مقرر کر دئے مگر قسمت سے دونوں کی سلطنت جاتی رہی اور پھر تنگدستی کا سامنا ہوا۔ مجبوراً رامپور گئے اور نواب صاحب کی اُستادی کے معاوضے میں دوسو روپیہ ماہوار مقرر ہوئے لیکن دہلی کی جدائی شاق تھی نوکری چھوڑ کے واپس آئے۔ سرکار انگلشیہ سے جو پنشن جاری ہوئی اُسی پہ قناعت کی۔ آخر ۱۲۸۵ھ میں انتقال کیا اور فارسی میں حسب ذیل تصانیف چھوڑے

(۱) دستنبو۔ (۲) قاطع برہان۔ (۳) پنج آہنگ۔ (۴) مہر نیم روز در تاریخ سلاطین دہلی از تیمور تا ہمایوں۔ (۵) دیوان غزلیات و قصائد وغیرہ۔ کہتے ہیں کہ میرزا کی ابتدائی تعلیم ایک پارسی موبد نے دی تھی جو مسلمان ہو گیا تھا اور عبد الصمد کہلاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس زبان سے انس فطری ہو گیا تھا اور خالص و فصیح فارسی کے دلدادہ تھے اور اُسی کو زندہ کرنا چاہتے تھے مگر ہندوستان میں اس زبان پر اتنے رنگ چڑھ چکے تھے کہ میرزا کو اپنی کوشش میں کامیاب ہونا دشوار ہو گیا تھا۔ غدر ہندوستان کے حال میں دستنبو اسی خیال سے تصنیف کی اور پوری کوشش کی کہ عربی وغیرہ کا کوئی لفظ نہ آئے مگر نری آورد ہو کے رہ گئی۔ البتہ بعض مقامات پر نہایت صاف عبارتیں بھی تحریر کی ہیں جو اس کتاب کا بہترین حصہ کہلانے کے قابل ہیں۔ مثلاً

"نخستین بار کہ آں بیہدہ ستیزان چنانکہ گفتہ آید آمدند گنجے کہ آوردہ بودند بگنجور دادند و سر یکہ از سران پیچیدہ بودند بر آستان شہریار نہادند نزدیر روز از ہر سر راہے سپاہے و از ہر رہگزرے لشکرے و از ہر سوئے اُردوئے

گرد آورد و بدیں سرزمین رواں داشت۔ چوں شاہ سپاہ را نتوانست راند سپاہ فرود آمد و شاہ فرو ماند۔

شاہ را در میاں گرفت سپاہ ‏ ‏ ‏ ‏ ویں گرفتن بود گرفتن ماہ

ماہ تو ہیچگہ نمیگیرد ‏ ‏ ‏ ‏ جز بہ چار دہ نمیگیرد

شاہ ماہ گرفتہ را ماند ‏ ‏ ‏ ‏ نہ کہ ماہ دو ہفتہ را ماند"

نظم میں غالب کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ ابتدا میں بیدل اور ناصر علی کی عام پسندی نے انھیں بھی دھوکا دیا مگر رفتہ رفتہ حافظ و سعدی کے دلدادہ ہوئے اور کلام میں اثر خاص پیدا کر لیا۔ قصیدہ۔ غزل۔ مثنوی۔ رباعی ہر صنف میں کمال دکھایا ہے اور ہندیوں کو نظر اہل ایران میں سرخرو کیا ہے۔ کسی نے خوب کہا کہ ہندوستانیوں میں فارسی شاعری ایک تُرک لاچین (امیر خسرو) نے شروع کی اور ایک تُرک ایبک (میرزا غالب) نے ختم کر دی۔ خود کو بھی اپنی فارسی شاعری پر ناز ہے۔ ایک شخص پر طنزاً کہتے ہیں:۔

ایکہ در بزم شہنشاہ سخن رس گفتۂ ‏ ‏ ‏ ‏ کے بہ پُر گوئی فلاں در شعر ہمسنگ منست

راست گفتی لیک میدانی کہ نبود جائے طعن ‏ ‏ ‏ ‏ کمتر از بانگِ دُہل گر نغمۂ چنگ منست

فارسی ہیں تا بہبینی نقشہائے رنگ رنگ ‏ ‏ ‏ ‏ بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بیرنگ منست

راست میگویم من و از راست نتواں سر کشید ‏ ‏ ‏ ‏ ہر چہ در گفتار فخر تست آں ننگ منست

طنز یہ رنگ میں ایک خاص مزہ ہے۔ زاہدان ریائی کی حیثیت سنو:۔

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار ‏ ‏ ‏ ‏ ساقی و مغنی و شرابے و سرودے

زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند ‏ ‏ ‏ ‏ حق را بسجودے و نبی را بدرودے

قصائد میں سلاست اور روانی انکے لئے مخصوص ہے۔ افسوس کہ قاآنی کا کلام آخر عمر میں انکے پاس پہونچا ورنہ خدا جانے کیا کرتے۔ ایک تشبیب کے چند اشعار سنو:۔

گفتم حدیث دوست بقرآں برابر ست ‏ ‏ ‏ ‏ نازم بہ کفر خود کہ بہ ایماں برابر ست

ہے دستگہ نیم کہ ہنوز از ہوائے وصل　　شوریست در سرم کہ بہ ساماں برابر ست
با چارہ گر بگوے کہ تیمار بیش کش　　دردیست در دلم کہ بہ درماں برابر ست

معرفت کی حد دیکھو :-

تن زن ز شکر و شکوہ کہ در مسلک رضا　　راحت بہ رنج و سود بہ نقصاں برابر ست
ترک وجود گیر سخن در سجود چیست　　بگذر ز طاعتے کہ بہ عصیاں برابر ست

غزلیت میں شوخی اور بلند خیالی دیکھو :-

یارب جبین کیست کہ از بس بسجدہ سود　　باقی با بروئے مہ کنعاں برابر ست

تمام قصائد اسی کیفیت سے لبریز ہیں اور ہر قصیدہ تنقید بسیط چاہتا ہے مگر اختصار مانع ہے۔ بزرگان دین کی مدح میں ایک خاص جوش اور سرمستی ہے جس کی مثال کے لئے ایک ترکیب سے ایک بند درج کیا جاتا ہے تاکہ اندازہ ہو سکے :-

غالبا حسن عقیدت بر نتابم بیش ازیں　　ہم ز خود بر خویش منت بر نتابم بیش ازیں
نیست ز اسمائے الٰہی بر زبانم جز علیؑ　　بیخودم پاس محبت بر نتابم بیش ازیں
بستہ ام دل در ہوائے ساقی کوثر بخلد　　طعنہ از حوران جنت بر نتابم بیش ازیں
در تحیت وقت نماز آرم بسوئے کعبہ روے　　قید قانون شریعت بر نتابم بیش ازیں
عاشق شاہم نہ کافر عشق شاہاں کفر نیست　　از غلط فہماں شماتت بر نتابم بیش ازیں
چوں بخواہم روئے شاید نہم بر مرگ دل　　جاں گداز یہائے حسرت بر نتابم بیش ازیں
دادہ ام رنجے ز تا ذوق سلوکم روے داد　　لاجرم رنج ریاضت بر نتابم بیش ازیں

از فنا فی الشیخ مشہودم فنا فی اللہ باد
محو گشتم در علیؑ دیگر سخن کوتاہ باد

غزل کی سرزمین کی آخری فرمانروائی اپنے ہاتھ میں لے لی ہے۔ تصوف کے رنگ میں ڈوبتے ہیں تو یوں لکھتے ہیں :-

اے بخلا و ملا خوے تو ہنگامہ زا   با ہمہ بے گفتگو بے ہمہ با ماجرا
شاہد حسن ترا در روش دلبری   طرۂ پر خم صفات موے میان ما سوا
بزم ترا شمع و گل خستگیِ بوتراب   ساز ترا زیر و بم واقعۂ کربلا

شوق دیدار کا جوش دیکھو:-

زمن گرت نبود باور انتظار بیا   بہانہ جوے مباش و ستیزہ کار بیا
بیک دو شیوہ ستم دل نمی شود خرسند   بمرگ من کہ بسامان روزگار بیا
وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد   ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

جدت تخیل اور تازگیِ بیان کا اندازہ کرو:-

دماغ اہل فنا نشۂ بلا دارد   بفرق تمارہ طلوع پر ہما دارد
دلم فسردہ بیفزا ابو عہد ذوق وصال   چراغ کشتہ نہاں شعلہ خونبہا دارد
دل نہ تنہا ز فراق تو فغان ساز دہد   رفتن عکس تو از آئینہ آواز دہد
دل چو بنید ستم از دوست نشاط آغاز د   شیشہ سازیست کہ تا بشکند آواز دہد
آں راز کہ در سینہ نہانست نہ وعظ است   بردار تواں گفت و بہ منبر نتواں گفت

خاتمہ

ہم نہایت حسرت کے ساتھ یہ دور ختم کرتے ہیں۔ ہجوم افکار نے دل توڑ دیا ہے۔ حادثات جانگزا روح فرسائی کر رہے ہیں۔ نثر میں جس کثرت سے کتابیں تصنیف ہوئی ہیں اُن کا ذکر خود ایک مستقل کتاب کا طالب ہے۔ مآثر الامرا۔ شاہجہاں نامۂ عبدالحمید لاہوری۔ سیر المتاخرین کی ایسی کتابیں فن تاریخ میں۔ مدارج النبوۃ۔ معارج النبوۃ۔ جذب القلوب الی دیار المحبوب وغیرہ سیرت میں۔ طب اکبر۔ مفرح القلوب۔ اکسیر اعظم وغیرہ طب میں۔ تحفہ اثنا عشریہ۔ عبقات الانوار۔ جواہر عبقریہ وغیرہ علم کلام میں۔ غرض ہر فن میں مستقل تصانیف بیش بہا ہندوستان نے فارسی لٹریچر میں اضافہ کئے ہیں۔ یہ کوشش محض مسلمانوں تک

محدود نہیں رہی بلکہ ہندوؤں نے بھی ایسے عمدہ تصانیف یادگار چھوڑے ہیں کہ شاید و باید۔ ٹیک چند بہار کی بہارِ عجم سے آج کسے استغنا ہے۔ اسی طرح لچھمن نرائن۔ آنند رام چندر بھان وغیرہ کے مساعی جمیلہ سرمایۂ ناز ہیں۔ ان سب کا تنقیدی اور تحقیقی ذکر انشاء اللہ کسی مستقل تصنیف میں کیا جائیگا۔

برہمن

آخر میں ہم چندر بھان برہمن کا کسی قدر ذکر کرتے ہیں تاکہ ہندوؤں کے کمال کا کسی قدر اندازہ ہو جائے۔ چندر بھان کا تعلق سکرٹریٹ لاہور سے تھا۔ اس کی انشائے چار چمنی ایک مجموعۂ مکاتیب و نکاتِ صوفیہ و مسائل فلسفیہ ہے۔ نثر کا حصہ سلیس فارسی میں ہے مگر وہی فارسی جس پر ہندوستان کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ مثلاً لاہور کی عمارتوں وغیرہ کا حال لکھا ہے:۔

"عمارات منازل جنت مشاکل سرکار نواب نامدار کہ بمقتضائے حسن مکان و وسعت فضا و غایت صفا بانواع آرائش و آراستگی یادازقطع بہشت می داد تماشا نمودہ در ہر مکان و ہر محل دعائے دولت نواب فرشتہ صفات را ورد زبان ساخت"

نظم نہایت صاف اور دلکش ہے۔ خصوصاً غزل میں ذوقِ سلیم کا ہر شعر شاہد ہے:۔

دارم دلے کہ ترک تمنا گرفتہ است　　　دستِ نسیم و دامنِ صحرا گرفتہ است

وحشتِ عشق کی کیفیت حقیقت یہ ہے کہ نہایت لطیف پیرایہ میں بیان کی ہے۔ آگے کہتا ہے:۔

ہرگز نمی قتد بزمیں طفلِ اشکِ من　　　مانندِ موج دامنِ دریا گرفتہ است

برقامتش نظر فگن و برکنار باش　　　زیں آتش بلند کہ بالا گرفتہ است

با خویش ساختیم برہمن کہ روزگار

با اہلِ درد ترکِ مدارا گرفتہ است

مثنوی میں واقعات کے بیان سے کمال معلوم ہوتا ہے۔ اُلجھا کر سے بچنا اور حقیقت کو شاعری کے پردے میں نہ چھپا لینا بھی خوبی ادا کی نشانی ہے۔ دیکھو باغ کی تعریف کس لطف سے کرتا ہے:۔

دریں گلشن زگلہا دستہ دستہ　　صبا در ہر طرف گلدستہ بستہ
ہوایش دلکشا و دل نشین است　　طراوت خانہ زادِ این زمین است
شگفتہ ہر طرف گلہاے لالہ　　گرفتہ بر کفِ عشرت پیالہ
چو دیدم آب و رنگِ بوستاں را　　صلائے عیش دادم دوستاں را
زباں در وصفِ گل بیتاب گردید　　سخن تا بر لب آمد آب گردید

—•—※—•—

باب دوازدہم

قاچاریہ

فترت نادرشاہی کے خاتمے پر ہم لکھ چکے ہیں کہ ایران میں قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا تھا اور ہر طرف بے اطمینانی پھیلی ہوئی تھی۔ آخر ۱۱۶۳ھ میں کریم خاں زند بادشاہ ہوا جس نے بیس برس تک نہایت نیک دلی اور انصاف کے ساتھ سلطنت کی مگر مستقل امن و امان آقا محمد خان قاچار کے تسلط سے (۱۲۰۹ھ میں) ہوا اور ایران کے مختلف ولایات کی دوبارہ شیرازہ بندی اسی بانی سلطنت قاچاریہ کی ذات سے شروع ہوتی ہے جو کسی نہ کسی صورت میں آج تک قائم ہے۔ آقا محمد خان کے قتل ہو جانے کے بعد فتح علی شاہ قاچار کا نام تاریخ ایران میں روشن نظر آتا ہے اور عدالت و نظم و نسق کا عہد شروع قائم ہوتا ہے اگرچہ آخر عمر میں تھوڑا سا نقصان بھی ہوا یعنے عاشق آباد وغیرہ سلطنت روس میں شامل ہو گئے اور لشکر روس نے شاہ ایران کو شکست دی۔ محمد شاہ قاچار کا دور اس کے بعد شروع ہوا مگر کوئی خاص بات ایسی نہیں معلوم ہوتی جو درج کی جائے۔ البتہ ترقیات فنون و علوم جو فتح علی شاہ نے اعلیٰ پیمانے پر شروع کر دی تھی اس زمانے میں بھی قائم رہی۔ ۱۲۶۴ھ سے ناصر الدین شاہ قاچار کی حکومت کا آغاز ہوا اور یہ عہد سلطنت ایران کی عظمت قائم کرنے میں نہایت کامیاب ثابت ہوا۔ علوم و فنون کی ترویج ہوئی اور بکثرت تصانیف نظم و نثر میں شائع ہوئے۔ بادشاہ کے ہاتھ میں عنان حکومت اٹھارہ برس کی عمر میں آئی اور ۴۹ برس تک برابر مہمات ملکداری انجام دئے۔ فرقہ بابیہ کا

کریم خاں زند

آقا محمد خاں قاچار

فتح علی شاہ قاچار

محمد شاہ

ناصر الدین شاہ

استیصال اور میرزا علی محمد باب اور قرۃ العین وغیرہ اس فرقے کے سرگروہوں کا قتل اس زمانے کے اہم واقعات سے ہے۔ ناصر الدین شاہ نے دو بار سفر یورپ کیا اور ممالک خارجہ سے دوستانہ تعلقات قائم کرکے سفارت خانے کھولے۔ آخر

مظفر الدین شاہ

میرزا محمد رضائے باب نے ۱۳۱۳ھ میں شہید کیا۔ **مظفر الدین شاہ** ان کے فرزند جب جانشین ہوئے تو ایران میں حریت کا جوش اپنا کام کر رہا تھا اور ممالک یورپ کی تقلید میں شخصی سلطنت سے تنفر پیدا ہو رہا تھا۔ ان کا گیارہ برس کا زمانہ اسی انقلاب کے پختہ ہونے میں گذرا یہانتک کہ آخر عہد رعایا کو سلطنت مشروطہ دی گئی اور رعیت کے وکلا کی ایک شورائے ملی قائم ہوئی ۱۳۲۴ھ میں مظفر الدین

محمد علی شاہ

شاہ کا انتقال ہوا اور **محمد علی شاہ** ان کا بیٹا بادشاہ ہوا۔ اس کے زمانے میں انقلاب ایران زور پکڑ گیا۔ بادشاہ مشروطہ کا مخالف تھا اور رعایا شخصی سلطنت سے بیزار۔ تقریباً چار سال ہنگامۂ عظیم برپا رہا۔ آخر **محمد علی شاہ** معزول ہوا اور اسکے چھوٹے بیٹے احمد میرزا کو سلطنت مشروطہ کا برائے نام بادشاہ قرار دیکے انتظام

احمد شاہ

ملک کو ایرانیوں نے سنبھالنا شروع کیا۔ ابھی چند سال ہوے ہیں کہ **احمد شاہ** قاچار کی تخت نشینی کا باقاعدہ اعلان ہوا ہے اور آجتک یہی تاجدار ایران ہیں۔

لٹریچر پر انقلاب

عہد قاچاریہ میں جو انقلاب نظم و نثر میں ہوا وہ نہایت عظیم الشان ہے۔ مغربی ممالک سے تعلقات بڑھ جانا۔ متاخرین کی پیچدار ترکیبوں اور تخییلوں سے پریشان ہونا۔ شاہنامہ اور مثنوی معنوی کی طرز ادا پسند آجانا۔ ان تمام امور کا نتیجہ یہ ہوا کہ انشائے عجم کی کایا پلٹ گئی۔ عہد تیموریہ کی نازک خیالی اور دورۂ صفویہ کی معاملہ بندی دونوں سے طبیعتیں ہٹ گئیں۔ کسی رنگ کو پریشان گوئی کہنے لگے کسی کو بیہودہ سرائی۔ بلکہ صاحب مجمع الفصحا کے خیال میں فارسی شاعری پستی کے بدترین درجہ پر پہونچ گئی تھی کہ عہد قاچاریہ کے شعرا نے اپنا رنگ بدلا۔

کسی نے فردوسی و اسدی کی تقلید شروع کی۔ کوئی عنصری و مسعود سعد کا متبع ہوا۔ بعض شاعر بزمیات سعدی و نظامی سے سیکھنے لگے۔ حکیمانہ مذاق کے لوگ ناصر خسرو کو پیشوا ماننے لگے۔ اہل معرفت نے سنائی اور مولانا روم کی تقلید شروع کی۔ غرض

لکھی تھی بخت میں گردش جو صورت پرکار   پھر آ گئے اسی مرکز پہ ہم جہاں سے چلے

اس میں شک نہیں کہ متقدمین کا کمال اظہر من الشمس ہے لیکن جو وجوہ ان کے کمالات کے فروغ کے لئے پیدا ہوئے اور انقلابات روزگار کی وجہ سے جو حالات ان کے پیش نظر آتے تھے اور جن کیفیات سے ان کے قلوب متاثر ہوتے تھے اس کا نتیجہ نظم و نثر میں ظاہر ہوتا تھا۔ شعرائے قاچاریہ کا کلام مجمع الفصحا میں دیکھا۔ بیشتر متقدمین کی نقالی ہے اور اس نقالی کا شوق اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ متروک محاورات۔ مذموم تعقیدیں۔ کرخت تلفظ۔ اکھڑی ہوئی ترکیبیں بھی اختیار کر لی ہیں۔ اگر متاخرین استعارہ بازی اور بوس و کنار کے دلدادہ ہو کے تباہ ہوئے تو معاصرین پر یہ مصیبت نازل ہوئی۔ سچ ہے کہ افراط و تفریط دونوں بری چیزیں ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ مرادف الفاظ و فقرات کا بار بار لانا یا سلاست ادا کو استعاروں کی گتھیوں میں الجھا دینا اچھا ہے لیکن اتنی قدامت پرستی بھی بیکار ہے کہ ان حالات و کیفیات کے پیدا کئے بغیر ان کے دائرے میں قدم رکھا جائے یا ان کی کمزوریاں اور لغزشیں بھی ہنر سمجھ کے اختیار کر لی جائیں۔ بہر تقدیر زبان کا صاف ہونا ضروری تھا خصوصاً نشر علوم و فنون کی راہ میں متاخرین کا اسلوب بیحد حائل ہو گیا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ انقلاب آئندہ کوئی عمدہ صورت اختیار کرے۔ بیشتر شعرائے حال معنویت کی طرف کم جاتے ہیں اور لفاظی کو ساری کائنات سمجھتے ہیں۔ بعض سادگی ادا کی طرف

اتنا جھکے ہیں کہ "دندانِ تو جملہ در دہانند ما چشمانِ تو زیرِ ابروانند" کے حدود
کے قریب پہونچ گئے ہیں ہاں! بعض لوگ ایسے بھی ہیں جنھوں نے کسی نہ کسی صنعت
میں امتیاز پیدا کیا ہے اور اپنے عصر کے انقلاب کو قائم رکھتے ہوئے نظم و
نثر میں فروغ حاصل کیا ہے۔ ایسے چند لوگوں کا بلا امتیازِ جاہ و منصب ذکر کیا
جاتا ہے تاکہ ناظرین اندازہ کرلیں کہ اس رجعت قہقری کی بہترین صورت
کہاں تک پہونچی ہے۔ **قاآنی** البتہ اس عہد کا مایۂ ناز ہے۔ جس کا حال
کسی قدر تفصیل سے لکھا جائے گا۔ ایک امر اور یاد رکھنے کے قابل ہے وہ یہ کہ
مذہبی تصانیف اس دور میں بھی ہوتی ہیں مگر علما کی عبارت ان انشا پردازوں سے
بالکل جدا ہے۔ خصوصاً مسائل فقہ تو ایسی عجیب طرز میں لکھے جاتے ہیں کہ سمجھنا
دشوار ہو جاتا ہے کیونکہ اصولِ فقہ کی تحقیق اس دور میں حد کمال تک پہونچ گئی
ہے اور علمائے ملت کا ذوق اس فن شریف کی طرف اس قدر بڑھ گیا ہے کہ
سیدھے سے سیدھا مسئلہ بھی اصولی اور منطقی زنجیروں میں جکڑا نظر آتا ہے۔
کاش! یہ طبقہ بھی سادہ نویسی کی طرف مائل ہو جائے تو دورۂ حاضرہ کا انقلاب
یکساں نظر آئے۔ اب ہم فتحعلی شاہ کے زمانے سے چند خاص خاص شعرا
اور مصنفین کا حال شروع کرتے ہیں کیونکہ اسی وقت سے اطمینانی حالت
ایران میں پیدا ہوئی اور یہ انقلاب ظاہر ہونے لگا۔

ملک الشعرا صبای کاشانی۔ فتحعلی خاں نام۔ فتحعلی شاہ کے زمانے
میں سرگروہ شعرا تھے۔ رعایات لفظی و معنوی کا بہت شوق ہے۔ مثنویاں شہنشاہ
نامہ و خداوند نامہ وغیرہ نظم کیں اور قصائد مدحیہ بادشاہ اور امرا کی تعریف میں
کہے۔ ان کے بیٹے عندلیب بھی بعد کو ملک الشعرا ہوئے تھے۔ دونوں کا کلام
ایران میں شوق سے پڑھا جاتا ہے چند منتخب اشعار نقل کئے جاتے ہیں

جن سے اندازہ ہوگا کہ دورِ جدید کے پیشروؤں کو اسی رنگ کا ہونا چاہیئے۔

ایک توحیدیہ قصیدے کی ابتدا یوں کی ہے:-

تعالی اللہ خداوندِ جہاندارِ جہاں آرا کہ شد آشکارا رنگِ گل ز خار و گوہر از خارا
مرصع کرد بر چرخ زبرجد گوہرِ انجم معلق کرد بر خاک بطاقِ گنبدِ مینا
ز فضلش شاہدِ شام آمدہ با طرۂ عنبر[۱۲] ز فیضش بانوئے صبح[۱۲] آمدہ با غرۂ غرا[پیشانی روشن ۱۲]
نشاندہ باغبانِ قدرتش در روضۂ ہستی ہزاراں سروِ مستظر ہزاراں ماہ رو آسا
بغمزہ غارتِ تقوی بہ ایما آفتِ ایماں بہ سیما لالۂ سوری بگیسو عنبرِ سارا
ہمہ کافر ولے آتش فروزِ ملتِ مؤمن ہمہ ناداں ولے سرمایۂ سوز و انشِ دانا
وجودِ اوست چوں دریا و موجودات امواجش ولے گر نیک بینی نیست موجودے بجز دریا

خداوند نامہ میں جنگِ خندق کے حال میں اُس مقام سے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں جہاں عمرو بن عبدود مبارز طلب ہوا ہے اور علی بن ابیطالبؑ نے رسول مقبول صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اذنِ جہاد مانگا ہے:-

کہ شیرِ خدایا بیازید چیست کہ شاہا بہ ستم انکہ لبیرود چیست
پیمبر سرودش کہ عمرو است ایں کہ دستِ یلی آختہ ز آستیں
علی گفت کاے شاہ اینک منم کہ یک پشہ شیرست در چشمم
بر او آفریں خواند و خواندش بمہر کہ پاید تو دادار گرداں سپہر
بسر بست دستار از پاک دست کشادِ دو گیتی نہانش بدست
ہمش داد شمشیرِ رخشاں بجنگ ہمش گفت فیروز بادی بجنگ
پس آں شیرِ یزداں پیادہ چو شیر بمیدانِ آں اہرمن شد دلیر
چو با او زمین و ہوا گشت تنگ بیاورد ہمرا بمیدانِ جنگ

حقیقت میں یہ مثنوی بے نظیر ہے۔ لہجہ اور زور بالکل فردوسی کا ہے بلکہ

لطف شاعری کو باقی رکھتے ہوے روایات کا نہایت صحیح ترجمہ کیا ہے اور حتی الوسع بضرورت شاعری بھی حقیقت سے زائد نہیں لکھا ہے۔ بعض مقامات پر لفظی ترجمہ نہیں ہے مگر غرض اور اصلیت وہی ہے جسے "زبان حال" سے تعبیر کرنا چاہیے۔ مثلاً اسی مکالمہ میں رسول اللہ صلعم نے فرمایا تھا ھذا عمرو اور امیر المومنین نے جواب دیا تھا انا علی لیکن ان مختصر الفاظ میں سوال و جواب سے غرض دونوں کی شجاعت کا اعلام ہے۔ شاعر نے پہلے مصرعوں میں ترجمہ رکھا اور دوسرے مصرعوں میں بزبان شاعری تفسیر کر دی ہے۔ فافہم۔

نشاط اصفہانی

میرزا عبدالوہاب نشاط اصفہانی (المتوفی ۱۲۴۴ھ) فتحعلی شاہ کے دربار میں نہایت معزز تھا اور معتمد الدولہ خطاب تھا۔ فلسفیانہ رنگ اسکی ذات سے اس دور میں مقبول ہوا۔ صاحب مجمع الفصحا کا خیال ہے کہ اس جامعیت کا آدمی مشکل سے ملتا ہے۔ فصاحت کلام اور شوخئ طبع میں بھی کسی سے کم نہ تھا۔ ایک مرتبہ موسم بہار میں عید آئی ہے۔ اس نے قصیدہ نظم کیا اور اُس کی تمہید میں اس کا نقشہ دکھلایا:—

ہر لالہ ژالہ می چکد از ابر مشکفام	خوش تر ز ژالہ بادۂ و بہتر ز لالہ جام
صبح است و بزم عید و نے مطرب بہ بانگ	دولت مدید و بخت سعید و جہاں بکام
گلزار را طراوت و ایام را نشاط	افلاک را سعادت و آفاق را نظام
باشد حلال توبہ، نباشد اگر زمے	باشد حرام بادہ، نباشد اگر بجام

متاخرین کی نازک خیالی کا رنگ اس کے کلام میں کبھی کبھی آجاتا ہے چنانچہ اس قصیدے میں بھی یہ شعر کہہ گیا ہے:—

از فیض باد و لطف ہوا جادواں زبید	نقشے اگر بر آب نگارند در منام (خواب)

حکیمانہ مذاق خاص طور سے محبوب تھا۔ آفرینش کے حال میں ایک قصیدے کی

لہید کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں :-

بزم غیب از شمع ذاتش چوں منور داشتند
پردہ داران صفاتش پردہ بردر داشتند

واست برنا محرماں پیدا شود حسنِ ازل
محرمانش صدرہ از اول نہاں تر داشتند

شاہدانِ غیب را دادند اطوارِ ظہور
روئے شاں پس در ظہورِ خویش مضمر داشتند

خامۂ اظہار چوں بر لوح امکاں نقش زد
از نخستیں صورتِ نوری مصوّر داشتند

گاہ خواندندش محمدؐ گاہ گویندش علیؑ
گہ بعقلِ اوّلیں او را مُعبّر داشتند

نفسِ کُل کز سایہ اش طبع ہیولیٰ پایہ یافت
مقتبس از نورِ آں فرخندہ جوہر داشتند

واندراں نور آنچہ از نقصان و پستی یافتند
عرش نامیدند و زاں کرسی فروتر داشتند

از کفِ دود و ہیولیٰ از پسِ بگداختن
چرخ اخضر بر فراز ارضِ اغبر داشتند

خیر و شر کے متعلق کہتا ہے :-

پیشکاران ازل کز پیشگاہ لم یزل
نقشہا ہر سو رواں در دفعِ ہر شر داشتند

تا نگوئی خیر و شر بے عزمِ شان آمد پدید
یا بہ پنداری کہ بے موجب بسرِ شر داشتند

فعلِ شاں بر مقتضائے قابل آمد در وجود
زاں ستمکش خواستنداں ہر ستمگر داشتند

می‌زنی شیشه‌ها را پیش کم نزدیک شو دور — در خور یک جو دہ پر تو سے از نالش خورد اشکستند
انبساطات وجود از اعتبار ایشان بود — ہمچو طفل در قریب و تجدد مہر انور داشتند
درمیکوئی اعتبار سے کہ اثر آمد پدید — گو ہم ایں را آشکار ہم او بام مظہر داشتند

کر پڑو کچھ دقتیں صاف ہے:-

از پئے تعظیم دو عالم در پئے ہم یک بیک — شاہ بر شاہ و پیمبر بر پیمبر داشتند
در ظہور احمدی ختم نبوت خواستند — سلطنت را ختم بر شاہ مظفر داشتند

غرض اس قسم کی تمہیدیں اکثر قصائد کے کلام میں ملیں گی اور ظاہر ہو جائے گا کہ یہ دور کتنا متقدمین کا دلدادہ اور متاخرین سے کشیدہ ہے۔

وصال شیرازی - مرزا شفیع نام اور مرزا کوچک لقب۔ خوبصورت اور خوش آواز شاعر تھا۔ روحانیت میں میرزا ابوالقاسم شیرازی سے ارادت تھی۔ اس کی محفل میں اصحاب حال کا مجمع رہتا تھا۔ خوشنویسی میں بھی کمال تھا اور بڑے بڑے خطاط استاد مانتے تھے۔ ناموافقت زمانہ نے گوشہ نشین کر دیا تھا۔ ۱۲۶۲ھ میں انتقال کیا۔ ایک دیوان قصائد و غزلیات کا یادگار ہے اور ایک مثنوی وحشی کی شیرین و فرہاد کا تتمہ اور ایک پوری مثنوی بزم وصال ہے۔ ناظرین کے لئے ایک مشکل ردیف کا قصیدہ منتخب کیا جاتا ہے۔ ممدوح کی تعریف میں کہتا ہے:-

بہر چہ مہر است منکر چشمہ از تیغ آتش آب — کہ مہر و ماہ از دو انتخار آتش و آب
بطبع داوری بہار در سرنگ زہی نگار — زہے بہار بہار و نگار آتش و آب
بدون گوئی لعاب بار عنبر و بان — بہ بوئے گوئی مشک تتار آتش و آب
کند بجائے خشم و کند بجائے رفق — شگفت نیست کہ ہست از تبار آتش و آب
بطبع ہر کہ گذر کرد چون خلیل و کلیم — ہراس می‌نکند از گزار آتش و آب

ایک قصیدہ خاقانی کے مشہور ہے با آتش۔ گرچہ آتش والے قصیدے کے

جواب میں کہا ہے اور اپنے مرشد میرزا ابوالقاسم کی تعریف کی ہے لیکن چونکہ
دونوں میں کوئی نسبت نہیں لہذا اُس کا ذکر ترک کیا جاتا ہے۔ بعض قصائد
میں واقعہ نگاری اچھی کی ہے اور بعض وعظیات بھی غنیمت ہیں۔ مثنوی
شیریں فرہاد کے بعض اشعار نقل کئے جاتے ہیں جن میں فرہاد کی نالہ وزاری
کا حال ہجر شیریں میں دکھایا ہے:-

فغاں بر داشت کای تلخ کامِ من — ببیں بے طاقتی آرامِ من دہ
پنہاں عشق فسونگر بستہ دستم — کہ خود ہم بر نگردم بت پرستم

ایک باغ کا حال لکھتا ہے:-

بہشتے کوثر اندر چشمہ سارش — دمِ عیسیٰ نہاں در جوئبارش
فضایش چوں سرائے میفروشاں — ہوایش چوں دماغِ بادہ نوشاں
زمینش لالہ ہائے آتشیں رنگ — سر آوردہ بروں چوں آتش از سنگ

یغمائے جندقی

یغمائے جندقی۔ میرزا ابوالحسن نام۔ قریہ جندق کے شرفا میں سے ہے۔
درسیات متداولہ عراق میں ختم کئے۔ اور زندگی شہزادوں اور امیروں کی
صحبت میں بسر کی۔ ابتدا میں ذوالفقار خاں کا منشی تھا جسکی فحاشی کی وجہ
سے ہزل گوئی کی عادت پڑ گئی تھی اور ایک مجموعہ ہزلیات کا تیار ہو گیا تھا
جس کا نام سرداریہ ہے۔ غزل گوئی کا بھی شوق تھا اور اپنے زمانے کے رنگ
میں شعر کہتا تھا۔ بعض شعر درج کئے جاتے ہیں:-

زاہدا در پائے تو پیچم است کہ دیوانہ شوم — آں بلبلم اگر ایں سلسلہ بر پائے دگر

باخراب از غم و بیخانہ زرشک آباد است — ناصح از بادہ سخن کن کہ نصیحت یاد است
گوش اگر گوش تو و نالہ اگر نالہ من — آنچہ البتہ بجائے نرسد فریاد است

فی الحقیقت یغما کا امتیاز خطوط نگاری میں ہے۔ زبان خالص فارسی ہے اور
ترکیبیں نادر الوجود۔ اس رنگ میں دوسرا لکھنے والا نظر نہیں آتا۔ ظرافت
اور جودت ہر جملے سے ٹپکتی ہے۔ سلاست زبان کے ساتھ پختگی بے حد ہے۔ انھیں
نادر ترکیبوں کے مجموعے کو "مجعولات یغما" کہتے ہیں۔ مثلاً یہ لکھنا ہے کہ مختلف الاقوام
اور مختلف الخیال لوگ جمع ہو گئے ہیں اور جھوٹ سچ اپنے اپنے رنگ میں بیان
کیا کرتے ہیں مگر ان پر غور کرنے والا کون ہے اور اچھے برے میں تمیز کرنے والا
کہاں ہے۔ اس مطلب کو ایک خط میں یوں ادا کرتا ہے :-

"گروہے گوناگون، ہر یک براہ و رنگے دیگر، دریں انجمن، جائے و
بارے، دارند و بر آئین و آہنے بہتر یا بدتر، گفت و گذارے،
گرم و سرد میبالانید، و بخشند و خام میسرانید، وے آنکہ گوش دارد
کیست؟ یا ویلہ (پھوکنا) سگ را از سرواے (وحی) سروش (فرشتہ) بازداند (امتیاز کرے) کدام؟"

آگے بڑھ کے کہتا ہے :-

"آسودہ نزی (آرام سے زندگی بسر کر) و آرام باسے (آرام و چین کر)
کہ ایں قبیلہ گائی و خر را از سر تا دم شناختہ ام و نہادہ اند و یلہ
ایں روبہان بلہ (دلیر) و پیلۂ (گردہ) گرگان بے نظلہ (بد معاش)
یک گلہ (سب کو) گوش تا شہم پرداختہ (اچھی طرح سمجھ لیا ہے)۔
بیگو بیند و نمی شنویم بیبیخوا ستند و نمی کردیم"

اسی انداز پر بہ کثرت خطوط لکھے ہیں جو چھپ گئے ہیں۔ عربی کا ایک
لفظ نہیں۔ سب خالص فارسی ہے اور اتنی فصیح و شیریں کہ اگر غور نہ کرو
تو یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ایسی سخت اور دشوار صنعت کا التزام کیا ہے
اور ظرافت و متانت دونوں کو قائم رکھا ہے۔

نشاطی

نشاطی ہزار جریبی مازندرانی۔ (المتوفی ۱۲۶۲ھ) فتح علی شاہ کا مداح ہے اور محمد شاہ کی تعریف میں بھی قصائد کہے ہیں اسکے کلام میں حقائق و معارف اور مضامین فلسفیانہ علاوہ مناقب اہلبیت وغیرہ کے اکثر نظم ہوئے ہیں طبیعت جدت پسند ہے۔ نئے راستے شاعری کے لئے ڈھونڈھتا ہے۔ مثلاً ایک قصیدہ ملیہ کہتا ہے۔ تشبیب میں دہریوں کی رد نہایت لطف سے کی ہے۔ منتخب اشعار نقل کئے جاتے ہیں:۔

این جنبش آسماں چہ چیز است   وین گردش اختراں چہ چیز است
این نعش و نبات و این ثریا   این فرقد و فرقداں چہ چیز است
این کشتی چرخ در یم دہر   بے لنگر و بادباں چہ چیز است
این حرکت ابر پیل پیکر   بے حربۂ پیلباں چہ چیز است
این میل بخواب و خور چہ میل است   این ذوق بہ آب و ناں چہ چیز است

غرض یوں ہی کائنات کو گنواتا گیا ہے جن میں سے ہر ایک چیز ایک دلیل خاص ہے وجود ذات واجب پر دلالت کرتی ہے جو فلسفہ و کلام جاننے والوں سے پوشیدہ نہیں۔ پھر کہتا ہے:۔

با اینہمہ صنعہا بہ صانع   بحث تو درین میاں چہ چیز است
در ہستی ذات او چہ شک است   در پیش یقین گماں چہ چیز است

ایک اور نئی تمہید یوسف خاں سپہدار کی تعریف کے لئے پیدا کی ہے:۔

ہر کہ تیغے بر کشد در رزم و پاداری کند   فتح او را یاری و نصرت مددگاری کند
آنکہ رخ برتابد از وحشت و نہد سر در گریز   روز روشن بر سپاہ خود شب تاری کند
ہر کرا شمشیر تیز و نیروی بازو نیست   چوں گزارد پائے در میدان و سرداری کند
رستمے باید کہ تا اسفندیار سے را بہ تیر   افگند از پائے و خوں از چشم او جاری کند

حیدرے باید کہ تا خشم آرد و ز انگشتِ خویش | قمر را دو پارہ تن زانچہ از کراری کنند
آدمی باید کہ شیطانے ز رحمانی فتد | یوسفے باید کہ در ایران سپہداری کنند

اب معشوق کا حال ممدوح سے بیان کرتا ہے :-

مہر تو را دیدم زلیخا طلعتے در مصرِ حسن | کاں زلیخا بیند ار یوسف خریداری کنند
ترکِ مستے کز کمانِ ابرو و تیرِ مژہ | گر زند صد زخم بر دل یک بیک کاری کنند
من سخن از وصل با او گویم و او از فراق | من بشیرینی سخن او تلخ گفتاری کنند

اس کے بعد حسنِ طلب کا انداز بھی عجیب ہے ۔ کہتا ہے یا تو اپنے غلام سے کہہ دے کہ مجھے شہر بدر کر دے :-

یا بگو دوزند چشمِ من کہ بر روی نکو | کم نگہ اندازد و دل را نگہداری کنند
یا طبیبی جو کہ او داند دوائے دردِ عشق | تا منِ شوریدہ را چندیں پرستاری کنند
یا مرا زر دہ بداں مبلغ کہ آں زر بائے دل | گیرد و آزاد از دامِ گرفتاری کنند

اس میں شبہ نہیں کہ یہ عاشقی نہیں بلکہ ہوسناکی ہے ۔ لیکن فصاحتِ بیان ، سلاستِ زبان ، جدتِ اسلوب وغیرہ کی مثال میں یہ اشعار ضرور امتیاز رکھتے ہیں ۔ ایک اور تمہید اور گریز ملاحظہ ہو :-

اے رفیقِ مہرباں و اے شفیقِ کارداں | چند بیکاری بیا زیں کار با کارے گزیں
خواہی ار یابی تو زیں سرما برو گرما بیاب | خواہی ار بینی تو احمد را برو یثرب ببیں
خواہی ار سلطاں شوی شو سوی یک گلشن بر شرق و غرب | خواہی ار خاقاں شوی تسخیر فرما روم و چیں
خواہی ار حاتم شوی زر آنچہ داری دہ بخلق | خواہی ار قاروں شوی سیم آنچہ داری کن دفیں
خواہی ار کافر شوی رو پیشِ [illegible] الاشقیا | خواہی ار ایماں بری رو پیشِ امام المتقیں
سرورِ غالب علی بن ابی طالب کہ ہست | حجتِ حق ساقیِ کوثر امیر المومنیں

حکیم قاآنی

قاآنی ۔ میرزا حبیب اللہ بن میرزا ابوالحسن گلشن ۔ اسی شاعر خیمہ

خطۂ شیراز کے رہنے والے تھے جس نے سعدی اور حافظ ایسے آفتاب و ماہتاب آسمانِ نظم و نثر کو عطا کیے۔ گیارہ برس کی عمر میں باپ کا سایہ اٹھ گیا اور تکمیل درسیات میں بڑی دقتیں آئیں۔ آخر مشہد مقدس جا کے علوم متداولہ میں دستگاہ کامل حاصل کی۔ شعر و شاعری کا فطری شوق تھا، رفتہ رفتہ ترقی پر آگیا اور شاہزادہ شجاع السلطنت حسن علی میرزا پسر سوم فتح علی شاہ میرزا نے شہرت کلام و کمالِ سخن سے اپنے دربار میں بلایا اور ندیم خاص بنایا۔ ایک بار شہزادہ اپنے باپ کی خدمت میں گیا تو قاآنی کو بھی اپنے ہمراہ لے جا کے پیش کیا۔ شاہ جہاں نے مجتہد الشعرا خطاب دیا اور خلعت و انعامات سے سرفراز کیا۔ فتح علی شاہ و محمد شاہ قاچار کی مدح میں قصائد نظم کرکے حسان العجم کا لقب حاصل کیا اور ماہواری وظیفہ لیا بلکہ کتاب پریشان (جواب گلستان سعدی) کا تحفہ بھی اسی بادشاہ کے نام پر کیا۔ سنہ ۱۲۴۹ھ میں فرانس کے لوگ حکم شاہی سے سفیر ایران ہوئے۔ قاآنی نے ان سے فرانسیسی سیکھی اور اتنی عمدہ بولنے لگا کہ بالکل اہل زبان معلوم ہوتا تھا۔ پھر سیاحت ہندوستان کا شوق ہوا مگر کامیابی نہ ہوئی اور وحشت ارزن سے واپس جانا پڑا۔ محمد شاہ کے بعد (سنہ ۱۲۶۴ھ میں) ناصر الدین شاہ تخت نشین ہوئے۔ ان کے زمانے میں اور بھی عروج ملا اور ملک الشعرا خطاب ہوا۔ سنہ ۱۲۷۰ھ (مطابق سنہ ۱۸۵۴ء) سال وفات ہے اور مدفن دار الخلافہ طہران۔ خود ناصر الدین شاہ شہید اس کی تجہیز و تکفین کے متکفل ہوئے۔ بستر مرگ پر توبہ و استغفار کے اثر سے یہ شعر نظم کیا تھا:—

شرمندہ از آنیم کہ در روز مکافات   اندر خور عفو تو نکردیم گناہے

قاآنی کا عروج محمد شاہ کے عہد میں ایسا ہی تھا جیسا عنصری کا محمود کے دربار

ہیں تھا مگر حلم و تواضع نے نظرِ خلق میں بھی مقبول و محبوب بنا دیا تھا نیکدلی اور خوش مزاجی کے ساتھ ظرافت اور شوخی نہایت مزہ دیتی تھی۔ گلستاں کا جواب پریشان بھی اسی شوخی کا نتیجہ ہے۔ عجیب مضحک قصے لکھے ہیں۔ اگر فحش نہ ہوتے تو یادگار رہتے۔ زبان کی پختگی اور ترکیب کی استواری ہر جگہ موجود ہے نمونہ کے لئے ایک صاف عبارت نقل کی جاتی ہے جس میں اپنے والد کے انتقال کا ذکر کیا ہے:۔

"یازدہ سالہ بودم کہ پدرم گلشن راشمع کمال بنور جمالش روشن بود خارے در پا رفت و ہنوز خارش در پا بود کہ کارش از دست شد[۱] چہ بمقتضائے ہرم[۲] ازاں خارش در پا ورمے حادث شد کہ طبیبان بدرمانش درماندند[۳] و اذا جاء اجلہم لا یستاخرون ساعۃ و لا یستقدمون[۴] فروخواندند"

فن شعر میں بھی ظرافت طبع اکثر مقامات پر ظاہر ہوئی ہے۔ وہ ہکلوں کا مباحثہ اُنھیں کے لہجے میں نظم کیا ہے:۔ ایک بڈھا ایک لڑکا۔ جب فیصلہ ہوا تو:۔

طفل گفتا خدارا صصصد بار شششکر کہ برستم بجہان از ملال و محن
ممن ہم گگگنگم ممثلِ تُتُتُتُو توتوتو ہم گگگنگی ممثل ممن

یہ تو معلوم ہو چکا ہے کہ قاآنی نے فرانسیسی میں دستگاہ کامل حاصل کی تھی اور مغربی انداز نظم و نثر سے اچھی طرح واقف ہو گیا تھا۔ علاوہ بریں عربی اور ترکی میں بھی کسی اہل زبان سے کم نہ تھا۔ فارسی مادری زبان تھی اور وہ بھی فصحائے شیراز

---

[۱] دیکھو کتنا پختہ تقابل ہے [۲] بڑھاپا۔ [۳] درماں اور درماندن کی لطافت دیکھو۔ [۴] جب اُن کا وقت مقرر آجاتا ہے تو نہ تاخیر کر سکتے ہیں نہ تقدیم۔ الآیہ۔

کی۔ پھر معقولات ومنقولات پر بھی عبور تھا خصوصاً فلسفۂ اشتقاق لغت (فلالوجی)
وغیرہ کا تو پورا ماہر تھا۔ فن شعر میں جو اس جامعیت سے کام لیا تو فخر اسلاف و
اخلاف ہو گیا۔ جس رنگ پر آ گیا معلوم ہوا کہ اسی کا بادشاہ ہے۔ ذوق سلیم
نے قدما کا طریقہ محبوب بنا دیا۔ سلاست و روانی اُن سے اخذ کی۔ نازک
خیالی اور استعارہ آفرینی متوسطین و متاخرین کی پسند آئی اور اُسے بھی اپنے
کلام میں جگہ دی مگر بقدر اعتدال یعنے جہانتک "آمد" رہے اور فصاحت و
سلاست پر حرف نہ آسے۔ صنائع و بدائع کا بھی بیحد شوق ہے مگر نظر تنقید
دیکھ لے گی کہ معنویت کے عالم میں سوا اُس لفظ کے جو بغرض تجنیس یا تجنیس
وغیرہ لایا گیا ہے دوسرا لفظ اُس سے بہتر ادائے مطلب کے لئے ملنا دشوار
تھا۔ ان پر استواری ترکیبات اور پختگی تخییل نے سونے میں سہاگے کا
کام کر دیا ہے۔ زبان قدیم اور خالص فارسی کا عاشق ہے متروک الفاظ و
محاورات کو واپس لا رہا ہے اور زبان پر تسلط اس قدر ہے کہ ان وقیانوسی
چیزوں کو عہد جدید کی آرائش کا جز دینا لیا ہے۔ غرض اس مجموعی حالت
نے جو کیفیت اسکے کلام میں پیدا کر دی ہے اُس کا مثل فارسی لٹریچر میں
نہیں۔ اگر فردوسی کا شاہنامہ عہد قدیم میں محیر العقول تھا تو قاآنی کے قصائد
اس دورۂ حاضر میں نقادوں کی نگاہیں خیرہ کئے ہیں۔ اب ہم بعض اصناف کو
ذرا تفصیل سے لکھتے ہیں۔ پہلا قصیدہ کلیات میں یوں شروع ہوا ہے:۔

دوشم ندا رسید ز درگاہِ کبریا ‌ ‌ ‌ ‌ کای بندہ کبر ہنر از پی مجز بار یا

خوانی مرا خبیر و ثقلاوت تو آشکار ‌ ‌ ‌ ‌ دانی مرا بصیر و خطائے تو برملا

زبان اتنی صاف ہے جتنی سعدی کی۔ پھر مواعظ و معارف کے فلسفۂ اخلاق کے
حدود میں رہ کر دریا بہا دئے ہیں۔ عبد و معبود کے تعلق کا سا نازک مسئلہ

گفتگو کے انداز میں آ کے پانی کر دینا اسی کا کام تھا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ دو شخص
باتیں کر رہے ہیں اور وہ بھی عام فہم زبان میں۔
اسی طرح ایک قصیدہ میں شاہنامہ کے واقعات کی تلمیح کا التزام کیا
ہے حقیقت میں نہایت شاندار ہے اور قابل نقل مگر بخوف طوالت ترک کیا
جاتا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ قاآنی اس عہد کا گل سر سبد ہے۔ جب قدرت کا
نقشہ کھینچتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود کھڑا ہو کر سیر کر رہا ہے اور لذت کے
جوش میں آ کے بیان کرتا چلا جاتا ہے:۔

بگردون تیرہ ابرے بامدادان برشد از دریا
جواہر خیز و گوہر ریز و گوہر بیز و گوہر زا

ذرا انصاف سے کہنا یہ ترصیع ہے یا حسن تکرار یا پُرجوش دل کی آواز۔

چو چشم اہرمن خیرہ، چو روی زنگیان تیرہ
شدہ گیتی ہمہ چیرہ، بمغز ہوش علت سودا

دیکھو خیرہ۔ تیرہ۔ چیرہ محض مساوات الراسین یا تسجیع کے لئے نہیں ہیں بلکہ
جس کیفیت کا ذکر مقصود ہے ان سے بہتر الفاظ اس کے ادا کرنے کے لئے
مل نہیں سکتے۔ آگے کہتا ہے کہ کالے کالے بادل۔ [illegible] شفاف قطرے
پانی کے برسا رہے ہیں۔ ذرا تشبیہات کی لطافت دیکھو۔ زبان کی روانی
اس پر لفظی صنعتیں مستزاد:۔

تنش با قیر آلودہ۔ دلش از شیر آ[illegible]دہ
درو دل سو [illegible] دہ۔ بدل سو لولوئے لالا
بدل [illegible] زندان۔ گہے گریان گہے خندان
چو در بزم طرب رندان ز شور نشۂ صہبا

تشبیہات

معنویت پر غور کرو - ہر قطرہ جو اس وقت ابر کے اندر چھپا ہوا ہے حقیقت میں ایک
ایک پھول کا سرمایہ ہے اور اگر وہ قطرے اولے ہیں تو بالکل مختلف الاشکال
پھولوں کی صورت میں فطرۃً موجود ہیں - ان قطرات کے مجموعے کو گلشن کہنا
کتنا دلاویز مبالغہ ہے اور یہ سیاہ دیواریں ابر کی اس باغ کو اپنی قید میں لئے
ہوئے ہیں - زندان نہیں تو اور کیا ہیں - پانی برسنا "گریاں" ہونا ہے اور بجلی
چمکنا "خنداں" ہونا - اس تضاد کے جمع ہونے کا لطف کتنا زائد ہے - محض
گریاں و خنداں قافیہ بندی کے لئے نہیں ہیں - پھر اس ہنگامے میں شراب
نوشی کا یاد آجانا بھی لطف سے خالی نہیں - شاید فطرت نے خود مستانہ روش
اختیار کی ہے - وہ عالم ہے جیسے شراب پی کے سرمست کبھی ہنستے ہیں کبھی
روتے ہیں اور ہے محض تشنے کا زور اور کچھ نہیں - ایک قصیدے میں پانی برسنا -
ہوائیں چلنا - بجلی کی چمک - رعد کی گرج انھیں خصوصیات کو قائم رکھتے ہوئے
بیان کی ہے - الفاظ کی آوازیں خود بتا رہی ہیں کہ بڑے زور و
شور سے پانی برس رہا ہے اور دور دور تک یہی عالم طوفان ہے :-

فرو بگرفته گیتی را بباغ و راغ و کوه و در — نم ابر و دم باد و لفت برق و غو تندر

پورا قصیدہ ایک ہی زور میں ہے - ایک مخمس میں اور جدت تشبیہ کا لطف دیکھو -

بنفشہ رستہ از زمیں بطرف جوئبار ہا — دیا گسستہ حور عین ز زلف خویش تار ہا
ز سنگ اگر ندیدۂ چساں جہد شرار ہا — ببرگہائے لالہ بیں میان لالہ زار ہا
کہ چوں شرارہ می جہد ز سنگ کوہسار ہا

بہار کا سماں ہے - رگوں میں خون دوڑ رہا ہے - آتش عشق بھڑکی - دل کے
ولولے بڑھنے لگے - شگوفے بھی ہجران کشیدہ نظر آتے ہیں - کہتا ہے :-

ندانمار ز کودکی شگوفہ از چہ پیر شد — نخوردہ شیر عارضش چرا برنگ شیر شد

گماں برم کہ ہمچو من بدامِ غم اسیر شد   زپا فگندہ دلبرش، چہ خوب دستگیر شد
بلے! چنیں برند دل زعاشقاں نگار ہا

اب اپنی ہجر کی مصیبت یاد آئی۔ لوگ معشوقوں کے ساتھ باغوں میں گھومتے ہیں اور جام پر جام پیتے ہیں۔ عاشق مہجور اپنے حالِ زار کو بیان کرتا ہے:۔

دریں بہار ہر کسے ہوای راغ داردا   بیادِ باغ طلعتے خیالِ باغ داردا
بہ تیرہ شب زجام مے بکف چراغ داردا   ہمیں دلِ من است و بس کہ درد و داغ داردا
جگر چو لالہ پُر زخوں زعشقِ گلعذار ہا

دیکھو کیا عمدہ تشبیہ دی ہے۔ وصل کے زمانے میں اندھیری راتیں شراب کے جام سے روشن کی ہیں اور ہجراں نصیب کے پاس اپنا دل ہے اور بس! جسمیں درد ہیں اور داغ۔ اس موسم بہار میں اس کا لالہ یہی ہے کہ سرخ بھی ہے اور داغدار بھی ہے۔ ایک اور نئی تشبیہ سنو:۔

بہار را چہ می کنم چو رفتہ زیرِ بہارِ من   کنارہ کردم از جہاں چو او شد از کنارِ من
خوشا و خرم آں دمے کہ یار بود یارِ من   دو زلفِ مشکبارِ او و چشمِ اشکبارِ من
دو چشمہ کہ اندر و شنا کنند مار ہا

اس میں شک نہیں کہ قاآنی کی غزلیں بالکل قصیدہ کا جزو معلوم ہوتی ہیں اور شانِ غزل سے کسی قدر خالی لیکن یہ مقامات اُس کی تلافی کے لئے کافی ہیں غزل کیا۔ واسوخت میں بھی یہ سوز و گداز پیدا ہونا مشکل ہے۔ ممکن ہے کہ غزل کے لئے یہ معذرت کی جاسکے کہ متقدمین کی تقلید کے جوش میں تغزل کا انداز بھی انھیں کا اختیار کر لیا اگرچہ یہ نہ چاہیئے تھا۔

قاآنی کی طبیعت مشکل پسند بھی ہے اور دقیق مسائل بیان کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے مگر عنوانِ ادا ایسا سلجھا ہوا کہ سخت سے سخت مسائل پانی ہو جاتے ہیں۔

یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دقیق مسئلہ بیان ہی نہیں کر رہا ہے۔ مثال کے طور پر ایک قصیدے کے دو تین اشعار لکھے جاتے ہیں:-

کشودی زلف تیرہ گشت جہاں را قیروان کردی

نمودی چہرہ آمد زمیں را آسماں کردی

واقعہ یہ ہے کہ جب عشق کامل ہوتا ہے تو عاشق ہر چیز دنیا کی معشوق کے حالات پر نظر کرکے دیکھتا ہے۔ اگر اس کا چہرہ چھپ گیا تو دنیا اندھیر ہے۔ اگر وہ سامنے ہے تو زمانہ روشن ہے۔ اس مسئلہ کو شاعری کا لباس پہنایا ہے۔ سیاہ زلفیں چہرۂ معشوق پر بکھرا کے دنیا سیاہ کر لی۔ پھر انھیں زلفوں کو ہٹا کے نورانی چہرہ دکھا اور زمانہ اپنے لئے روشن کر لیا۔ یا ایک اور مسئلہ لو۔ دنیائے عشق کے مصائب ایک طرف جو معشوق کے حرکات سے واقع ہوتے ہیں اور ہماری مجازی دنیا کے مصائب دوسری طرف جو آسمان کی حرکت سے واقع ہوتے ہیں۔ ابھی سن چکے ہو کہ عاشق کی ساری دنیا معشوق ہے۔ اگر معشوق راضی ہے تو جور فلک کی پروا نہیں۔ اگر معشوق ظلم کر رہا ہے تو جور فلک اس پر گویا ہوتے ہی نہیں۔ اتنے پست معلوم ہوتے ہیں گویا اس کی مظلومی پر آسمان بھی ترس کھا رہا ہے:-

ز بس نامہربانی با من اے آرام جاں کردی

فلک را با ہمہ نامہربانی مہرباں کردی

فلسفہ کا مسئلہ ہے کہ عشق کامل بتدریج ہوتا ہے۔ پہلے مثلاً کسی خوبصورت چیز پر نظر پڑی تو وہ بھلی معلوم ہوتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ اسے بار بار دیکھیں اسے استحسان کہتے ہیں اور معشوق اس مرتبہ میں قاآنی کی اصطلاح میں "نگار" ہے یعنی خوبصورت۔ دوسرا درجہ جب آتا ہے تو یہ جی چاہتا ہے کہ ہمارے اقوال و افعال معشوق کی مرضی کے موافق ہوں۔ گویا اب دل لگ جاتا ہے۔ عاشق

رضا جو ہو جاتا ہے اور معشوق "دلبر"۔ یہ درجۂ **مودت** ہے۔ تیسرا درجہ **خُلّت** کا ہے۔ اس درجے میں پہونچ کے معشوق سے اتحادِ خیال اور اتحادِ مذاق ہو جاتا ہے۔ جو عاشق چاہتا ہے وہی معشوق چاہتا ہے۔ جو معشوق چاہتا ہے وہی عاشق چاہتا ہے گویا عاشق و معشوق "یار" ہو جاتے ہیں۔ چوتھا درجہ **عشق** ہے۔ اس میں عاشق کے ارادے اور ولولے معشوق کے عشق میں مستہلک ہو جاتے ہیں اور ایسا از خود رفتہ ہو جاتا ہے کہ معشوق کی جفاؤں میں بھی لذت پاتا ہے۔ اُسے ہجر و وصل میں بھی امتیاز نہیں رہتا۔ پانچوں درجے میں مرتبۂ شہودی نصیب ہر وقت معشوق نظروں میں ہے اور اُسی تصویر تصوّری سے وفا اور آرام دل سب کچھ حاصل ہوتا ہے۔ چھٹا درجہ **ولہ** ہے۔ یہ فنا فی المعشوق کا درجہ ہے خودی جاتی رہتی ہے اور بجز معشوق کچھ باقی نہیں رہتا۔ دیکھو اتنا بڑا مسئلہ چند لفظوں میں کس لطفِ تغزل کے ساتھ ادا کرتا ہے :۔

نگارا، دلبرا، یارا، دلآرا۔ وفادارا

خجل زیں نامہا بادی کہ مارا بے نشاں کردی

قاآنی کی شوخیِ طبیعت اختراعِ محاورات پر بھی آمادہ رہتی ہے مثلاً تن پروری سخن پروری تو بولتے ہی ہیں۔ وہ مدح پروری، شعر پروری وغیرہ نظم کر جاتا ہے اور نہایت لطف کے ساتھ۔ افسوس کہ کتاب طویل ہوتی جاتی ہے ورنہ قاآنی کی تنقید کا تقاضا تھا کہ پوری بحث اس کے کلام پہ کی جاتی۔ مولف نے تذکرہ و تبصرہ میں لکھا تھا کہ "در ہر کدام (شاعر) ہرچہ خوب تر است در کلام قاآنی باتناسب و ہمہ ور و اعجاز بچو معجزہ دیدہ می آید" لوگوں نے اس رائے کو قاآنی پرستی پہ محمول کیا۔ گیارہ برس کے بعد آج پھر نوبت اس گفتگو کی آئی مگر رائے میں کوئی تفاوت نہیں ہوا ہاں! بعض خصوصیات اور نظر میں آگئے جو اُس وقت تک

نفی تھے۔ آخر میں ایک اور صنعت نظم پر کچھ عرض کرتا ہے۔ صنعت سوال و جواب میں عنصری کا قصیدہ ”ہر سوالے کز ان لب سیراب، دوش کردم مرا بداد جواب“ بہت مشہور ہے کیونکہ ایک مصرعے میں سوال ہے دوسرے میں جواب اور یہی التزام آخر تک ہے بلکہ صفائے بندش اور شیرینیِ ادا سے اسے دلکش بھی بنا دیا ہے۔ قاآنی نے بھی یہ صنعت اختیار کی ہے اور ذوقِ سلیم نے اس کے لئے مرثیہ منتخب کر لیا ہے جس سے حزن و ملال کی ایک دل ہلا دینے والی کیفیت پیدا ہو گئی۔ قاعدہ ہے کہ اگر کسی دردرسیدہ سے کرید کرید کے کسی سانحۂ جانکاہ کے جزئیات پوچھے جاتے ہیں تو دل امنڈ آتا ہے اور تڑپ تڑپ کے زار و قطار رونے لگتا ہے۔ پھر مصائب بھی پوچھے گئے تو کشتگانِ نہرِ فرات کے۔ بار بار سوال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دریائے غم امنڈنے والا ہے۔ دیکھو کیا کام کرتا ہے اور کتنے سوال ایک ایک شعر میں مع جواب ذکر کرتا ہے:-

بارد چہ؟ خوں۔ دیدہ۔ چساں؟ روز و شب۔ چرا؟
از غم۔ کدام غم؟ غمِ سلطانِ اولیا

نامش چہ بد؟ حسین۔ ز نژاد کہ؟ از علی
مامش کہ بود؟ فاطمہ۔ جدش کہ؟ مصطفےٰ

دل تشنہ؟ شہید شد بکجا؟ دشتِ ماریہ۔
کی؟ عاشرِ محرم۔ پنہاں؟ نہ برملا

سیراب کشتہ شد؟ نہ۔ کس آبش نداد؟ داد
کو؟ شمر۔ از چہ چشمہ۔ ز سرچشمۂ فنا

امام زین العابدین کی اسیری اور تشہیر کا حال یوں پوچھتا ہے:-

بر تن لباس داشت؟ بلے اگرد رہگذر
بر سر عمامہ داشت؟ بلے از چوب اشقیا

سارا مرثیہ اسی طرز میں ہے جسے محاکات کی سچی تصویر کہنا چاہئے۔ سارا واقعہ نظروں میں پھر جاتا ہے اور دل بیچین ہوتا ہے۔ انصاف سے کہنا کہ محض صنعت سوال وجواب کے التزام کے لئے یہ رنگ اختیار کیا ہے یا ایک کارنامہ پیش کیا ہے۔

افسر قاچار

افسر قاچار۔ شہزادہ محمد رضا میرزا ابن خاقان فتحعلی شاہ ۱۲۱۱ھ میں طہران میں پیدا ہوے۔ ارباب فضل ومعرفت کی صحبت کا یہ اثر تھا کہ باوجود حاکم گیلان وغیرہ ہونے کے علوم وفنون کی طرف ہمیشہ توجہ رہی۔ غزلیں نہایت پاکیزہ اور صاف ہوئی ہیں اور طبیعت شوخ وجدت پسند ہے۔ چند منتخب اشعار نقل کئے جاتے ہیں:—

ز ہول روز قیامت بود چہ باک آنرا که صبح کرده به اندوه شام ہجران را

آنچه در وصف نگنجد صفت مشتاقیست رفت از اندازه سخن باز حکایت باقیست
ترسم آخر زکفت از بیم فراقت نرود نیم جانے که بامید وصالت باقیست

تا عکس ساقی آئینه افروز جام شد جز باده ہر چه بود به عالم حرام شد
گه مرغ دل بزلف تو زاری کند مرنج آری فغان کنند غریبان چو شام شد

طفلے نزند سنگ به دیوانه درین شہر عاقل بچه امید کند خانه درین شہر
زافسانهٔ عشق من شوریده سر افسر افسانهٔ مجنون شده افسانه درین شہر

آن یار که در کون ومکان میطلبیدیم چون گنج بویرانهٔ دل بود چو دیدیم
شد بسته به پیرہنے چو از پاے کشودیم بنشست بدل تیر چو از سینه کشیدیم

احمد قاچار

احمد علی میرزا ابن فتحعلی شاہ خاقان بھی نہایت خوشگو تھے۔ سعادت قلی خاں
(سعادت علی خاں ؟) برادر نواب آصف الدولہ وزیر لکھنؤ ایک بار خراسان میں
سفر کر رہے تھے کہ ترکمان ڈاکوؤں نے گرفتار کر لیا۔ بحکم شاہی احمد علی میرزا نے
انھیں رہا کرایا اور زرِ فدیہ ادا کیا۔ پھر ترکمانوں کی بھی پوری تنبیہ کر دی ۱۲۶۷ھ
میں رہگرائے ملکِ عدم ہوئے۔ چند اشعار منتخب کئے جاتے ہیں:-

آنانکہ روزِ ہجر لو دوزخ شمردہ اند — گویا ندیدہ اند شبِ انتظار را

فصلِ گل شد ہمہ مرغانِ چمن نغمہ سرائے — وائے بر حسرتِ آں مرغ کہ بے بال و پر است

باپ کی یاد میں کہتے ہیں:-

گر دو روزے بے حضورت زندگیست — حاصلِ ایں زندگی شرمندگی است

کاش ز اوّل خواجگی قسمت نبود — چوں نصیبِ ما در آخر بندگی است

رفت تا فتح علی شہ از جہاں — گشت آساں مرگ و مشکل زندگی است

فرہاد میرزا

فرہاد میرزا۔ فرزند نائب السلطنت ولیعہد مرحوم بن فتحعلی شاہ خاقان۔
دورۂ جدید کے اکمل افراد سے ہیں۔ ناصر الدین شاہ کے زمانے میں ان کا بڑا
عروج تھا اور اکثر مہمات سلطنت ان سے متعلق ہو جاتے تھے۔ سفر گرگان میں
بادشاہ کے ساتھ تھے۔ رات بھر میں ایک رسالہ اپنے باپ اور دادا کے حال
میں لکھ ڈالا جس میں ۳۲ حکایتیں ہیں اور انشا میں یہ صنعت رکھی ہے کہ
ہر حکایت سے ایک حرف ساقط کر دیا ہے۔ ایک میں الف نہیں ہے دوسری میں
بے نہیں۔ یہانتک کہ آخری حکایت میں یائے معروف و مجہول نہیں ہے۔
خلاصۃ الحساب شیخ بہائی کی شرح فارسی میں کی ہے اور ایک نصاب
انگریزی زبان کا تصنیف کیا جس میں دو ہزار لفظیں اس زبان کی آگئی
ہیں۔ سب سے زیادہ مشہور اور معتبر جغرافیہ جامِ جم ہے جو عہدِ حاضر کی

تصانیف میں خاص طور سے قابل قدر ہے۔ قصائد و غزلیات کا ایک دیوان بھی چھوڑا ہے جن کا اقتباس بخوف طول ترک کیا جاتا ہے۔

بمان علی کرمانی

راجی کرمانی۔ بمان نام۔ اصلاً مذہب زرتشت کے پیرو تھے۔ مسلمان ہوئے تو بمان علی نام رکھا گیا۔ علما و عرفائے کرمان سے نہایت ارتباط تھا۔ شہزادہ شجاع السلطنۃ علیالام جب حاکم کرمان ہوئے تو ان پر بہت عنایت کی۔ ایک مثنوی شاہنامہ کے طرز پر نظم کی اور امیر المومنین علی بن ابیطالب علیہ السلام کے غزوات کے حالات بیان کئے (جس طرح ملا رفیع باذل[۱] نے حملۂ حیدری لکھی ہے)۔ یہ کتاب ظہیر الدولہ ابراہیم خاں کو نذر دی تھی۔ انداز طبیعت ابتدائی اشعار سے معلوم ہو جائیگا:۔

بنام خداوند دانائے فرد ۔۔۔ کہ از خاک آدم پدیدار کرد
یکے را بقدرت ز خاک آفرید ۔۔۔ یکے شد ز تابندہ آتش پدید
یکے سجدہ ناکردہ مسجود شد ۔۔۔ یکے سجدہا کردہ مردود شد
زہے حال فرخندہ این مشت خاک ۔۔۔ کز و شد عیاں نور یزدان پاک
ندانم چہ در جام ما ریختند ۔۔۔ چہ صہبائے اندریں دُردے آمیختند
بدہ ساقی آں آتش تابناک ۔۔۔ کہ تاکش پدید آمد از آب و خاک
نہ از خاک تنہا ہمی تاک خاست ۔۔۔ خم و ساغر و مے ہم از خاک خاست
دلے کو خراب از مئے ناب نیست ۔۔۔ مگو دل کہ غیر از گل و آب نیست

مگر کلام میں پختگی اور صفائی بیحد ہے۔ واقعات کے بیان کرنے کا سلیقہ بھی اچھا ہے جبکہ جوش اعتقاد بعض مقام پر خاص قوت پیدا کر دیتا ہے۔ مثلاً جنگ بدر میں

---

[۱] اس وقت اس کے متعلق لکھنا دشوار ہے کیونکہ نہ حملۂ حیدری موجود ہے نہ کوئی اور کتاب جس سے مدد لی جائے۔

جب امیر المومنین نے ولید بن عتبہ پر حملہ کیا اور گرد اُڑی تو کہتا ہے :—

درافتاد در بحر توحید شور　　بظلمت نہاں گشت دریائے نور

چنان برخروشید شیر خدائے　　کہ گفتی خدا گشت رزم آزمائے

حضرت سرورِ کائنات صلعم کی شان میدانِ اُحد میں دکھائی ہے :—

بمیداں پیمبر صف آرائے شد　　اُحد از صفش عرش پیمائے شد

پر آرزم شد چہرۂ ماہ و مہر　　خوی شرم بگرفت روئے سپہر

رزم کے حالات بھی نہایت پُرجوش ہیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ اتنے عرصے کے بعد رزمیہ نظم میں قوت کہاں سے آگئی بجز اس کے کہ جوش مذہب مصنف میں کافی طور سے موجود تھا۔ وہ غالب آجاتا ہے اور شعر میں زور بھر دیتا ہے مرحب کے مقابل جانے کا حال نظم کرتا ہے :—

رواں شد علی سوئے میدانِ کیں　　بنالید بر ہفت گردوں زمیں

چو مرحب نگہ کرد از بام دژ قلعہ　　نہ یافت آغاز انجام دژ

بفرمانش حارث بہ ناورد تاخت　　ولیکن پس از تاختن زہرہ باخت

شہنشاہ مرداں بر او راند تیغ　　در خشید برقی تو گفتی ز میغ

بنالید بر خاک حارث نژند　　بہ تکبیر صوت علی شد بلند

ز سم ستوراں تنش سودہ شد　　بخونش رخ خاک آلودہ شد

سپہر کاشانی سپہر کاشانی۔ میرزا محمد تقی نام۔ فتحعلی شاہ اور محمد شاہ کے دربار میں مقرب رہے بلکہ مستوفی الممالک بھی ہوگئے۔ قوت علمیہ میں خاص امتیاز رکھتا اور نظم ونثر میں پایہ بلند تھا۔ ایک کتاب مبسوط ناسخ التواریخ انکی یادگار ہے۔ جو ناصر الدین شاہ کو نذر کی گئی اور لسان الملک کا خطاب بھی اسی بارگاہ سے ملا۔ حقیقت

یہ ہے کہ اس زمانے میں اس سے بہتر تاریخ ملنا دشوار ہے۔ حضرت آدم سے لیکے امام زین العابدین علیہ السلام تک کے حالات شرح و بسط سے لکھے ہیں۔ زبان تنہا صاف اور شیریں ہے اور طرز ادا نہایت دلکش۔ تکلفات و تصنعات یکقلم ترک ہیں تنہا رسول مقبول صلعم کے حال میں تقریباً نو سو صفحے تحریر کئے ہیں۔ دوسرا حصہ اِس تاریخ کا قاچاریوں کے حال میں ہے یہ بھی نہایت ضخیم ہے۔ علاوہ بریں ایک مبسوط کتاب براہین العجم تحریر کی ہے جس میں فن شعر کے متعلق لطیف تحقیقیں درج کی ہیں۔ تذکرۂ شعرا و علما بھی انھیں کے قلم سے نکلا ہے۔ غرض دورۂ حاضرہ کے مصنفین میں ان سے زیادہ امتیاز کے لوگ شاید نہ ملیں گے۔ حاجی میرزا آقاسی نے ایک مطلع اور حُسنِ مطلع کہا۔ (مجمع الفصحا):-

ساقی بدہ رطلِ گراں زاں مے کہ دہقاں پرورد
اندُہ برد، غم بشکرد، شادی دہد، جاں پرورد

درخُم دلِ پیرِ مغاں درجام مہرِ زرفشاں
دردست ساقی قوتِ جاں رخسارِ جاناں پرورد

سپہر نے یہ قصیدہ محمد شاہ قاچار کی تعریف میں پورا کیا[1] چند شعر نقل کئے جاتے ہیں:-

ساقی بیرخ گلبرگِ تر! عکسِ رُخش درجامِ زر
چوں پورِ آذر (ابراہیمؑ) ناگذر ز آذر (آتش) گلستاں پرورد

شراب مانگتا ہے:
ہم راوقِ بیجادہ کن ہم بید برگ آمادہ کن[2]
باخویش کارِ بادہ کن[3] زاں مے کہ کتاں پرورد

---

۱ قاآنی نے بھی اسکا تتمہ نظم کیا ہے جو دیکھنے کے قابل ہے۔ ۲ یعنے انگور کو نچوڑ اور بید کی پتیاں شراب صاف کرنے کے لئے مہیا کر۔ ۳ کتاں ایک کپڑا ہے جو چاند کے عکس سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔

مطرب کی زلفوں کی تعریف کرتا ہے :-

ازطرۂ صد مشکیں زرہ، افشاندہ بر سیم سرہ
واندر شکنج ہر گرہ، کفریست کا یماں پرورد

ستّار ایمانست آں، وز کفر پر ہانست آں،
یا دستِ شیطانست آں، کش نور یزداں پرورد

لبِ معشوق کی تعریف کرکے تخلیص نہایت نازک کرتا ہے :-

لعلش چو آتش پُر بہا، در آتشش آبِ بقا
یا عدل شہ آں آب را در نارِ سوزاں پرورد

ایک مثنوی **اسرار الانوار** چہاردہ معصومین علیہ السلام کی مدح میں اچھی کہی ہے :-

سامانی شیرازی بن حکیم قاآنی شیرازی بھی اپنے باپ کے قدم بقدم چلتا ہے۔ مدرسہ نظامیہ دار الفنون میں سپہر کاشانی کی نگرانی میں تعلیم پائی۔ علاوہ زبان فرانسیسی کے علوم جدیدہ میں بھی اچھی دستگاہ حاصل کی مگر عنفوان شباب میں ۱۲۸۵ھ میں رحلت کر گیا۔ اس کے زمانے میں مسمطات کا بیحد رواج تھا بلکہ عہد قاچاریہ کے اکثر شعرانے طبع آزمائی اس صنعت میں کی ہے خصوصاً بہاریہ اشعار عمدہ عمدہ نظم کئے ہیں ایک بہاریہ بند اس کا بھی نقل کیا جاتا ہے جس میں صنعت رجوع نہایت لطف سے برتی ہے :-

سامانی سپہر ثانی

آمد بہار و بادہ صہبا مشکبار گشت — نے نے بہشت آمد و نامش بہار گشت
گل بر شگفت از اثرِ بادِ نوبہار — نے نے ز شاخ آتشِ طور آشکار گشت
خطِ بنفشہ رائحۂ مشکِ تر گرفت — نے نے برنگ بوئے خط و زلفِ یار گشت
دستِ زمانہ در چمن اسباب تازہ چید — نے نے چمن بہ رونقِ پیرار و پار گشت

بانکہتِ عبیر بود شاخِ مشکبید — نے نے غلط کہ غیرتِ مشکِ تتار گشت
از دولتِ بہار جوان گشت روزگار — نے نے ز بختِ خواجہ جوان روزگار گشت

آں خواجۂ ستودہ کہ دوران غلامِ اوست
دورِ سپہر و گردشِ اختر بکامِ اوست

وفائی تفرشی

میرزا عبد اللہ خاں **وفائی تفرشی** بھی اسی زمانے کا خوشگوار شاعر ہے۔ شہزادہ ظل السلطان (پسر ناصر الدین شاہ قاچار) اور شیخ علی میرزا کا ندیم رہا ہے۔ طبیعت میں تغزل کافی موجود ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:—

نگویم جاے می شادی فروشد می فروش اما — بسی ناشاد دیدم کز درِ او شاد می آید

ہر دیدہ کہ بینم نگرانست بروئیت — یک عمر بر آں دیدہ بحسرت نگرانم

یکبارہ از طرۂ او شانہ نیاید بیروں — کہ از و صد دلِ دیوانہ نیاید بیروں
رفت بر باد ندانم ز چہ خاکسترِ شمع — نالۂ از دلِ پروانہ نیاید بیروں

رضا قلی ہدایت

ہدایت طبرستانی۔ رضا قلی خاں بن محمد ہادی ۱۵ محرم ۱۲۱۵ھ کو طہران میں پیدا ہوئے۔ بعد تکمیلِ علومِ رسمیہ اپنے باپ دادا کی طرح امرا و سلاطین کے دربار تک رسائی ہوئی اور شاہزادۂ فرمانفرما اور شاہزادۂ شجاع السلطنۃ کے عنایت ان کے حال پر بہت رہی۔ شعر گوئی کا شوق جوانی سے تھا۔ ابتدا میں چاکر تخلص کرتے تھے۔ بعد کو ہدایت تخلص اختیار کیا۔ فتحعلی شاہ نے انھیں پہلے خان کا خطاب دیا پھر ملک الشعرا صبائے شیرازی کے بعد انھیں ملک الشعرا کا خطاب و منصب عطا کیا مگر یہ شدید بیمار ہوگئے اور حاضر دربار نہ رہ سکے۔ محمد شاہ کے زمانے میں نواب فیروز میرزا کے

ساتھ رہے۔ پھر صدر اعظم حاجی میرزا آقاسی کے توسط سے حاضرِ دربارِ شاہی ہوئے۔ ناصر الدین شاہ کے عہد میں مدرسۂ دار الفنون کے صدر رہے اور بادشاہ کے حکم سے **روضۃ الصفا** کی تکمیل کی یعنے صفویہ سے لیکے اپنے زمانے تک کی تاریخ مرتب کرکے شامل کی اور انعام حاصل کیا۔ ایک تذکرہ مجمع الفصحا شعرائے فارسی کے حال میں ضخیم مرتب کیا ہے اور سب کے کلام کا انتخاب نہایت خوشگوار اور تفصیلی کیا ہے۔ زبان سلیس اور شیریں ہے اور طرز تحریر مورخانہ ہے۔ نظم میں انوار الولایہ۔ گلستانِ ارم۔ بحر الحقائق (بروزن حدیقۂ سنائی) انیس العاشقین خرم بہشت و ہدایت نامہ وغیرہ مثنویاں اور ایک دیوان غزلیات و قصائد وغیرہ کا ہے۔ علاوہ بریں فہرس التواریخ۔ تذکرۂ ریاض العارفین۔ لطائف المعارف وغیرہ بھی انھیں کی تصنیفات سے ہیں۔ کلام میں سادگی غالب ہے اور تصنعات سے عاری۔ بعض وقت مشکل ردیفوں میں بھی اشعار کہے ہیں اور نہایت آسانی پیدا کر لی ہے۔ رنگ طبیعت ملاحظہ ہو:—

سرو من بر لالہ از سنبل نقاب آرد ہمی　　آفتابے را نہاں زیرِ سحاب آرد ہمی

آہوے مردم شکارش خونِ مردم بسکہ خورد　　لالۂ عنبر نقابش مشکناب آرد ہمی

نرگسش دارد نظر موے دلم ہر دم بہ ناز　　آرے آرے مستِ آہنگِ کباب آرد ہمی

گر سیاوش نیست آں خط سیہ ویش ایں قدر　　از چہ رو در رفتنِ آتش شتاب آرد ہمی

مثنوی کا اندازہ ابتدائی اشعار سے **گلستانِ ارم** کے ہو جائے گا اور قوت علمیہ کی وجہ سے بعض مقامات پر دل پسند جدتیں نظر آئیں گی:—

بنامِ آنکہ بے نامش بہ نامہ　　نمی گردد رواں از عجز خامہ

ہمہ عالم بشورش گشتہ پیدا　　ولے خود گہ نہاں و گہ ہویدا

بہر ذرہ ز نورِ آفتابش ظہوری و ظہورش خود حجابش
ظہورِ جملہ ہستیہا بنورش خفائے ذاتش از فرطِ ظہورش
ہمہ کارے عجائب در عجائب بہر جا حاضر و از جملہ غائب

ناصر الدین شاہ

ناصر الدین شاہ قاچار کا ایک مجموعۂ غزلیات ہے اور تین جلدوں میں سفرنامہ۔ اِس کتاب کی عبارت سہل ممتنع ہے اور جدید فارسی کا ایک معتبر سرمایہ۔ جس قدر الفاظ غیر زبانوں کے رائج ہیں ان کی ابتدا اسی سفرنامہ سے ہے۔ بلاد یوروپ و امریکا کے الفاظ فرانسیسی تلفظ کے ساتھ بکثرت استعمال کئے ہیں، کیونکہ دوسرا تلفظ فارسی میں کھپ نہیں سکتا تھا (اور فارسی زبان خود بھی اپنی شیرینیٔ ادا اور قبولِ عام کی وجہ سے ایشیا کی فرانسیسی کہلاتی ہے)۔ بعض اصطلاحی ناموں کے فارسی میں ترجمے کرلئے ہیں جو نہایت شیریں معلوم ہوتے ہیں۔ یہ نثر نویسی بالکل نرالی ہے۔ جو بولتے ہیں وہی لکھتے ہیں۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ انشا پردازی کے لئے قلم اُٹھایا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:-

در دیشب کہ دریا را تماشا کردیم، بعضے ماہیہائے ریزہ دیدیم مثلِ حیواناتِ کوچک فسفردار، کہ در مازندرانِ ایران بسیار ست و در شب دُم شان برق میزند۔ ایں ماہیہا ہم توے دریا از زیرِ موج و کفِ آب کہ از زیرِ چرخِ کشتی بیرون می آمد زیر و بالا میشدند و مثالِ الکتریسیتہ در تاریکیٔ شب برق می دادند۔ خیلے تماشا داشتند۔ ہنوز نرسیدہ مقابلِ رودخانۂ طیمس، سہ کشتی زرہ پوشِ انگلیس باستقبال ما آمدہ بنا کردند بہ شلیکِ توپ نمودن و سلام دادن۔ کشتیہائے بخاری و بادبانی زیاد دیدیم کہ ہمہ

پُر از مرد و زن بود از انگلیس، برائے تماشا آمدہ بودند مشعل ہورا میکشیدند و دستمال تکان میدادند۔"

غزلیں شاہِ مغفور کی عاشقانہ غزلیں مشہور ہیں۔ جو مجموعہ اسوقت میرے سامنے ہے اُس میں سراسر عشق مجازی کا ذکر ہے اور حقائق و معارف سے زیادہ سروکار نہیں۔ طبیعت رنگین ہے اور استعارات و تشبیہات بھی خوشگوار ہیں۔ ترکیبیں بھی کسی قدر ریختہ ہیں۔ منتخب اشعار درج کئے جاتے ہیں :-

بہ بستان در بہاراں چوں گلِ نسریں شود پیدا
خجل گردد چو یارِ من بصد تمکیں شود پیدا

تکلم چوں نماید معجزِ عیسیٰ شود ظاہر
تبسم چوں نماید خوشۂ پرویں شود پیدا

بفرواے قیامت کے ز جا فرہاد برخیزد
مگر وقتیکہ در چشمش رخِ شیریں شود پیدا

دل می بری و روے نہاں میکنی چرا — خود میکشی مرا و فغاں میکنی چرا
تا چند رازِ خویش نہاں میدہی بخلق — رازِ مرا ز پردہ عیاں میکنی چرا

دل مارا ز چہ رو زار و حزیں باید کرد — عاشقی کفر نباشد کہ چنیں باید کرد

یار مارا سرِ پرسیدنِ بیمار بود — عجب از طالعِ برگشتہ کہ بیدار بود
ما قوی پنجہ و چشمِ تو بیمار الست — کہ شنیدست قوی شفتۂ بیمار بود ؟
جاے معشوق ندانیم و لیکن گویند — کعبہ و بتکدہ و خانۂ خمار بود

مظفرالدین شاہ قاچار نے بھی یورپ کے سفر کئے تھے اور دو جلدیں سفرنامہ کی ناصرالدین شاہ کے انداز پر لکھی ہیں۔

خاتمہ

ناصرالدین شاہ

اب فارسی لٹریچر کی یہ حالت ہے کہ سلاست ادا اور صفائے بیان کیطرف مائل ہے خصوصاً جمہوریت و مشروطیت کی ہوا نے یوروپ کے علوم وفنون کو بھی ایرانی لباس پہنا دیا ہے۔ اخبار اور جرائد بھی بالکل مذاق حال کے موافق نکل رہے ہیں۔ علوم وفنون کی کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ ناول اور ڈرامے نے بھی سرزمینِ ایران پر دخل کیا ہے یوروپ کے افسانوں کے ترجمے ہوتے چلے جاتے ہیں اور زبان ایک خاص رنگ اختیار کرتی جاتی ہے۔ غیر زبانوں کے الفاظ و خیالات بھی شامل ہو رہے ہیں۔ نمونہ کے لئے ایک عبارت سیاحت نامۂ ابراہیم بیگ سے نقل کی جاتی ہے:۔

"اصناف کسبہ ہم در قبیل و قالِ پول سیاہ۔ امروز ہفتاد شاہی [illegible] فردا ہشتاد شاہی۔ فقرا ہم در تدارکِ نان۔ امروز یکمن دو قران فردا سہ قران۔ ہیچ کس را پروائے وطن و از حب او اثرے در ظاہر و باطن نیست۔ ہمگی ناقص العقل و قاصر الایمان۔ مردہ اند وے زندہ۔ زندہ اند وے مردہ"

ایک ڈراما کا اقتباس ملاحظہ ہو:۔

گلچہرہ ۔ آغا باجی! چرا گریہ میکنی؟

شرف النساء خانم ۔ (دست او را گرفتہ تکان دادہ) گم شو!

گلچہرہ ۔ (با وشیطانی کردہ دست لبطرف او دراز می کند) آغا باجی آغا باجی! ترا بخدا! چرا گریہ میکنی؟

شرف النساء خانم ۔ (باز زیر دستش زدہ) گفتم۔ گم شوید!

کار دستمت بگذار! کارم رابکنم!

گلچہرہ - تو کہ کار نمی کنی - ہمہ اش را گریہ می کنی! بگو - ببینم -
برائے چہ گریہ می کنی؟ اگر نگفتی میروم - تنم را صدا میکنم ببینم!
چرا گریہ می کنی؟ (چارقدش[1] را از سر می کشد) -

شرف النساء خانم - (دل تنگ سخت تکانش می دہد) گم شو!
دستم نمی کشد! نمیگذارد کارم را بکنم -
(گلچہرہ می اُفتد - بعد بلند میشود - گریہ کناں می دَوَد پیش مادرش)"

نظم بھی سادگی کی طرف کھنچ آئی ہے اور یوروپ کے رنگ سے متاثر ہے - اکثر قومی نظمیں اور قومی افسانے رواج پا گئے ہیں - جس طرح قوم اور تمدن پر انقلاب ہے اُسی طرح انشا اور انشا بھی تغیر پذیر ہیں - نازک خیالی کا حد سے بڑھ جانا بُرا تھا - سادگی کا بھی حد اعتدال سے متجاوز ہو جانا کچھ اچھا نہیں مگر انقلابی حالت میں کسی امر کو دیکھ کے اُس کے انجام پر [illegible] سانا ممکن نہیں - لہذا سکوت اختیار کیا جاتا ہے -

انچہ از زمزمۂ دوست شنفتم گفتم
بپذیر انچہ پسندی دگرم ان سنت

—— ❋ ——

[1] چارقد - عورتوں کے سر کا لباس -

معذرت

ناصر الدین شاہ

یہ اوراق پریشاں مولف کی پریشانیِ حال کا مرقع ہیں۔ اپنی علالت۔ بچوں کی نازک بیماریاں۔ ایک بچے کی ہلاکت۔ ایک جلیل القدر بزرگ کی وفات۔ غرض عجیب جانکاہ سانحات کا سامنا رہا اور یہ کتاب کسی نہ کسی طرح تین مہینے دو دن میں ختم کی۔ پروف پڑھنے کی نوبت آئی تو دیکھا کہ یہ تالیف اکثر مقامات پر ناقص ہے۔ اہلی شیرازی کا بالکل ذکر نہیں۔ اس کی مثنوی سحر حلال ذوبحرین ہے اور تقریباً کل اقسام تجنیس پر حاوی ہے۔ دوسری مثنوی شمع و پروانہ مذاق تصوف میں قابل قدر ہے۔ ہاتفی کی مثنویاں شیریں و خسرو۔ لیلیٰ و مجنون اور تیمور نامہ بھی نظر انداز ہونے کے قابل نہ تھیں۔ شاہنامۂ قاسمی شاہ اسمٰعیل صفوی کے زمانے کی یادگار ہے۔ شاہ اعظم کے عہد میں مرزا جلال اسیر کا نام لینا یا زلالی کے سبعۂ سیارہ خصوصاً مثنوی محمود و ایاز کا ذکر نہ کرنا سراسر ظلم ہے۔ نثر میں طاہر وحید کی انشا اور تاریخ شاہ عباس ثانی کی تنقید بھی لازم تھی۔ دور ہندیہ میں غنی کشمیری اور ملا غنیمت کے متعلق بھی اگر کچھ لکھ دیا جاتا تو خوب تھا۔ غرض فروگذاشتیں بہت ہیں اور ہر ایک نا قابل تلافی۔ ناظرین میری شکستہ حالی پر رحم فرمائیں اور خدائے عز و جل نظر ثانی کا موقع عطا فرما کر ان نقائص کی اصلاح ہو اور فروگذاشتیں محل تدارک میں آجائیں۔ والسلام

ناصری

تصحیح

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
	۱۶	سلجوقی	سلجوقی
	۲	اور سلمان	سعد سلمان
	۲۰	عباسی و	عباسی۔
	۱۳	سمجھتا	سمجھنا
	۱۴	سے	کے
	۱۶	تاریخ عجم	تاریخ النشائے عجم
	۱۸	یہ	یہ
	۲۰	قربان	قربانی
	۲۱	گانے	گائے
	۲۱	اتش	آتش
	۹	کوی	کوی اور
	۲۳	زبانوں	زبانوں کے
۹	۱۸	بعد اسلام	دورِ اسلام
	۴	) (	) اور
۱۷	۷	حالات قلم بند کرتا ہیں	حالات کو قلم بند کرتا ہے۔
	۱۷	جو اس	جو اُس

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۷	۱۸	نظم	نظم[1]
"	"	ختم صفحہ پر اضافہ حاشیہ۔	[1] انگریزی ترجموں سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض دیباچوں کی ترتیب اور تکمیل زبور کی نظم سے کچھ مشابہ ہے۔
۱۸	۱	زمان	دمان
۲۰	۲	سطب	سب
۲۳	۲۰	قضائر کارکار	قضائے کار
۲۴	۲۰	سرسبر	سرسبز
۲۵	۹	نربان	نریمان
"	۱۰	انسانوں	افسانوں
"	۱۸	منیرہ	مُنیژہ
"	۲۰	شاسامہ	شاہنامہ
"	۲۱	ہوگئے	ہو سکے
۲۷	۲۰	ہفتاں	ہفتان
۲۸	۱۴	تنوییت	تنوینا
۲۹	۱۴	اللہ بیر	التدبیر
۳۰	۲۱	مویدوں	موبدوں

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۲	۲۰	تازہ	ہرمزد
۳۳	۱	مسگر	نگر
۳۷	۷	طوبیٰ	طُوبیٰ
۴۱	۳	سر کھینچ کے	کھینچ
۴۲	۱۳	غیر فسق	تقویٰ
۴۳	۴	بھی	ابھی
۴۵	۵	بعد	بعد ظہور
”	۱۹	سمجھتا	سمجھتا
۴۷	۱۸	سعادی	سعدی
۴۸	۲۲	اقتدار سے	اقتدار نے
۴۹	۱۳	میں فارسی	میں اس عہد کی فارسی
”	۱۴	اگرچہ اس زمانے کے شعرا	اگرچہ شعرا
۵۰	۱۵	خواہی	(خواہی)
۵۲	۴	پود اسمعیلی	اسمعیلی
۵۵	۱۱	شیعہ	شیعوں
۵۷	۱	ڈھیلی بھی	ڈھیلی۔ ابھی
۶۱	۹	صفتہ	صفت
۶۲	۲۱	کردیتا ہے۔	کردیتا ہے۔"

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۶۴	۳	آج ک	آج کل،
۶۶	۶	کا	کہ
۷۵	۱۷	[illegible]	پائین
۷۶	۹	تود	بود
۷۷	۱۴	تیرنگ	نیرنگ
۷۷	۲۰	قضیا کے	قضیا سے
۸۱	۲۱	فرغ	فرع
۸۲	۱۳	کس	کسی کہ
۸۵	۱۸	ظلم ہو	ظلم ہوا
۸۶	۱۷	شاہنامہ	شاہنشاہ
۸۹	۳	الملوک	ملوک
۹۰	۹	پیا	پایا
۱۰۳	۷	اندازہ	مذاق
”	۱۶	کرو	کرد
۱۰۴	۲	سے	سے سنجری
۱۰۶	۱۷	خیریہ	خیزیہ
۱۰۸	۱۰	خیزاں	خیزراں
”	۱۳	سہل	سہیل

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۱۰	۱۷	ایشیاے	ایشیاسے	۲۰۹	۲۰	ہیں	ہیں کہ
۱۱۳	۹	لطائف	لطائف	۲۱۰	۱۲	کیا اور	کرکے
۱۱۵	۱۷	نسق کے	نسق	۲۱۶	۸	بہیر خاوند	بہیر خوند
[illegible]	۱۸	ندید ستی	ندید ستی	″	۱۰	خاوندمیر	خوندمیر
[illegible]	۳	کبطرات	کبطرانہ گئے	″	۱۴	خاوندمیر	خوندمیر
۱۳۱	۱۲	بجان من پسرزادہ	بجان من	″	۲۲	بہزاد	بہزاد مصور
″	۱۳	بنا	پسرزادہ	۲۲۵	۷	بحشم	بچشم
″	۱۷	دغیرہ دغیرہ	وغیرہ کے	۲۲۷	۲	گوئی کی	گوئی
۱۴۰	۱۰	گردش زمانے	گردش زمانہ	۲۳۰	۲۱	قومی	تومی
۱۴۳	۲	مؤنث	مؤنث	۲۶۳	۵	خبال	خیال [1]
۱۴۴	۸	معنوی سے	معنوی کرکے	″	۱۲	-	[1] ان کا ذکر دورۂ ہندیہ میں مناسب ہے
۱۵۸	۱۸	بیردم	می زدم	۲۷۵	۱۰	توسو	توسعہ
۱۵۹	۴	دود دندان	و درو زندان	۳۰۰	۱۶	کردیا	کردیں
۱۶۲	۲۱	صفحہ	صفحہ (۱۸)	۳۰۹	۶	پاسے	یاسے
۱۶۷	۱	صغرا	صغر	۳۱۶	۱۲	کالاً	کالا
۱۷۳	۸	رنجان	زنجان	۳۲۴	۴	برفلک	بہ فلک
۲۰۱	۱۸	رَوٌ	رَو	۳۵۷	۳	دقیقیں	دقیقیں بیش
	۱۳	زرق	زورق				